انشائیہ کے فنّی سروکار

ڈاکٹر احمد امتیاز

یہ کتاب
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

انشائیہ کے فنی سروکار

انشائیہ کے فنی سروکار

(مضامین)

مرتب

ڈاکٹر احمد امتیاز

ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی

نام کتاب : انشائیہ کے فنی سروکار

مرتب : ڈاکٹر احمد امتیاز

مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز

10 میٹرو پول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Inshaiya ke Fanni Sarokar

Edited by:

Dr. Ahmad Imteyaz

Department of Urdu, University of Delhi, Delhi-110007

Cell: 09868008294, E-mail: ahmad_imteyaz100@yahoo.co.in

ISBN: 978-93-80934-67-9

First Edition : 2012

Price: ` **250/-**

Library Edition: ` 325/-

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

 # 10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 9810784549, 9873156910

E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

اپنے بیٹے

تراب احمد

کے نام جو اس دنیا میں نہیں ہے

'دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو'

فہرست

دیباچہ

اُردو نثر کی مختلف صورتیں ہیں۔ مزاج کے اعتبار سے انہیں دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ افسانوی نثر اور غیر افسانوی نثر۔ افسانوی نثر میں وہ تمام تحریریں شامل ہیں جن میں کسی نہ کسی اعتبار سے قصّہ پایا جاتا ہے۔ غیر افسانوی نثر وہ نثر ہے جو بغیر کسی قصّے کے بیان کیا گیا ہو۔ انشائیہ نگاری، غیر افسانوی نثر ہے۔ یہ بھی تخلیقی اظہار کی ایک صورت ہے لیکن اس کے اپنے مقاصد اور حدود ہیں۔ انشائیے کا مقصد زبان و بیان کی نئی تازگی، نئے تاثرات، نئی ترجیحات اور نئی فکر کے ساتھ حیات وکائنات کے اسرار ورموز کو پیش کرنا ہے۔

لفظ انشائیہ کو اُردو میں، انگریزی زبان کے لفظ Essay یا Light Essay یا Personal Essay کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور جسے عربی لفظ انشائیہ (بمعنی تخلیق) سے مشتق قرار دیا گیا ہے۔ خود اُردو زبان میں انشائیہ کے لئے دوسری اصطلاحیں بھی رائج ہیں مثلاً— انشائے لطیف، لطیف پارہ یا مضمون لطیف۔ لفظ انشائیہ کا استعمال محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، مہدی افادی، وغیرہ نے بھی اپنی تحریروں میں کیا ہے لیکن اُن کے یہاں یہ لفظ کسی اصطلاح کے طور پر مستعمل نہیں ہے بلکہ بلاغت کے باب میں کہا گیا ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ لفظ انشائیہ کا استعمال اصطلاح کے طور پر پہلے پہل اختر اورینوی نے کیا تھا۔ انہوں نے علی اکبر قاصد کے مجموعۂ مضامین ''ترنگ'' کے دیباچہ میں 1942ء میں کیا تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ 1957ء تک اسے اصطلاح کے طور پر مقبولیت نہیں مل سکی۔

1957ء کے بعد پاکستان میں جب وزیر آغا اور چند دوسرے اہل قلم حضرات نے انشائیے کے حوالے سے تحریری تحریک چلائی تو اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اس زمانے

میں رسالہ 'اوراق' اور 'ادبی دنیا' نے خصوصی طور پر اس تحریک میں حصّہ لیا۔ مغرب میں فرانسیسی ادیب مونتین (1592-1532) کو انشائیہ نگاری کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ جس نے 1571ء میں پہلی بار Essay کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اس کی کتاب 'Essaies' 1580ء میں شائع ہوئی تھی۔ لفظ Essay فرانسیسی زبان میں عربی سے ہی داخل ہوا۔ عربی میں 'سعی' کوشش کو کہتے ہیں اور اس میں 'ال' کا اضافہ یعنی 'السعی' خاص کوشش کے لئے مستعمل ہے۔ مراد یہ ہے کہ حیات وکائنات اور اس کے مظاہر کو ایک خاص کوشش کے تحت ضبط تحریر میں لانا Essay ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مونتین نے اپنے مضامین کو ایک خاص کوشش یا Essay کا نام دیا تھا۔ مغرب میں مونتین کے بعد بیکن، نے Essay کی اصطلاح استعمال کی اور 1593ء میں اپنے Essaies شائع کیے۔ لفظ انشائیہ کو اگرچہ Essay کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انشائیہ میں جو وسعت اور تنوع ہے، نیز جس قسم کی تخلیقی اضطراری اور اضطرابی کیفیت ہے وہ Essay کی اصطلاح میں نہیں ہے۔

انشائیہ اُردو کی ایک متنازع صنفِ نثر ہے کیوں کہ اس کی صورتوں پر اکثر سوالیہ نشان لگائے جاتے ہیں۔ ویسے بھی ہر زمانے میں اس کی صورتیں بدلتی رہی ہیں اور ہر بدلی ہوئی صورت نے مغالطے پیدا کیے ہیں۔ لہٰذا اُردو میں بھی ایک زمانے تک مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کو ایک ہی سمجھا جاتا رہا۔ اُردو کے ماہرین کا ایک گروہ برسوں تک Essay کے لئے لفظ مضمون اور دوسرا گروہ لفظ انشائیہ استعمال کرتا رہا۔ اس لئے یہ طے نہیں ہو پایا کہ Essay کا صحیح بدل کیا ہے۔ مغرب کے ادیبوں نے جن میں ڈوبری کا نام خصوصی اہمیت رکھتا ہے، جب غیر رسمی تحریر کے لئے Essay اور دوستانہ ذاتی تحریر کے لئے Personal Essay کی اصطلاح استعمال کی تو ہمارے ناقدین نے بھی Essay کے لئے مضمون اور Light Essay یا Personal Essay کے لئے انشائیہ کی اصطلاح کو رائج کیا۔

انشائیہ کو اُردو کی ایک جدید صنف قرار دیا جاتا ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار کسی بھی موضوع پر آزادہ روی کے ساتھ اپنے خیالات قلم بند کرتا ہے۔ موضوع کی کوئی قید اس کے

پیش نظر نہیں ہوتی۔ وہ زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز کو نئے تناظرات میں پیش کرتا ہے اور تفہیم کی تازہ کاری سے ایسا اسلوب جگاتا ہے کہ قاری کا شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ اسلوب میں تازگی، تاثر اور تہذیب کے ساتھ ساتھ فکر و فرزانگی کے نئے زوایے پیدا کرنا ہی ایک انشائیہ نگار کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ حقیقت کو زاویہ بدل بدل کر دیکھنا اور نئی حقیقت دریافت کرنا ہی انشائیہ نگار کا کام ہے۔ ان معنوں میں دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ خیال، معنیٰ اور بیان میں ایک خاص رشتہ استوار کرنا ہی انشائیہ نگاری ہے۔

Johnson نے اپنی کتاب "The English Essay and Essayists" میں بہت پہلے Essay کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ

> "Essay is a loose sally of the mind, an irregular indigested piece, not a regular and orderly composition"

لیکن نیاز فتح پوری کا خیال انشائیہ نگاری کے حوالے سے بالکل مختلف ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ (انشائیہ) ہے ایک قسم کی Soliloquy، زیادہ تر Subjective قسم کی، جسے ہم Self Composition بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کے فکر و تصور کا نتیجہ ہے، جس میں تجزیۂ جذبات، نفسیاتی مطالعہ، منطقی استدلال، فلسفیانہ تفکر، متصوفانہ استقراء اور انشائے عالیہ کا جمالیاتی اسلوب، سب کچھ پایا جاتا ہے۔'' (اعتراف و تعارف۔ اُردو لیسنز)

انشائیہ حقیقتاً استعجابی تاثر سے گتھی ہوئی ایک ایسی تحریر کا نام ہے جس کے ہر نقطۂ خیال سے ایک دوسرا نیا نقطۂ خیال برآمد ہوتا ہے جو پھیل کر بہت ساری دنیا آباد کرنے کے بعد واپس اپنے مرکزی خیال میں سمٹ جاتا ہے۔ زندگی جس طرح بے ربط اور بے ہنگم ہوتی ہے اسی طرح انشائیہ کی تحریر بھی بے ہنگم ہوتی ہے جس کا ہر سرا دوسرے سرے سے اَن مل ہوتا ہے مگر اس بے میل اور بکھراؤ کے باوجود اس کے اجزا آپس میں مربوط اور وحدتِ تاثر میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے فکر، خیال اور جذبے میں ہم آہنگی نظر آتی ہے اور یہی ہم آہنگی انشائیے کو شگفتہ اور دلکش بناتی ہے۔ اگر غور کریں تو پائیں گے کہ انشائیہ کا لازمی

جز جذبہ و خیال اور فکر کا اچھوتا پن ہے۔ انہیں اجزا کے سہارے انشائیہ نگار خیالات کی دنیا آباد کرتا ہے اور قاری کو اس کے سیر کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ انشائیے میں نفسیاتی دروں بینی اور ذات و شعور کی رنگ آمیزی کے سبب ہی قاری اپنی انفرادیت میں اجتماعیت اور اجتماعیت میں انفرادیت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا انشائیے کا تعلق روزمرہ کے موضوعات سے ہوتا ہے جو قاری کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔

انشائیہ کے فن پر جتنی بھی تحریریں ملتی ہیں اگر ان پر غور کریں تو ہم پائیں گے کہ انشائیہ ایسی تحریر ہے جس میں موضوعات کی پیش کش مختصر ہوتی ہے۔ یہ غیر رسمی مگر دوستانہ اور بے تکلف ہوتی ہے، اس کا اسلوب نہایت دلکش، تازہ اور شگفتہ ہوتا ہے، اس میں موضوعات کی کوئی حد نہیں ہوتی اس لئے معمولی موضوع بھی غیر معمولی موضوع بن جاتا ہے۔ ظرافت کی فضا سازی تو محض اس کی دلکشی کو بڑھانے کے لئے کی جاتی ہے۔ چونکہ انشائیہ حیات و کائنات کو مختلف زوایے سے دیکھنے پر آمادہ کرتی ہے اس لئے جذباتی اور نظریاتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوتی ہے۔

انشائیہ کے بارے میں آج بھی مختلف قسم کی تنقید کی جاتی ہے۔ اُردو میں اس کی حمایت اور مخالفت کرنے والے موجود ہیں۔ مخالفت کرنے والے کہتے ہیں کہ انشائیے میں معمولی اور بے مصرف موضوعات پر اظہار خیال ہوتا ہے اس لئے سماجی، سیاسی اور مابعد الطبیعاتی نقطۂ نظر کی اس میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ انشائیے میں زیادہ تر مسکرانے کا اہتمام ہوتا ہے اور کھل کر ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی، اس لئے اس میں زندگی جیسا پھیلاؤ نہیں ہوتا اور جز وقتی کیف مہیا کرانے سے آگے یہ قدم نہیں بڑھاتا۔ اس صنفِ نثر پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ یہ انشائیہ نگار کو ٹانگوں کے درمیان سے سمندر دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ مذکورہ قسم کے اعتراضات کے باوجود انشائیہ نگاری نے اپنے وجود کو قائم رکھا ہے اور امکانات کے دائرے کو وسیع کیا ہے۔

اُردو میں انشائیہ نگاری کے آغاز و ارتقا کی تین منزلیں ہیں۔ پہلی منزل وہ تھی جب سرسید نے مضمون نگاری یا انشائیہ نگاری کا آغاز کیا تھا اور علمی و اصلاحی مقاصد کو سامنے رکھ

کر مختلف نوعیت کے مضامین لکھے تھے۔ انہیں مضامین میں بعض ایسے بھی تھے مثلاً۔ امید کی خوشی، بحث وتکرار، سرابِ حیات، کاہلی، سمجھ، خوشامد، ہمدردی وغیرہ، جن میں انگریزی انشائیے (Essay) کے طرز کو اپنایا گیا تھا اور آزادی کے ساتھ اپنے تجربے کو پیش کیا گیا تھا۔ اُسی زمانے میں محمد حسین آزاد نے بھی مضامین لکھے مثلاً — گلشن امید، سیر زندگی، سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ، انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا، وغیرہ، جو اُن کے مجموعۂ مضامین، نیرنگ خیال، میں شامل ہیں۔ محمد حسین آزاد کے مضامین میں بھی تخیل وتمثیل کے ذریعے تخلیقی جوہر کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اسی دور میں الطاف حسین حالی نے بھی انشائیے لکھے مثلاً — زمانہ، زبانِ گویا، وغیرہ۔ انشائیے کے حوالے سے جن بزرگوں کا ذکر میں نے مذکورہ جملوں میں کیا ہے اس سے بہت سے لوگوں کو اعتراض ہو سکتا ہے لیکن کسی قسم کی رائے قائم کرنے سے قبل دو باتوں کو ذہن میں رکھنا مناسب ہوگا۔ پہلی بات یہ کہ اس زمانے میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کا تخصیص نہیں تھا اور نہ اس میں کوئی فرق سمجھا جاتا تھا بلکہ انگریزی اصطلاح Essay کے مترادف کے طور پر اُردو میں مضمون اور انشائیہ دونوں کا چلن تھا۔ دوسری بات یہ کہ مذکورہ بزرگوں کے مضامین، جدید انشائیے کے نقشِ اوّل ہیں۔ نقش اوّل ان معنوں میں کہ جدید انشائیے جو 1960ء کے آس پاس وجود میں آئے اُن کی تعمیر و تشکیل میں مذکورہ انہیں مضامین کا کردار بنیادی تھا۔ ان دونوں باتوں پر غور کرنے سے تصویر بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ انشائیہ نگاری اپنے ابتدائی زمانے میں کیا اور کیسی تھی۔

اُردو انشائیے کی دوسری منزل وہ تھی جب عبدالحلیم شرر، سجاد انصاری، مہدی افادی، میر ناصر علی، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، احمد شاہ پطرس بخاری، فلک پیما، کرشن چندر، کنہیا لال کپور وغیرہ نے اپنے مضامین میں طنز و مزاح اور وجدانی کیفیت پیدا کر کے انشائیے کی زمین کو مزید سرسبز بنایا اور ان میں وسعت دے کر فطری حقیقت کے نقوش پیدا کیے۔ اگر عبدالحلیم شرر کے مضامین پھول، برسات، کھلتا ہوا پتا، بزم قدرت، وغیرہ کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ کتنے دلکش انشائیے ہیں۔ اسی طرح سجاد انصاری کا 'مُحاسن ومعاصی' ہے، مہدی افادی کا 'خوابِ طفلی' اور 'آرزوئے شباب'

ہے۔ مسکرانا، ہم اور ہماری ہستی، زندگی کی شام، وغیرہ میں میر ناصر علی نے انشائی رنگ بھرے ہیں۔ عبدالماجد دریابادی کا جھوٹ میں سچ، الفاظ کا جادو، وغیرہ بے حد پر لطف انشائیے ہیں۔ مٹی کا تیل، دیا سلائی، جھینگر کا جنازہ، الو، مرغ کی اذان، وغیرہ خواجہ حسن نظامی کی مقبول انشائی تحریریں ہیں۔ ایک اور ایک چار، بیوی کی انا، خفسانہ، اونہہ، وغیرہ فرحت اللہ بیگ کے انشائیے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے چار پائی، ارہر کا کھیت، دھوبی، پاسبان، وغیرہ کے ذریعے انشائیہ نگاری کو وہ مقام عطا کیا جس کا جواب ڈھونڈنا مشکل ہے۔ جنگ کا اثر اخلاق پر (مولانا ابوالکلام آزاد) کتے، سویرے جو کل آنکھ میری کھلی (پطرس بخاری) گنوار کی دعا، پجاری سے، کچھ جھوٹ کچھ سچ، نئی دکان (عبدالعزیز فلک پیما) غسلیات، رونا (کرشن چندر) اخبار بینی، اپنے وطن میں سب کچھ ہے (کنہیا لال کپور) موٹر سائکل، چھینک (علی اکبر قاصد) وہ معروف انشائیے ہیں جن سے انشائیہ نگاری کی روایت آگے بڑھی اور اسے استحکام ملا۔ مذکورہ انشائیہ نگاروں کے یہاں جو اسلوب کی رنگا رنگی ہے، جو فکر رسا ہے، جو دلکشی اور زندگی کی ہمہ ہمی ہے، اس کے واضح نقوش جدید انشائیہ نگاروں کے یہاں نظر آتے ہیں تعجب کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے بیشتر اور ہندوستان کے چند ناقدین، پہلی اور دوسری منزل کے انشائیہ نگاروں کو انشائیہ نگار تسلیم نہیں کرتے او. اس ابھی پر اڑے ہیں کہ وزیر آغا سے انشائیہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کوئی بھی صنف یکا یک وجود میں نہیں آتی بلکہ اس کے وجود میں آنے سے قبل اس کا پورا پس منظر اس کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ وہ صنف ایک منزل سے دوسری منزل اور دوسری سے تیسری منزل کا سفر طے کرتی ہے۔ اپنی ابتدائی صورت میں ظاہر ہے کہ ہر چیز کچی اور Immature ہوتی ہے اور ارتقائی مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی پختگی کی منزل تک پہنچتی ہے۔ انشائیہ بھی سرسید کے زمانے میں اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی۔ پھر رشید احمد صدیقی کے زمانے میں بالغ ہوئی اور وزیر آغا کے زمانے میں جوان ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ جدید انشائیہ نگاری اپنی پہلی اور دوسری صورتوں کی ہی صاف ستھری اور سلجھی ہوئی شکل یا اس کی توسیع ہے۔

سرسید نے روایتی نثر سے انحراف کر کے جس قسم کی نثر کو رواج دیا تھا وہ اپنے زمانے کے لحاظ سے بالکل نئی اور جدید چیز تھی۔ دوسری منزل کے نثر نگاروں نے مضامین وانشاء کے روپ کو بدل کر نثر کو ایک نئے احساسات سے دوچار کیا تھا اور تخلیقی شعور کی جو روش اختیار کی تھی وہ پہلی صورت کے مقابلے زیادہ واضح، منظم اور دلچسپ تھی۔ تیسری شکل ماقبل صورت سے مختلف ہے لیکن اسی کی بنیاد میں انشاء کی پیش رو صورت موجود ہے۔ جدید انشایئے میں اسلوب وانشاء کا جمال پہلے کے مقابلے زیادہ ہے لہٰذا وزیر آغا نے جدید انشایئے کی تحریک چلا کر انشایئے کے جس روپ کو ابھارا ہے وہ ماقبل انشایئے کی ہی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس لئے جن ناقدین کا یہ کہنا ہے کہ انشائیہ نگاری کی ابتدا وزیر آغا سے ہوتی ہے محض جزوی حقیقت ہے۔ یہ درست ہے کہ جدید انشایئے میں ذہنی خلاقیت کا عمل دخل پہلے کے انشائیوں سے کہیں زیادہ منظم، موثر اور معنی خیز ہے لیکن وقت کے ساتھ انشایئے میں ہونے والی تبدیلی کے سبب پہلے لکھے گئے انشائیوں کو سرے سے رد کر دینا درست نہیں ہے۔

ادب کی ہر صنف منزل بہ منزل ترقی کرتی ہے۔ انشایئے کی صنف نے بھی منزل بہ منزل ترقی کی ہے۔ وزیر آغا اور پاکستان کے دوسرے انشائیہ نگاروں مثلاً — نظیر صدیقی، مشتاق قمر، مشکور حسین یاد، سلیم آغا قزلباش، جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، انور رسید، اکبر حمیدی، محمد یونس بٹ، رشید احمد گریجہ، شہزادہ قیصر، حامد برگی، انجم نیازی، وغیرہ نے جدید انشائیہ نگاری کو مزید واضح خدوخال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں تو اس تحریک کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا تاہم مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، اظہار عثمانی، خالد محمود، ضمیر حسن دہلوی، نصرت ظہیر، عظیم اختر، اسد رضا، منظور عثمانی، اقبال مسعود وغیرہ نے جدید انشایئے لکھے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید انشایئے کے طور پر جو تحریریں وجود میں آئی ہیں اُن میں تخلیقی تازہ کاری اور فکر و فرزانگی کے وہ تمام اوصاف موجود ہیں جن سے اردو ادب کی آبیاری ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ جدید انشائیہ نگاری میں مزید ترقی کے امکانات موجود ہیں۔

یہ کتاب تفریحاً یا محض اپنی تصنیفات میں اضافے کی غرض سے ترتیب نہیں دی گئی

ہے بلکہ طلبا اور اساتذہ کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انشائیہ نگاری کے فن پر اچھے بُرے متعدد مضامین لکھے گئے ہیں۔ بعض رسائل نے خصوصی نمبر بھی شائع کیے ہیں لیکن باضابطہ کتابیں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ پاکستان کے مقابلے ہندوستان میں تو چند لوگوں کو چھوڑ کر کسی نے اس صنفِ نثر کی طرف توجہ ہی نہیں کی ہے۔ جسے میں اُردو ادب کے لئے ایک بڑا المیہ تصور کرتا ہوں۔ محض انشائیہ نگاری ہی نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ناقدین کی غیر افسانوی نثر کی طرف ہی توجہ نہیں ہے۔ سوانح، خودنوشت اور خاکہ نگاری کے حوالے سے بھی یہی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ انشائیہ نگاری پر باضابطہ میں کوئی کتاب لکھتا لیکن اس سے قبل یہ ضروری تھا کہ انشائیہ کے فن پر جو مضامین رسائل اور کتابوں میں منتشر ہیں انہیں یکجا کیا جائے اور کتابی شکل میں شائع کیا جائے تاکہ اس صنفِ نثر کی طرف اہل قلم حضرات کی توجہ مرکوز ہو سکے۔ اسی مقصد کے تحت میں نے پرانے رسائل دیکھنے شروع کیے تو مجھے ایسے نادر مضامین ومقالے دستیاب ہوئے جو یقیناً اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد اہم اور کارآمد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض اہل قلم حضرات نے اپنی کتابوں میں بھی انشائیہ نگاری پر مضامین تحریر کیے ہیں۔ میں نے انہیں بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ہندوستان کے مقابلے پاکستان میں اس صنفِ ادب پر خصوصی توجہ دی گئی ہے لہٰذا وہاں کے اہل قلم حضرات کے مضامین و مقالے بھی اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ کل 26 مضامین ومقالے کا انتخاب ہے۔ اس کی ترتیب سے نہ صرف ایک کتاب منظر عام پر آئے گی بلکہ اس صنفِ ادب کی اہمیت وافادیت پر بھی بھرپور روشنی پڑے گی نیز طلبا اور اساتذہ کو بھی خاک چھاننے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس کتاب میں جو مختلف مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ محض فن پر نہیں ہیں بلکہ نظریاتی مباحث کے ساتھ ساتھ اس کی ابتداء اس صنف کی ابتداء وارتقاء کے حوالے سے بھی ہیں، اس کے مبادیات اور مسائل پر بھی ہیں، اس کی اہمیت وافادیت پر بھی ہیں اور دیگر اصنافِ نثر سے یہ صنف کس قدر مختلف ہے اس پر بھی مضامین شامل ہیں۔ میں نے ان

مضامین کو نوعیت کے اعتبار سے ایک جگہ رکھنے کی کوشش کی ہے تاکہ مطالعہ کا تسلسل قائم رہے۔ ایک ہی مصنف کے ایک سے زیادہ مضامین بھی اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ یہ بات شاید بعض لوگوں کو گراں گزرے مگر مضمون بے حد اہم ہے اس لئے ایسا کرنا میں نے بہتر سمجھا۔ چند مضامین کے عنوان ایک ہی جیسے ہیں لیکن ان کے لکھنے والے الگ الگ ہیں۔ ایسے مضامین کو بھی ایک ہی جگہ رکھا گیا ہے تاکہ ایک سے زائد نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے۔

اس کتاب میں شامل مضمون نگار نئے اور پرانے دونوں قسم کے ہیں تاہم میں نے انہیں اس ترتیب سے رکھا ہے جہاں ان کی ضرورت تھی۔ آخر میں ایک مباحثہ بھی شامل کر دیا گیا ہے جو بے حد اہم مباحث پر مشتمل ہے اور جارج لوکاچ کے مضمون کا ترجمہ بھی شامل ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔

اس کتاب میں جو بھی مضامین شامل کیے گئے ہیں وہ معتبر اہل قلم حضرات کے ہیں۔ اختلاف اور اعتراف کی ذمہ داری تو قارئین پر ہے۔ میرا مقصد تو محض یہ ہے کہ ان مضامین سے قارئین کے ذہن میں انشائیے کی حقیقت واضح کر دی جائے اور انشائیہ فہمی میں وہ ان سے مدد لے سکیں۔

آخر میں محمد ارشد (یوٹی اے شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی) محمد اشرف (ریسرچ اسکالر) اور محمد اختر (ریسرچ اسکالر) کا ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تنظیم میں میری مدد فرمائی۔

ڈاکٹر احمد امتیاز

۳۰/مارچ ۲۰۱۲

نظیر صدیقی

انشائیہ کیا ہے؟

انشائیہ کی تعریف کا مسئلہ افسانے یا ناول کی تعریف سے کچھ کم پیچیدہ نہیں۔ لیکن یہ پیچیدگی اس وقت رونما ہوتی ہے جب آپ انشائیے کی جامع اور مانع تعریف پر مصر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح افسانے اور ناول کی جامع اور مانع تعریف آج تک متعین نہ ہو سکی۔ اسی طرح شاید انشائیے کی بھی جامع اور مانع تعریف متعین نہ ہو سکے گی۔ پھر بھی لوگ افسانے اور ناول کی طرح انشائیے کو بھی بعض عام خصوصیات کی مدد سے پہچان لیں گے اور اسے پہچاننے میں دشواری محسوس نہ کریں گے۔

چونکہ انشائیے کی صنف ہمارے یہاں مغرب سے آئی ہے اس لئے بہتر تو یہ ہوتا کہ انشائیے کو سمجھنے کے لئے مغربی مصنفین ہی سے مدد لی جاتی۔ لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اگرچہ انگریزی ادب یا مغربی ادب میں انشائیہ ایک تکمیل یافتہ صنف ادب کی حیثیت رکھتا ہے پھر بھی جس طرح ناول، افسانے اور ڈرامے کے فن پر وہاں کے ممتاز نقادوں اور فن کاروں نے بڑے اہم مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ اسی طرح انشائیے کے فن پر مضامین اور کتابیں نہیں لکھی گئیں۔ البتہ Essays کے نہایت عمدہ انتخابی مجموعے ضرور شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان انتخابی مجموعوں کے مرتبین[1] نے Essay کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے وہ بسا اوقات صحیح ہونے کے باوجود الجھن سے خالی نہیں۔

---

[1] یہ جاننے کے باوجود کہ ان مرتبین کی کوئی ادبی حیثیت نہیں اس مضمون میں انشائیے کے متعلق ان کی آراء سے خاصی بحث کی گئی ہے اس کا جواز یہ ہے کہ اول تو انشائیے کے فن پر ممتاز و مستند انشائیہ نگاروں اور نقادوں کے مضامین اور کتابیں نہیں ملتیں۔ دوسرے یہ کہ انشائیوں کے انتخابی مجموعوں کے مرتبین تخلیقی یا تنقیدی اہمیت سے محروم سہی، انھوں نے اپنے اپنے مجموعوں کی ترتیب کے سلسلے میں کم از کم ہزاروں انشائیوں کا مطالعہ تو کیا ہے اور اس فن کے متعلق بری بھلی رائے قائم کرنے کی کوشش تو کی ہے۔ ن۔ص

الجھن یوں پیدا ہوتی ہے کہ اردو لفظ ''مضمون'' کی طرح انگریزی لفظ Essay بڑا وسیع المعنیٰ لفظ ہے۔ وسیع المعنیٰ اس لحاظ سے کہ اس میں (Essay) کی تمام قسمیں شامل ہیں۔ یہاں تک کہ Personal Essay بھی جسے دوسرے لفظوں میں Familiar Essay بھی کہتے ہیں۔ انگریزی زبان کے ادیب Personal Essay یا Familiar Essay کا ذکر کرتے وقت عموماً ان اصطلاحات کی بجائے صرف Essay کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور ''ایسے'' کی تعریف کرتے وقت Anthologists صرف ''پرسنل ایسے'' کو پیش نظر رکھتے ہیں مثلاً Great Essays of all Nation کے مرتب ایف۔ ایچ پریچرڈ نے ''ایسے'' کے لئے سادہ اور غیر مصنوعی Homely and unpretentious کی صفات استعمال کی ہیں۔ اسی طرح Great Essays (یہ کتاب آج تک پاکستان میں عام طور پر دستیاب ہے) کے مرتب ہاؤسٹن پیٹرسن (جو کولمبیا یونیورسٹی میں فلسفے کے معلم رہ چکے ہیں) نے ایسے کی تعریف یوں کی ہے:

> کم سے کم اس مجموعے کے لئے ایسے، کا مطلب تحریر کا ایک ایسا چھوٹا سا (ایک سے بیس یا تیس صفحے تک) ٹکڑا ہوگا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو، مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوعی انداز میں۔ ''ایسے'' مفکرانہ ہوگا لیکن سنجیدہ نہیں۔ وہ فلسفے سے قریب ہوگا لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں۔ اس میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہوگی لیکن اس میں اصل موضوع سے مسرت بخش انحراف بھی ہوگا وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی نوعیت دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں اتفاق رائے پر مجبور نہ کرے گا۔ ''ایسے اسٹ'' چاہے اور کچھ بھی ہو وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے۔ ورجینا ولف نے کہا تھا کہ ''اسے یہ ضرور جاننا چاہئے...... اور یہ اولین شرط ہے...... کہ کس طرح لکھنا چاہئے'' یہی وجہ ہے کہ:۔ Essayists کو تراجم سے اتنا ہی نقصان پہنچتا ہے جتنا لیرک سے شاعروں کو''۔

ظاہر ہے کہ پریچرڈ نے ''ایسے'' کے لئے جو صفات استعمال کی ہیں اور پیٹرسن نے ''ایسے'' کی جو تعریف کی ہے اس کا اطلاق صرف ''پرسنل ایسے'' پر ہو سکتا ہے لیکن ان دونوں کے انتخابی مجموعے مختلف قسم کے Essays پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ان دونوں کے مجموعوں میں بعض مشہور تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں۔ اینتھولوجسٹس کی اسی عادت کے پیش نظر میں نے ''شہرت کی خاطر'' کے دیباچے میں لکھا تھا کہ:۔

> ''انگریزوں کی یہ بوالعجبی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ قوم ''ایسے'' کی اصطلاح سے ''لائٹ یا پرسنل ایسے'' مراد لیتی ہے تو ایسیز کے انتخابی مجموعوں میں علمی اور تنقیدی مضامین کیوں شامل کر لیتی ہے۔ روبرٹ لنڈ Robert Lynd جسے دور حاضر کے ممتاز انشائیہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے اس نے انگریزی ادب میں صرف بیکن اور لیمب کے مضامین کو ''ایسے'' کی صنف میں کلاسکس کا درجہ دیا ہے۔ ان دونوں کے کلاسکس ہونے میں کیا شبہ، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ''ایسے'' کے معنیٰ لائٹ یا پرسنل ''ایسے'' کے ہیں، تو کیا بیکن کے ایسیز کو بھی لائٹ یا پرسنل ایسیز کہہ سکتے ہیں۔''

جہاں روبرٹ لنڈ نے ایک ہی سانس میں بیکن اور لیمب کو ''ایسے'' کی صنف کا کلاسک قرار دے کر ''ایسے'' اور پرسنل ایسے'' کے تصورات کو گڈمڈ کر دیا ہے وہاں پریچرڈ نے ''ایسے'' کے معاملے میں ایک نئی الجھن یوں پیدا کر دی ہے کہ اس نے اپنے انتخابی مجموعے میں افسانہ، ناول اور خودنوشت سوانح عمری کے بعض حصوں کو بھی شامل کر لیا ہے مثلاً اس کے مجموعے میں بولیشیوں کی کتاب ڈیکامیرون، سروانٹیز کے ناول ڈون کوئکزوٹ اور گوئٹے کی خودنوشت سوانح عمری کے بعض حصے شامل ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ''ایسے'' کے نام سے اس کتاب میں بعض ادیبوں کے متفرق اقوال و نصائح بھی درج کر دئے گئے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سمجھنا مشکل ہی نہیں محال ہو جاتا ہے کہ ''ایسے'' کیا ہے اور کیا نہیں۔

اس وقت تک ایسیز کے جو انتخابی مجموعے میری نظر سے گذرے ہیں ان میں سے

صرف ایک مجموعہ Types of Essays ایسا ہے جس کی تمہید میں ''ایسے'' کی مختلف قسموں سے بحث کی گئی ہے اور ان قسموں کے اعتبار سے مختلف عنوانات کے ماتحت فہرست اور کتاب دونوں میں مضامین درج کئے گئے ہیں۔ اس مجموعے کا مرتب ایک امریکی بنجمن اے ہیڈرک ہے۔ اگرچہ اس نے ''ایسے'' کی چھ قسمیں گنائی ہیں (۱) شخصی مضمون (۲) بیانیہ مضمون (۳) کرداری خاکہ (۴) تنقیدی مضمون (۵) ادارتی مضمون یعنی ایڈیٹوریل اور (۶) مفکرانہ مضمون۔ اور ان میں سے ہر ایک کی امتیازی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر بھی اس نے ''ایسے'' کیا ہے'' سے بحث کرتے ہوئے ''ایسے'' کی ایک عام تعریف بھی پیش کردی ہے جو حسب ذیل ہے:

> ''ایسے'' کی خصوصیات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نثر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے جو اپنے موضوع سے مکمل اور منطقی طور پر بحث نہیں کرتا بلکہ جو موضوع کے متعلق مصنف کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔ خیالات جو سنجیدہ ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی۔ لیکن جن کے اظہار میں بڑی صناعی سے کام لیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ مصنف کی شخصیت کا کسی نہ کسی حد تک انکشاف کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ شاعری میں لیرک سے مشابہ ہے۔''

ظاہر ہے کہ ''ایسے'' کی یہ تعریف ''ایسے'' کی تمام قسموں پر حاوی نہیں ہے۔ یہاں ہیڈرک نے بھی وہی غلطی کی ہے جو دوسرے انیتھولوجسٹس سے ہوتی آئی ہے۔ یعنی دوسرے انیتھولوجسٹوں کی طرح ہیڈرک نے بھی ''ایسے'' کی تعریف کرتے وقت صرف ''پرسنل ایسے'' کو پیش نظر رکھا یا ایسے کی تعریف کی جس کا صحیح اور مکمل اطلاق صرف ''پرسنل ایسے'' پر ہو سکتا ہے۔ ''ایسے'' اور ''پرسنل ایسے'' میں فرق نہ کرنے کی عادت انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا تک میں پائی جاتی ہے۔ اس میں ''ایسے'' کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> ''ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے ''ایسے'' اوسط لمبائی کا ایک ایسا مضمون ہے جو عموماً نثر میں ہوتا ہے۔ اور جس میں سہل اور سرسری

> انداز میں کسی موضوع سے اور سچ پوچھئے تو صرف اس موضوع سے بحث کی جاتی ہے جو لکھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔''

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ''ایسے'' کی تعریف دراصل ''پرسنل ایسے'' کی تعریف ہے اور بڑی کارآمد تعریف ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا نے اپنے کو ''ایسے'' اور ''پرسنل ایسے'' کی جھگڑے میں پڑنے ہی نہیں دیا۔ اس میں ہر جگہ ''ایسے'' کا الفاظ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ ''ایسے'' کے تدریجی ارتقا، پر روشنی ڈالتے ہوئے بتا دیا گیا ہے کہ بعض لکھنے والوں کے ایسیز شخصی ہیں۔ مثلاً مونٹین، لیمب اور اسٹیونسن کے ایسیز اور بعض دوسروں کے ایسیز بالکل غیر شخصی ہیں مثلاً میکولے کے ایسیز۔ میکولے کے ہاتھوں ''ایسے'' کی حیثیت اعتراف یا خود نوشت سوانح عمری کی نہیں رہتی۔ اس کے یہاں ''ایسے'' بالکل غیر شخصی، ادبی، تاریخی اور نزاعی Controversial بن جاتا ہے۔ پریچرڈ لکھتا ہے کہ:۔

> ''لیمب کے چاہنے والوں کا دعویٰ یہ ہے کہ میکولے ''ایسے اسٹ'' نہیں تھا اور میکولے کے حامیوں کا اعلان یہ ہے کہ لیمب محض فضول باتیں کرنے والا تھا۔''

نقطۂ نظر کے اس تضاد کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پریچرڈ کہتا ہے کہ:۔

> ''عجیب بات ہے کہ جو نقاد مختصر افسانوں میں طریق کار کے وسیع ترین اختلاف کو روا رکھتے ہیں اور اس بات کو بخوشی مانتے ہیں کہ ناول نگار خارجی اور داخلی دونوں طریقوں سے کام لے سکتا ہے، وہ ''ایسے اسٹ'' کے یہاں ایک سخت گیرانہ یکسانی پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔''

میرے خیال میں لیمب اور میکولے کے ایسیز کو ''ایسے'' کی دو قسمیں سمجھنا یا ان کے ایسیز کو داخلی اور خارجی طریقوں کا نمائندہ قرار دینا کافی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ''پرسنل ایسے'' اور ''امپرسنل ایسے'' (جسے صرف ایسے کہنا کافی ہوگا) ''ایسے'' کی دو قسمیں نہیں بلکہ ادب کی دو الگ الگ صنفیں ہیں۔ جس میں ظاہری ہیئت کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں۔ بعض اوقات ان دونوں کا موضوع بھی مشترک ہو سکتا ہے لیکن اس سے ان دونوں کی

انفرادی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ ایک ہی موضوع پر ''ایسے'' بھی لکھا جاسکتا ہے۔ اور ''پرسنل ایسے'' بھی۔ جو چیز ''ایسے'' اور ''پرسنل ایسے'' کے درمیان بنیادی فرق پیدا کرتی ہے وہ موضوع کی طرف لکھنے والے کا انداز نظر ہے۔ ''ایسے'' لکھنے والا اپنے موضوع کو سنجیدہ اور ذمہ دارانہ نظر سے دیکھتا ہے اور موضوع سے متعلق مواد کو منطقی ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس کا مقصد اپنی شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ زیر بحث مسئلہ کا تصفیہ ہوتا ہے۔ ''پرسنل ایسے'' کا مصنف اپنے موضوع پر سہل اور سرسری انداز میں اظہار خیال کرتا ہے۔ اس کا مقصد اپنی تفریح سے لے کر دوسروں پر تنقید تک کبھی کچھ ہوسکتا ہے۔ مونٹین کے یہاں انشائیہ تفریح و تفنن کا ذریعہ نہیں بلکہ اپنے اور دوسروں کے تاثرات و تجربات کے تقابل کا ایک وسیلہ ہے اور اس تقابل کے سہارے زندگی کے حقائق و بصائر تک پہنچنے کی کوشش۔ جہاں تک انشائیے میں اختصار اور طوالت کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں کسی اصول کا پابند نہیں۔ یہ اس کی مرضی اور موڈ پر ہے کہ جس موضوع پر جتنا چاہے لکھے۔ اس کے بعض انشائیے بہت مختصر ایک صفحے سے زیادہ نہیں۔ لیکن زیادہ تر بہت طویل ہیں مثلاً اس کا ایک انشائیہ کتابی سائز کے ۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

پرچرڈ لکھتا ہے کہ ''اپنے زمانے سے لے کر آج تک مونٹین نے ادب کو جس حد تک متاثر کیا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہے۔'' یہ واقعہ ہے کہ مونٹین سے نہ صرف فرنسیسی زبان کے ادیب بلکہ نہ جانے کتنی ہی زبانوں کے ادیب متاثر ہوئے ہیں۔ انگریزی ادیبوں میں بیکن، لیمب، ہیزلٹ اور اسٹیونسن نے اس کے مضامین پڑھے اور اس کے اثرات کا اعتراف کیا۔ بیکن، مونٹین کے برعکس، انگریزی کے انشائیہ نگار محض شخصی نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں وہ شوخی اور شگفتگی بھی ملتی ہے۔ جو مونٹین کی سنجیدگی کے منافی ہے۔ سنجیدگی صرف مونٹین کی خصوصیت نہیں بلکہ فرانسیسی ذہن کا عام خاصہ ہے۔ بقول پرچرڈ ''یہ صحیح ہے کہ فرانسیسی زبان میں ''ایسے'' نے انگریزی ایسے کی بہ نسبت زیادہ سنجیدہ رخ اختیار کرلیا ہے۔ فرانسیسی ادیب شاذ و نادر ہی اپنے کو بے تکلف ہونے دیتا ہے۔ اور اس بات کو کبھی نہیں بھولتا کہ وہ ایک سنجیدہ اور ذی عقل ہستی ہے۔ اگرچہ انسائیکلوپیڈیا بری ٹینکا نے لیمب اور اسٹیو

نسن کو مونٹین کی روایت کے علمبرداروں میں شمار کیا ہے اور ایسا کرنا اس حد تک صحیح بھی ہے کہ مونٹین کی طرح لیمب اور اسٹیونسن کے انشائیوں میں بھی شخصی عنصر بہت نمایاں ہے۔ لیکن مجھے انگریزی کے انشائیہ نگاروں میں جو شخص مونٹین سے زیادہ قریب نظر آتا ہے وہ ہیزلٹ ہے۔ ہیزلٹ کے زیادہ تر انشائیے تو عنوان کی نیم سنجیدگی یا عدم سنجیدگی کے باوجود سنجیدہ ہیں مثلاً On the ignorance of the learned on disagreeable people جیسے مضامین میں منطقی تفکر اور مفکرانہ مشاہدے کی وہی رَو جاری و ساری نظر آتی ہے جو مونٹین کے یہاں پائی جاتی ہے۔ مونٹین ہی کی طرح ہیزلٹ کے انشائیے بھی خاص طویل ہوتے ہیں اور ان کا لہجہ سنجیدہ ہوتا ہے۔ البتہ اس کے یہاں انکشاف ذات کا عمل اتنا نمایاں نہیں ہے جتنا مونٹین کے یہاں۔ انشائیے کی آزادروی اور بے تکلفی اگر ہیزلٹ کے کسی انشائیے میں پورے طور جلوہ گر ہے تو صرف On going a journey میں۔ غالباً یہی اس کا بہترین انشائیہ ہے اور انشائیوں کے ہر انتخابی مجموعے میں اسے نہ صرف جگہ دی جاتی ہے بلکہ ہیزلٹ کے نمائندہ انشائیوں میں سرفہرست رکھا جاتا ہے۔ لیکن مونٹین اور ہیزلٹ کو پڑھتے وقت مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ ان دونوں کے یہاں انشائیہ نگاری اور مضمون نگاری کی سرحدیں ایک دوسرے سے مل گئی ہیں۔ یا یہ کہ ان کے یہاں مضمون نگار بعض اوقات انشائیہ نگار پر غالب آجاتا ہے۔ ان کے برعکس لیمب، اسٹیونسن، لوکس، چسٹرٹن، ہیلاٹریل، لوک، روبرٹ لنڈ وغیرہ خالص انشائیہ نگار ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا انشائیے کی جن خصوصیات پر زور دیتے رہے ہیں ان کے اعتبار سے میرے خیال میں روبرٹ لنڈ انشائیے کے فن کا بہترین نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے تقریباً تمام انشائیے سادہ، مختصر، دلچسپ، شخصی اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات پر اصرار کرنا مناسب نہ ہوگا کہ ہر اچھے انشائیے کو روبرٹ لنڈ کے انشائیوں سے مشابہ ہونا چاہئے۔ ادب میں کوئی فارمولا نہ کبھی چلا ہے اور نہ چل سکتا ہے۔ ہر ذہین فنکار نہ صرف اپنی منزل آپ ہوتا ہے بلکہ اپنا راستہ بھی آپ، پھر بھی یہ طے کرنا ہے کہ انشائیے کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں۔ سادگی، اختصار، دلچسپی، انکشاف ذات، یا اس کا ہلکا پھلکا ہونا؟ یہ سب کچھ یا ان میں سے کچھ بھی نہیں؟ اگر اس کا پتہ نہ چل سکے کہ انشائیہ کیا ہے

تو کم از کم یہ تو معلوم ہو جائے کہ انشائیہ کیا نہیں ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے ہمنوا عصمت اللہ نے انشائیے کے شخصی ہونے پر بہت زور دیا ہے۔ انشائیے یا پرسنل ایسے کی تعریف میں مغربی ادیبوں نے جو کچھ کہا ہے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انشائیے میں شخصی عنصر کا وجود لازمی ہے۔ اس لئے بعض مغربی ادیبوں نے انشائیے کو لیرک سے مشابہ قرار دیا ہے۔ یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انشائیے کا شخصی ہونا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو سارا ادب ہی شخصی ہے کیونکہ وہ کسی نہ کسی حد تک لکھنے والے کی شخصیت کی غمازی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ناول اور ڈرامے جیسے غیر شخصی اور خارجی اصناف ادب میں بھی مصنف کی شخصیت کہیں نہ کہیں سے جھانک رہی ہوتی ہے پھر انشائیے کے شخصی ہونے پر اصرار کیا؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انشائیہ کا شخصی ہونا دوسری اصناف ادب کے شخصی ہونے سے قدرے مختلف معنیٰ رکھتا ہے۔ دوسری اصناف ادب میں مصنف بہ حیثیت مصنف نظر آتا ہے اور انشائیے میں بہ حیثیتِ شخص۔ اس لئے ہیزلٹ نے مونٹین کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "اس میں ایک ادیب کی حیثیت سے کچھ کہنے کی جرأت تھی جو وہ ایک انسان کی حیثیت سے محسوس کرتا تھا۔ ناول اور ڈرامے میں ادیب کی شخصیت کا وہی حصہ نظر آتا ہے جو اس کے ذہن وفکر سے تعلق رکھتا ہے ناول، افسانے اور ڈرامے کے کردار مختلف مسائل پر مصنف کے سوچے سمجھے ہوئے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن انشائیے میں لکھنے والے کی شخصیت کا وہ حصہ منعکس ہوتا ہے جو اس کے خیالات ونظریات سے اتنا تعلق نہیں رکھتا۔ جتنا اس کے فطری میلانات اور تحت الشعوری تحریکات Impulser سے۔ انشائیے میں اگر اجازت ہو تو عرض کروں، والے پر تکلف ماحول کی بجائے اماں یار سنو بھی، والی بے تکلفانہ فضاء پائی جاتی ہے۔ انشائیہ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دل پر سے عقل کی پاسبانی اٹھ جائے یا اٹھائی جائے۔ انشائیوں میں انشائیہ نگار اپنی ان خواہشات وخیالات اور عادات واطوار کا بھی اعتراف کر جاتا ہے جن کا اظہار قریبی دوستوں ہی کی صحبت میں ممکن ہے یا شاید وہاں بھی نہیں۔ انشائیے کے شخصی ہونے کے ایک معنیٰ تو یہ ہوئے۔ غالباً انشائیے میں شخصیت کے اجاگر ہونے یا انکشافِ

ذات کے عمل سے ڈاکٹر وزیر آغا اور عصمت اللہ کی مراد یہی ہے۔ لیکن میرے خیال میں انشائیے کا شخصی ہونا ایک اور معنیٰ بھی رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ ضروری نہیں کہ انشائیے میں جو باتیں کہی جائیں ان کا لکھنے والے کی شخصیت سے تعلق ہو بلکہ غیر شخصی باتوں کو شخصی انداز میں بیان کرنا بھی انشائیے کو شخصی بنا دیتا ہے۔ آپ کہیں گے شخصی انداز بیان کیا چیز ہے۔ شخصی انداز بیان سے میری مراد غیر رسمی اور بے تکلفانہ اندازِ بیان ہے۔ انشائیے کے شخصی ہونے کا یہ مفہوم انشائیے کی اس تعریف میں بھی پوشیدہ ہے جو Great Essays کے مرتب ہاؤسٹن پیٹرسن نے کی ہے اور جو اس مضمون کے ابتدائی حصے میں نقل کی جا چکی ہے۔ ہنکی نے انشائیے کو گفتاری ادب گردانا ہے۔ انشائیے میں دوستانہ اور بے تکلفانہ گفتگو کا انداز ہی اس کو شخصی بنانے کے لئے کافی ہے۔ اگر انشائیہ مصنف کی ذات کے بے نام گوشوں کو بھی عریاں کرے تو پھر کیا کہنا۔

اس میں شک نہیں کہ غزل کی طرف انشائیہ بنیادی طور پر ایک داخلی صنفِ ادب ہے پھر بھی انشائیے کے داخلی (یعنی شخصی) ہونے پر زیادہ اصرار کرنا ایسا ہی ہے جیسے یہ مطالبہ کرنا کہ غزل میں کوئی خارجی مضمون نہ آنے پائے۔ فنکار اصناف ادب کی داخلیت اور خارجیت کا پابند نہیں ہوتا بلکہ اصناف ادب کی داخلیت اور خارجیت فنکار کی پابند ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صنفِ ادب یا صنفِ سخن فنکاروں کے ہاتھوں مختلف شکلیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ ناول جیسی خارجی صنف ادب بعض ناول نگاروں کے یہاں داخلی صنف ادب بن کر رہ گئی ہے مثلاً جیمز جوائس، مارسل پروست اور ورجینیا ولف کے یہاں ناول سماجی عمل سے زیادہ نفسیاتی کیفیات کا ترجمان ہے۔ اسی طرح غزل جیسی داخلی صنف سخن بعض شاعروں کے یہاں بڑی حد تک خارجی صنف سخن بن کر رہ گئی ہے۔ مثلاً اقبالؔ اور یگانہؔ کے یہاں۔ یہی حال انشائیے کا ہے انشائیہ کے نام کے اعتبار سے انشائیہ Personal Essay ہی رہے گا لیکن مختلف فنکاروں کے ہاتھوں اس کی شکل وصورت، اس کے مزاج اور اس کے ابعاد وحدود میں تغیر اور اضافہ ہوتا جائے گا۔ آج اُردو کے بعض جدید شاعروں نے غزل میں گیت کا رنگ پیدا کر دیا ہے اور امریکا کے مشہور ناول نگار John Doe Passos (جیسے سارتر عہد

حاضر کا سب سے بڑا ناول نگار مانتا ہے) نے ناول میں فلم کی ٹیکنک برت کر ناول کو فلم سے قریب کر دیا ہے۔ جب ادب کی دوسری صنفیں قوت ایجاد کے ہاتھوں کچھ سے کچھ ہو سکتی ہیں تو پھر انشائیہ کیوں نہیں؟ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم کسی دن تنقیدی اور تاریخی مضامین کو بھی انشائیہ کہنے لگیں گے۔ آلڈس ہکسلے نے اپنے منتخب مضامین Essays کے مجموعے (مطبوعہ 1960ء) کے دیباچے میں (Essay) کی تین قسمیں بتائیں ہیں (۱) شخصی اور خود سوانحی۔ (۲) خارجی اور واقعاتی (۳) مجرد۔ اس کا خیال ہے کہ "ایسے" کی ہر ایک قسم اپنے اندر مخصوص قسم کی خوبیاں اور خامیاں رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک سب سے زیادہ اطمینان بخش ایسیز وہ ہیں جن میں تینوں قسم کے ایسے کی بہترین خوبیاں موجود ہوں۔ یعنی جن میں لکھنے والا اپنی ذات سے لے کر کائنات، مجرد سے لے کر محسوس، اور خارجی سے لے کر داخلی دنیاؤں، کے مرحلے طے کر جائے۔ ہکسلے کے خیال میں اس قسم کے ایسیز مونٹین نے لکھے ہیں۔ اگر بیسویں صدی یا مستقبل کے انشائیہ نگار پھر اس طریق کار کو اپنا کر انشائیے کو اپنی شخصیت کے انفرادی نقوش کا مظہر بنائیں تو انشائیے کے فن میں صوری اور معنوی اعتبار سے ایسی تبدیلی اور ترقی ممکن ہے جس کا فی الحال اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اگر انشائیے کے شخصی ہونے کے مندرجہ بالا معنوں کو سامنے رکھا جائے اور اس کے محض داخلی ہونے پر اصرار کیا جائے تو پھر ان مضامین کو انشائیہ کہنے میں کوئی چیز مانع نہیں رہتی، جن میں مصنف کی ذات یا شخصیت اجاگر نہیں ہوتی یا انکشاف ذات کا عمل واضح نہیں۔ مضمون اور انشائیے کا بنیادی فرق صرف یہ نہیں کہ مضمون غیر شخصی ہوتا ہے اور انشائیہ شخصی بلکہ ان دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ جہاں مضمون ہر اعتبار سے (موضوع، مقصد، انداز نظر، انداز بیان سے) سنجیدہ ہوتا ہے وہاں انشائیہ کسی نہ کسی اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔ انشائیہ کے اس تصور کو سامنے رکھ کر اگر اُردو ادب میں انشائیہ نگاری اور انشائیہ نگاروں کا کھوج لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُردو ادب میں انشائیہ ایک نوخیز صنفِ ادب ہونے کے باوجود اتنا کم عمر نہیں جتنا ڈاکٹر وزیر آغا مانتے اور منوانا چاہتے ہیں۔ میں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ

"انیسویں صدی کے آخر میں مغرب کے اثر سے جن چیزوں کے ابتدائی نقوش اُردو ادب میں ابھرے ان میں انشائیہ بھی ہے۔ سر سید کا مضمون، امید کی خوشی، سے منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ کے دوسرے قلمی معاونین کے مزاحیہ خاکے اُردو میں انشائیہ نگاری کے پیش رو کہے جا سکتے ہیں۔ شرر لکھنوی، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، شفیق الرحمٰن، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ابراہیم جلیس، امجد حسین، وزیر آغا، ان تمام ادیبوں کے یہاں اچھے اور قابل قدر انشائیے ملتے ہیں۔"

لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کے تجزیئے کے مطابق ڈاکٹر وزیر آغا کے سوا اُردو ادب میں اور کوئی شخص انشائیہ نگار کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ اپنی کتاب "خیال پارے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:۔

"اُردو میں تا حال انشائیے کی صنف بطور ایک تحریر کے معرض وجود میں نہیں آئی۔ کہیں ایک آدھ چیز ایسی مل جاتی ہے جسے ایک خطے کے لئے انشائیے کے تحت شمار کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن پھر فوراً ہی بعض نقائص کے پیش نظر یہ ارادہ ترک کرنا پڑتا ہے۔"

چنانچہ انہیں سرسید، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، کرشن چندر جیسے ادیبوں کے مضامین میں ایسے نقائص نظر آئے جن کی بنا پر انہوں نے ان کے مضامین کو انشائیہ ماننے کا ارادہ ترک کر دیا مثلاً ان کے نزدیک سرسید کے بیشتر مضامین میں ایک تو سنجیدہ مباحث کا انداز ملتا ہے جو انشائیے میں نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرے انداز بیان میں وہ شگفتگی نہیں جو انشائیے کا بنیادی وصف ہے۔ تیسرے ان مضامین میں سرسید نے اپنی ذات کے کسی نامعلوم گوشے کو عریاں کرنے کی بجائے خارجی زندگی کے واقعات اور مسائل کو نمایاں کیا ہے۔ یہ سارے اعتراضات درست پھر بھی سرسید کے مضمون 'امید کی خوشی' کو اردو انشائیے کے اولین نمونوں میں شمار کرنا بے جا نہ ہوگا۔ اول تو اس لئے کہ اس مضمون کے انداز بیان میں وہ شگفتگی پائی جاتی ہے جو سرسید کے دوسرے

مضامین میں مفقود[1] ہے۔ دوسری چیز جو 'امید کی خوشی' کو انشائیے کے دائرے میں لے آتی ہے وہ اس کے آخری حصے کا شخصی عنصر ہے۔ جو ان کی قوم پرستانہ دیوانگی کی طرف ایک خوبصورت اشارہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ "امید کی خوشی" انشائیے کا کوئی مثالی نمونہ ہے لیکن ابھی اس کی جن خوبیوں کا ذکر کیا گیا ان کی بنا پر اسے اُردو انشائیوں کے اولین نمونوں میں شمار کرنا غلط نہ ہوگا۔ سجاد حیدر یلدرم کے مضامین میں صرف 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' انشائیے کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ میں نے یلدرم کو محض اسی انشائیے کی بنا پر اُردو انشائیہ نگاروں میں شمار کرلیا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا بھی ان کے اس مضمون کو انشائیہ مانتے ہیں لیکن انہیں اعتراض یہ ہے کہ یلدرم کا یہ انشائیہ اوریجنل نہیں ماخوذ ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے مضامین 'نذیر احمد کی کہانی' (جو واضح طور پر ایک شخصی خاکہ ہے اور اردو کے بہترین خاکوں میں سے ہے) اور "پھول والوں کی سیر" کو انشائیہ نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کے متعدد مضامین انشائیے کے زمرے میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ مزاح نگاری کو، انشائیہ نگاری کے منافی تصور نہ کیا جائے۔

اسی طرح پطرس، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور اور کرشن چندر کو محض مزاح نگار اور طنز نگار کہہ کر ٹال دینا صحیح نہ ہوگا۔ کسی شخص کا طنز نگار ہونا اس کے انشائیہ نگار ہونے میں مانع نہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر سمجھ لینے کی ہے کہ طنز اور مزاح ادب کی صنف (Form) نہیں اسلوب کی صفت (Quality) ہیں اور اسلوب کی یہ صفات ادب کی ہر صنف میں دیکھی اور برتی جاسکتی ہیں۔ ایک ناول نگار بھی طنز نگار یا مزاح نگار ہوسکتا ہے۔ ایک ڈراما نگار بھی اور ایک شاعر بھی۔ جہاں تک مجھے علم ہے اہل مغرب طنز و مزاح کو ادب کی اصناف میں شمار نہیں کرتے۔ باوجود اس کے ڈکنس بہت بڑا مزاح نگار تھا۔ انگریزی ادب میں وہ مزاح نگار کی بجائے ناول نگار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اسی طرح باوجود اس کے کہ برنرڈ شو بہت بڑا طنز نگار تھا، لوگ اسے طنز نگار کی بجائے ڈراما نگار کے نام سے یاد کرتے ہیں یا یہ کہ ڈکنس کو مزاح نگار اور برنرڈ شو کو طنز نگار کہتے وقت وہ ڈکنس کے ناول نگار

---

[1] یہ بات قابل لحاظ ہے کہ سرسید جو جدید نثر کے بانی سمجھے جاتے ہیں اپنی نثر کی متعدد خوبیوں کے باوجود نہ اچھے نثر نگار تھے نہ صاحب طرز ادیب۔ (ن۔ س)

اور شو کے ڈرامہ نگار ہونے سے انکار نہیں کرتے۔ ایک اسلوبی صفت کو ادبی صنف قرار دے دینا اُردو والوں کی روایت ہے اور غلط روایت ہے۔ پطرس، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور اور کرشن چندر نے چونکہ ایسے مضامین لکھے ہیں جو کہیں متن، کہیں اسلوب اور کہیں دونوں کے اعتبار سے شخصی اور لائٹ ہیں اس لئے انہیں انشائیہ نگار ماننے میں کوئی قباحت نہیں۔ اب اگر ان میں سے کسی کے یہاں طنز یا مزاح کا عنصر نمایاں ہے تو اسے طنز نگار یا مزاح نگار بھی کہا جاسکتا ہے۔ جب افسانے، ناول اور ڈرامے میں طنز و مزاح کی موجودگی کسی کے انشائیہ نگار ہونے میں کیوں مانع آئے۔

انشائیے اور طنز و مزاح کے باہمی رشتے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں کہ

> "بنیادی طور پر انشائیے کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس کے لئے وہ طنز سے کچھ زیادہ کام نہیں لیتا کیونکہ طنز ایک سنجیدہ مقصد لے کر برآمد ہوتی ہے اور اس کے عمل میں نشتریت کا عنصر موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک اچھے انشائیے میں طنز کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، بلکہ محض ایک سہارے کا کام دیتی ہے۔ اسی طرح انشائیے کا خالق محض مزاح تک اپنی سعی کو محدود نہیں رکھتا کیونکہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہوتی ہے اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہیں بڑھتی۔"

ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا انشائیے میں طنز و مزاح کی موجودگی کے مخالف نہیں، لیکن طنز مزاح کی شدت و کثرت کو انشائیے کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ ان کے نزدیک انشائیے کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ جہاں تک انشائیے کے بنیادی مقصد کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بیانات میں کھلا ہوا تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک جگہ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ "بنیادی طور پر انشائیے کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔ دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ "بنیادی طور پر انشائیہ لکھنے والے کا مقصد آپ کی سوچ بچار کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے...... اس کے

پیش نظر مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ آپ کو سوچنے پر مائل کرے۔"

ظاہر ہے کہ ناظر کو مسرت بہم پہنچانا اور اس کی سوچ بچار کے لئے راستہ ہموار کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔ اگر انشائیے کا بنیادی مقصد ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے تو مزاح یقیناً اس مقصد کے حصول کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی انشائیہ نگار محض مزاح تک اپنی کوشش محدود رکھے تو اس میں کیا مضائقہ؟ ممکن ہے کہ محض مزاح سے سطحیت پیدا ہو اور بات قہقہہ لگانے اور ہنسنے ہنسانے سے آگے نہ بڑھے۔ لیکن ناظرین کو مسرت بہم پہنچانے کے لئے اس سے آگے چاہئے بھی کیا؟ اور اگر انشائیے کا بنیادی مقصد قاری کو سوچ بچار کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے یا اسے سوچنے پر مائل کرنا ہے تو طنز اس مقصد کے حصول کا نہایت عمدہ وسیلہ ہے، کیونکہ طنز آدمی کو صرف مجروح نہیں کرتی بلکہ مجروحوں کو سوچنے پر مجبور بھی کر دیتی ہے۔ اس لئے اگر کسی انشائیہ نگار کے یہاں طنز مقصود بالذات ہو تو اس میں کیا برائی ہے؟

انشائیے کا بنیادی مقصد ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہو، یا اسے سوچنے پر مائل کرنا، طنز و مزاح دونوں مقاصد کی تکمیل کے لئے معاون ہیں۔ کیوں کہ طنز و مزاح میں مسرت آفرینی اور خیال انگیزی دونوں کی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ رہا یہ سوال کہ انشائیے میں طنز و مزاح کا تناسب کیا ہو تو اس معاملے میں کوئی طبی نسخہ تیار نہیں کیا جاسکتا کہ انشائیہ میں دو ماشے طنز ہو اور تین تولے مزاح، یہ تو لکھنے والے کی افتادِ طبیعت پر منحصر ہے۔ انشائیے کی صنف اگر کسی سوئفٹ کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ طنز کا شاہکار (مثلاً A modest Proposa) بن جائیگی اور اگر اسے کوئی پطرس مل جائے تو مزاح کا نادر نمونہ (مثلاً کتے)۔ بہر حال اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ پطرس، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور اور کرشن چندر کو انشائیہ نگار کہتے وقت میرا مطلب یہ نہیں کہ ان ادیبوں کی وہ تمام تحریریں انشائیہ ہیں جو ان کے مضامین کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ ایک ادبی صنف کے اعتبار سے انشائیے کی فنی حدود کے متعلق گفتگو کرنے میں دشواری اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ یہ صنف بعض اور اصناف ادب (مثلاً افسانہ اور ناول) کی طرح بہت لچکدار واقع ہوئی ہے۔ یہ کبھی افسانے کی سرحدوں کو چھو لیتی ہے کبھی مضمون اور افسانے کے درمیان معلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس صنف کی اسی لچک کو مدنظر رکھتے ہوئے روبرٹ لنڈ نے لکھا تھا کہ

"دور حاضر میں انشائیے نے بہت سی شکلیں اختیار کی ہیں۔ کہیں وہ مذہبی خطبہ بن گیا۔ کہیں تقریباً مختصر افسانہ، انشائیہ، خود نوشت سوانح عمری کا ایک حصہ بھی ہوسکتا ہے اور بکواس بھی۔ طنزیہ بھی ہوسکتا ہے اور جذباتی بھی۔"

انشائیے سے روبرٹ لنڈ کا اپنا مطالبہ بہت محدود سا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

"ہم انشائیے سے صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر سے ہمیں خوش کرے اور اپنے موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرے۔"

مجھے انشائیے کے اس تصور پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن ذاتی طور پر میں انشائیے کے اس تصور کو سب سے مکمل اور جامع سمجھتا ہوں جو ہاوسٹن پیٹرسن کی تعریف Definition میں پوشیدہ ہے۔

یہاں تک انشائیے کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا اس کا ماحصل یہ ہے کہ انشائیہ نام ہے اس مضمون کا جس کی لمبائی ایک سے بیس یا تیس صفحے تک کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی جاسکتی ہے۔ جو اپنے مشن اور اسلوب دونوں اعتبار سے شخصی ہوتا ہے۔ جس میں کس طرح کہا گیا اتنا ہی اہم ہے، بسا اوقات زیادہ اہم، جتنا کیا کہا گیا۔ جو اندازِ فکر یا اندازِ نظر یا اندازِ بیان کے اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے۔ جس میں گہری سے گہری بات بھی سہل اور سرسری انداز میں کہی جاتی ہے۔ جس میں عدم سنجیدگی اور لاابالی پن کی فضا پائی جاتی ہے۔ جس میں طنز و مزاح کے عناصر جلی بھی ہوسکتے ہیں اور خفی بھی۔ جس کا مقصد قاری کو محظوظ کرنا بھی ہوسکتا ہے اور اسے سوچنے پر مائل کرنا بھی۔

□□□

حامد برگی

انشائیہ کا فن

انشائیہ نثر سے زیادہ شعر و سخن کا فن معلوم ہوتا ہے۔

انشائیہ کی ہیئت ترکیبی غزل کی سی ہے۔ انشائیہ لکھنے کی تحریک بھی کسی ایسے خیال یا جملے سے ہوتی ہے جو مطلع کی صورت انشائیہ نگار کے ذہن میں طلوع ہوتا ہے اور بنیادی تحریک یا انسپریشن (Inspiration) کا کام دیتا ہے پھر غزل مسلسل کی طرح موضوع سے متعلق مضامین ذہن میں آنے لگتے ہیں جو نظم ہونے کی بجائے نثر ہوتے جاتے ہیں۔ انشائیہ کا ہر نیا پیراگراف خیال کی ایک نئی لہر کو پیش کرتا ہے، شعر کی طرح انشائیہ کے ہر نئے خیال کی خوبی بھی اس کی جامعیت میں ہے۔ ہر خیال جو انشائیہ نگار کے ذہن میں وارد ہوتا ہے وہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ مختصر سے مختصر الفاظ میں ادا ہونا چاہئے۔ انشائیہ میں مقابلہ کی طرح وضاحت کی گنجائش نہیں۔ ایہام اور ایمائیت انشائیہ کا حسن ہے۔ بات جتنی اشاروں کنایوں میں ہو اتنی ہی خوبصورت اور فنکارانہ ہوتی ہے بشرطیکہ وہ سوچ اور خیال کے دروازے کھولتی جائے۔ انشائیہ نگار کا عندیہ مبہم ہونے کے باوجود قاری کی سمجھ میں آجائے، اسے انشائیہ نگار سے وضاحتیں طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

غزل کی طرح ایک اچھے انشائیہ میں جزوی تاثر بھی لازمی ہے۔ انشائیہ ایک غزل مسلسل کی طرح ہے جس کا ایک مجموعی تاثر بنتا ہے مگر ہر شعر انفرادی طور پر بھی اپنے معنی و مفہوم رکھتا ہے اسی طرح انشائیہ کے مجموعی تاثر کے علاوہ اس کی جزئیات کے حسن معنی کی طرف بھی نگاہ ہونی چاہئے۔ اگر انشائیہ میں شامل کوئی جزوی خیال قاری کو متاثر نہیں کرتا ہے تو اس کو بھی اسی طرح ''ہوٹ'' ہو جانا چاہئے جس طرح غزل کا کوئی شعر رد ہوتا ہے۔

انشائیہ لکھتے ہوئے انشائیہ نگار موضوع پر سوجھنے والے ہر خیال کو انشائیہ میں شامل

نہیں کرتا، نظر انتخاب سے کام لیتا ہے اور اس طرح بھی انشائیہ نگار غزل گو شعراء کی صف میں آجاتا ہے۔ وہ خیال کے حسن و نزاکت کی طرف نگاہ رکھتا ہے اور اپنے فن پارہ کے مجموعی حسن کو غارت نہیں کرنا چاہتا، جس طرح غزل میں وارد ہونے والا ایک بھونڈا شعر غزل کے مجموعی حسن کو متاثر کرتا ہے اور اس کا اخراج کر دینا ہی مناسب نظر آتا ہے اسی طرح انشائیہ میں در آنے والا کوئی ناقص خیال بھی بآسانی انشائیہ سے خارج کیا جا سکتا ہے۔ اس اخراج سے انشائیہ کی مجموعی ہیئت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

انشائیہ میں وارد ہونے والا ہر خیال اپنی جگہ اتنی اہمیت اور حیثیت کا حامل ہونا چاہئے جیسے غزل کا ہر شعر اور ایک غزل کی سی حیثیت سے انشائیہ کو پرکھا جانا چاہئے، ایک اچھے انشائیہ میں کوئی خیال اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے زیادہ اہم اور کم اہم نہیں ہونا چاہئے۔ اچھے انشائیہ کا حسن برقرار رکھنے کے لئے کم اہم حصوں کو یا تو خارج کر دینا چاہئے یا ان کی حیثیت کو اہم بنا کر پیش کرنا چاہئے۔ کسی ادنی سی بات کو ندرت فکر و نظر دینے کا نام ہی فن ہے اور انشائیہ میں اس کا اتنا ہی عمل دخل ہے جتنا شعر و سخن میں بالخصوص صنف غزل میں۔

اچھے انشائیہ نگاروں نے اکثر ادنی باتوں کو انشائیہ کا موضوع بنایا ہے۔ بعض اوقات یہ موضوع بادی النظر میں اتنا معمولی دکھائی دیتا ہے کہ اس میں کسی خیال آفرینی کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ عام انسان بھی ان موضوعات کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے لہذا ان میں قطعاً کسی ندرت فکر و نظر کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہوتا مگر انشائیہ نگار جب اسی موضوع میں گہرائی، وسعت اور بلندی تلاش کرتا ہے اور اس موضوع پر غور کرنے کے نئے زاویے ڈھونڈھ نکالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ عام آدمی کا تاثر و علم ان روزمرہ کے موضوعات پر کتنا سطحی ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کی ژرف نگاہی، جودت فکر اور رعنائی خیال کن کن اسالیب سے اس ادنیٰ موضوع کو اٹھا کر فکر و فن کی بلندیوں پر لے جاتی ہے، اس سلسلہ میں اُردو انشائیہ نگاروں کی جو کھیپ کی کھیپ سامنے آئی ہے بڑے کامیاب تجربے کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ''بارہواں کھلاڑی''، ''چرواہا''، ''دستر خوان'' از وزیر آغا، ''سوال اٹھانا''، ''مکان بنانا'' از غلام جیلانی اصغر، ''آئس کریم کھانا'' از مشتاق قمر، ''چھینک'' از انور سدید، ''اخبار پڑھنا'' ''مچھلی کا شکار'' از جمیل آذر، ''پوسٹ کارڈ'' از رام لعل نابھوی، ''درمیانی منزل'' از اکبر حمیدی، ''تکلف'' از

حامد برگی، ''عینک'' از پرویز عالم، ''ڈائری'' از اسد اللہ، وغیرہ انشائیے اپنے موضوعی اعتبار سے اتنے اہم نہیں جتنے اپنے ٹریٹمنٹ (Treatment) کے لحاظ سے انشائیے بنے ہیں۔ یہی موضوعات کسی غیر انشائی ذہن رکھنے والے ادیب کے ہاتھوں میں جا کر کوئی اور ہی رنگ اختیار کرتے، انشائیہ نہ بن پاتے۔

کہتے ہیں جان کیٹس اور اس کے دوست لے ہنٹ نے ایک شب باہم چیپ مین کی ''ہومر'' پڑھنے میں گزاری۔ اگلے روز لے ہنٹ نے اس تجربے اور عمل کو خشک حقائق کی صورت اپنی ڈائری میں درج کیا جبکہ کیٹس نے اس تجربے کی بنیاد پر ایک انتہائی خوبصورت ''سانیٹ'' تخلیق کی جہاں اس تجربے کو خیال و خواب کے گمنام جزیروں میں بادیہ پیمائی سے تشبیہ دی اور ماضی کی وسعتوں میں اپنے تصورات کی ان جولانیوں کا ذکر کیا جو اس مطالعہ کے دوران اسے نصیب ہوئی تھی۔

انشائیہ نگاری کے موجد مونٹین کے علاوہ بیکن کے مضامین بھی جو انشائیہ کی بنیاد کہے جا سکتے ہیں، روز مرہ کے موضوعات پر ہیں۔ دوستی، تحفہ، باغات، پھول، موت اور اسی نوعیت کی مجرد اور غیر مجرد حقیقتوں پر ان کے موضوعات میں بہ ظاہر کسی فکر و فلسفہ کی تلاش ممکن نہیں، ان روز مرہ حقیقتوں پر حقیقت مندانہ غور و خوض ہی ہو سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان موضوعات پر فکر و فلسفہ کا اظہار فلسفہ بگھارنے والی بات ہوگی اور کسی ذہن کو قائل نہ کر سکے گی مگر جب انشائیہ نگار حقیقت کی کھونٹی پر فلسفہ و خیال کی رنگ برنگ ڈوریاں باندھنے لگتا ہے تو آنکھوں کے سامنے قوس قزح سی بکھرنے لگتی ہے اور موضوع آب رواں کی طرح اپنی گہرائی، وسعت اور فاصلے سمیٹتا آگے بڑھنے لگتا ہے، موضوع کی کثافت اور دھند دور ہونے لگتی ہے اور نئے منظر سامنے آنے لگتے ہیں۔

انگریزی ادب میں انشائیہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جنہوں نے انشائیہ نگاری کے ذریعہ ہی انگریزی ادب میں اپنا مستقل مقام پیدا کیا ہے۔ چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ، لے ہنٹ، آر ایل سٹیونسن وغیرہ گزشتہ صدی کے نامور انشائیہ نگار تھے۔ ان کے انشائیوں کے موضوع بھی روز مرہ کے ادنیٰ مشاہدوں، تجربوں اور سوچوں پر مبنی تھے۔ اسٹیونسن نے تو ''کاہلوں کی وکالت'' ایک خوبصورت انشائیہ رقمطراز کیا۔ لیمب نے

''کنواروں کا شکوہ'' نام کا خوبصورت انشائیہ قلمبند کیا۔ فطری مناظر، مظاہر اور مشاہدات پر تو بہت گرانقدر انشائیے لکھے گئے۔ ولیم ہیزلٹ کا انشائیہ ''سیر و سفر پر'' ان انشائیوں میں سر فہرست ہے۔ یہ وہ جواہر پارے ہیں جن کے ذکر کے بغیر انگریزی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ رومانوی تحریک کے احیاء کے، اس دور سے پہلے اٹھارویں صدی کا ادب بھی انگریزی ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالخصوص یہ وہ دور ہے جس میں انگریزی نثری ادب نے زبردست فروغ پایا۔ افسانوی ادب، ناول نگاری کی صورت میں ابھی منصۂ شہود پر نہ آیا تھا، ہم اس دور کو بجا طور پر انشائی ادب کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کا شعر و ادب معقولیت کا حامل ہے۔ پختگی، فکر و خیال انشائی ادب کی خاص صفت ہے۔ انشائیہ اور افسانہ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ انشائیہ بالغ نظری اور زندگی کے وسیع تجربے اور فکر کی پختگی اور بلوغت کا تقاضا کرتا ہے۔ جبکہ افسانہ کا تعلق انسان کی جذباتی زندگی سے ہے۔ افسانہ نگار عمر کے ایک خاص دور میں بیٹھ کر اس دور میں باتیں کہہ رہا ہوتا ہے۔ اس کے مخاطب بھی بالخصوص اسی جذباتی دور سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ جس طرح کہانی قصہ اور داستان کے اصل مخاطب لڑکپن کے دور سے تعلق رکھنے والے نوعمر لڑکے لڑکیاں ہیں جو کل کے گھوڑوں پر سوار پرستانوں اور کوہ قاف کی مہمات پر روانہ ہوتے ہیں، جنوں، بھوتوں، پریوں اور جادوگروں کی طلسماتی دنیا میں خیالی پروازیں کرتے ہیں، اسی طرح افسانہ بھی جوان امنگوں کی تسکین کا ذریعہ بنتا ہے اور مخاطب اٹھارہ سال کی عمر سے لے کر چالیس سال کی عمر تک کا قاری ہے جبکہ انشائیہ کی صحیح امنگ اور تحریک ہی دور شباب سے گزر کر ہوتی ہے، اس دور میں جب انسان زندگی بھر کے اتار چڑھاؤ، بچپن کی بلند پروازیوں اور شباب، امنگوں اور جذباتی بوقلمونیوں پر خوش دلی سے، تحمل اور بردباری سے اور بصیرتی سے ہنس اور مسکرا سکے، اپنی زندگی بھر کی کارگزاری کی روشنی میں اپنی حماقت اور کم عقلی اور بے بصیرتی کا جائزہ لے سکے، وہ عرفان و آگہی کے اس مقام پر ہو جہاں زندگی بھر کی سنجیدہ باتیں ادنیٰ اور بے حقیقت نظر آئیں، زندگی لہو و لعب اور دنیا بازیچۂ اطفال دکھائی دے۔

اٹھارویں صدی کے انگریزی شعری ادب میں بھی واضح طور پر انشائیہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ کلاسیکی شاعری جس میں جذبہ و تخیل کی بجائے شعور، ہیئت اور زبان و بیان کو زیادہ

اہمیت دی گئی شاعری ہوتے ہوئے بھی مضمون نگاری اور انشائیہ کے زیادہ قریب آ گئی۔ الیگزانڈر پوپ نے تو باقاعدہ پابند شاعری میں انسان اور فن تنقید پر منظوم انشائیے تحریر کئے۔ دراصل نظم میں معقولیت اور حقیقت کا رنگ اگر جذبہ و تخیل اور ماورائی حقائق سے گہرا ہو جائے تو وہ نظم، نظم ہوتے ہوئے بھی نثر ہوتی ہے۔ اپنی ان منظومات کا نام Essays رکھ کر پوپ نے مزید حقیقت پسندی کا ثبوت دیا۔ پوپ کے علاوہ ایڈیسن اور سٹیل نے معقولیت پسندی کے اس رجحان کو اپنے نثری روزناموں کی صورت میں ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر میں رائج کیا۔ یہ نثر نامے موضوعی اعتبار سے بھی، سب کے لحاظ سے بھی انشائیہ کی ٹھوس بنیاد بنے۔ ان روزناموں میں معاشرہ کی بعض کمزوریوں اور فیشن کے رجحان کو موضوع بنایا گیا۔ ان تحریروں میں ہلکے ہلکے دبے دبے طنز اور مزاح کو شامل کیا گیا مگر کچھ اس طرح کہ خود ہنسنے والا اپنے آپ پر ہنس اور مسکرا سکے۔ ان تحریروں کو ہم باقاعدہ طنز نگاری اور مزاح نگاری میں شمار نہیں کر سکتے بلکہ شگفتہ تحریر کے زمرے میں لا سکتے ہیں۔ انشائیہ بھی اسی شگفتگی کا تقاضا انشائیہ نگار سے کرتا ہے۔ سوفٹ اور گولڈ سمتھ اس دور کی دو اور قد آور شخصیتیں ہیں جنھوں نے نثر نگاری اور انشاء پردازی کے فن سے معاشرے کو سنوارنے کا کام لیا۔ اس دور کا انشائیہ صاف اور جلی آئینہ ہے، جس میں اس دور کی تصویر من وعن دکھائی دیتی ہے، صرف شکل وصورت ہی نہیں عکس باطن بھی۔ دراصل اس دور کے انشائیہ نگاروں نے ظاہر کو اس طرح پیش کیا ہے کہ باطن بھی ظاہر ہو کر سامنے آ گیا ہے۔

انشائیہ کی فضا ہلکے پھلکے لطیف انداز نگارش کا تقاضا کرتی ہے کچھ اس طرح کہ جیسے انشائیہ نگار اپنے کسی قاری کے ذہن کو گرانبار نہیں کرنا چاہتا۔ انشائیہ نگار اپنے قاری کو ساتھ لے کر آگے چلتا ہے جہاں ہنستا ہے وہاں اپنے قاری کو بھی ہنسنے پر مجبور کرتا ہے، جن کیفیات سے گزرتا ہے قاری کو بھی ان میں مبتلا کرتا ہے۔ غزل کے اشعار کی طرح انشائیہ نگار کا خیال بھی قاری کے دل کی آواز ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار کے خیال کی گونج کو قاری اپنے دل میں محسوس کرتا ہے، انشائیہ کا ہلکا پھلکا سبک اور لطیف انداز اپنے اندر وہی کیفیت رکھتا ہے جو غزل میں حسن تغزل، دونوں ہی صورت میں بات کہنے کا انداز خواہ کتنا ہی سہل ہو اپنی معنوی گہرائی ضرور رکھتا ہے۔ سادہ الفاظ کے پس پردہ مفہوم ومطالب کا خزانہ پوشیدہ ہوتا ہے۔

غزل کے مقطع کی طرح انشائیہ کا، ''مقطع'' بھی بڑا اہم ہے۔ اسے بالخصوص بڑا جاندار ہونا چاہئے۔ غزل کے آخری شعر کی حیثیت سے مقطع کا اثر آدمی کے دل دماغ پر دیرپا ہوتا ہے، عموماً کسی شاعر کے جو اشعار دہرائے جاتے ہیں اور ضرب الامثال کی طرح استعمال کئے جاتے ہیں وہ مقطع کے ہی شعر ہوتے ہیں۔ مقطع میں شاعر اپنا ایک ذاتی ٹچ (Touch) دیتا ہے اور غزل میں بیان کردہ مضمون یا مضامین کو اپنی ذات کا حوالہ عطا کرتا ہے۔ لہٰذا مقطع غزل کے خیال اور مزاج کو سمیٹتا ہے اور اپنا ایک ڈرامائی تصور رکھتا ہے، جہاں شاعر کی ذات غزل کی مجسم صورت بن کر سامنے آتی ہے۔ غزل نے جو نوادرات خیال ہمیں مہیا کئے تھے وہ ہم اس شاعر کی ذات سے منسلک کرنے لگتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر و خیال میں شاعر کی روح سمائی ہوئی نظر آتی ہے اور ہر شعر و خیال ایک جاندار وجود کی صورت ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ کے اختتام کو بھی اپنا ڈرامائی تاثر چھوڑنا چاہئے۔ انشائیہ میں جو نتیجہ اخذ کیا جائے، جو تاثر پیدا کیا جائے اسے ہم انشائیہ نگار کی ذات کے حوالے سے دیکھیں تو وہ ایک زندہ تجربہ و خیال نظر آئے گا۔ ایک جیتے جاگتے انسان کی سوچ جو ایک انسان سے منسوب ہونے کے باوجود ایک انسان کی سوچ نہیں، نوع انسانی کی سوچ دکھائی دے گی، ہر شخص اسے اپنی ہی ذات کا اظہار سمجھے گا۔ انشائیہ نگار کا ہر خیال قاری کو اپنا خیال معلوم ہوگا۔ اپنے دل کی بات، صرف اظہار کا انداز انشائیہ نگار کا منفرد ہوگا، بالکل اسی طرح جس طرح غزل کی روایات تو جانی پہچانی ہوتی ہیں صرف ان روایات کو برتنے کا انداز شاعر کو انفرادیت عطا کر دیتا ہے۔

میرے خیال میں انشائیہ، مضمون اور مقالہ میں بنیادی فرق وہی ہے جو غزل، نظم اور قصیدہ یا مثنوی کی نوعیت کی طویل نظم میں موجود ہے۔ انشائیہ کو میں نثر نگاری کی غزل قرار دیتا ہوں جس میں اسی نکتہ رسی، ژرف نگاہی، خیال آفرینی، ایمائیت، ندرت فکر، نغمگی اور پُرکاری کی ضرورت ہے۔ جیسی غزل میں یہ بات شاعری یا نثری نگاری کی کسی اور صنف میں اس درجہ موجود نہیں جتنی انشائیہ میں ہے۔

□□□

احمد حسین آزاد

صنف انشائیہ

انشائیہ نثری ادب کی ایک مخصوص صنف ہے، جو مختلف وقتوں میں انشائی ادب، انشائے لطیف، ادب لطیف، لطیف پارہ، انشاء پردازی، جواہر پارے، خیالات پریشاں، مضمون، جواب مضمون، مزاحیہ اور طنزیہ جیسے مختلف ناموں سے یاد کی جاتی رہی ہے۔ سب سے پہلے جس نقاد نے اس صنف کو انشائیہ کا نام بخشا اور اُردو ادب میں اس کو ایک صنف کی حیثیت سے روشناس کیا، اُردو دنیا اس کو ڈاکٹر اختر اورینوی کے نام سے جانتی ہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے سید شاہ علی اکبر قاصد کے مجموعۂ مضامین ''ترنگ'' کا جو مقدمہ 10 رجولائی 1942ء کو لکھا تھا، وہ صنف انشائیہ پر اُردو کا پہلا مقالہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ تحقیق کہ:

''انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے مخصوص معنوں میں غالباً مہدی حسن نے استعمال کیا ہے۔''

ثبوت کے بغیر قابل اعتبار نہیں ہوسکتی۔

انشاء عربی لفظ ہے جو ''نشا'' سے مشتق ہے۔ لغت میں انشاء کا ایک معنی ''دل سے کوئی بات کرنا'' بھی ہے۔ لفظ انشائیہ اسی انشاء سے مشتق ہے۔ چونکہ انشائیہ بھی فن کار کے ذہن کی پیداوار ہے، اسی لئے اس کے خالق کو ہم انشائیہ نگار کہتے ہیں۔ دیگر ادبی تخلیقات کی طرح انشائیہ بھی چونکہ فن کار کے ذہن کی پیداوار یا ادبی تخلیق ہے، اس وجہ سے اس کی منطقی اور قطعی تعریف کرنا تو ادبی روایت کے خلاف بھی ہے اور ممکن بھی نہیں۔ البتہ اس صنف کے ان محاسن اور خصوصیات کی روشنی میں اس کے حدود اور خط و خال کی نشان دہی ہوسکتی ہے۔ جو اس صنف کی تصویروں میں خطوط اور لکیروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ صنف انشائیہ سے

متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر اختر اورینوی لکھتے ہیں:

''دراصل انشائیہ فلسفیت اور رنگینی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ایسی فلسفیت جس میں دل جلے پن، خشونت یا وحشت خیز سنجیدگی نہ ہو، یہاں فلسفہ ہوتا ہے مگر بغیر رندھے ہوئے چہرے کے، رنگینی ہوتی ہے مگر ذمہ داری کے ساتھ۔ رندی اور احتساب کا عجیب و غریب مجموعہ مضحکہ خیز نہیں ہوتا، بلکہ امتزاج کامل کے نتیجہ میں ایک بڑی دل نواز شخصیت پیدا کرتا ہے، ایک ایسی صوفیت جس میں مزاح کا نمک ملا دیا جائے۔ انشائیوں میں واقعات تو ہوسکتے ہیں، مگر ان کا استعمال اور برتاؤ انشائیہ کے خاص رنگ میں ہونا چاہئے۔ انشائیوں میں مختصر افسانوں کی تکنک برت دی جائے تو پھر یہ انشائیہ نہیں رہے گا۔ بعض ادباء انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں مگر اس میں ماجرا اتنا بالیدہ ہوجاتا ہے اور مختصر افسانوں کی تکنک اتنی چھا جاتی ہے کہ نتیجہ میں جو چیز پیدا ہوتی ہے، وہ کم از کم انشائیہ نہیں ہوتی۔'' (مقدمہ ''ترنگ'' مصنف سید علی اکبر قاصد)

پروفیسر سید احتشام حسین نے لکھا ہے:

''ادھر کچھ دنوں میں اس خاص قسم کے مضامین کے لئے، جنہیں انگریزی میں ''ایسے'' کہا جاتا ہے، ''انشائیہ'' کی اصطلاح عام ہوگئی ہے اور بظاہر مناسب بھی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ مخصوص قسم کے مضامین عام علمی مقالوں، مضمونوں اور دوسرے انشاء پردازی کے نمونوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ویسے اس طرح کے ادبی مضامین عربی اور فارسی میں بھی مل جاتے ہیں۔ جن کا اصل مقصد کوئی معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ انشاء پردازی کا زور دکھانا اور بعض علمی اور تہذیبی موضوعات کی طرف ذہن کو منتقل کرکے چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اسے تو (انشائیہ کو) ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہئے، جو پڑھنے والوں کے ذہن پر

منطق اور استدلال کے ذریعہ نہیں (بلکہ) محض خوش گوار استعجاب اور بے ترتیب مفکرانہ انداز بیان کے ذریعہ اپنا تاثر قائم کرے۔"

("اُردو انشائیہ" مرتبہ صفی مرتضیٰ)

ڈاکٹر سلام سندیلوی رقم طراز ہیں:

"انشائیہ کا مفہوم اُردو ادب میں تقریباً وہی ہے، جو انگریزی میں Essay کا ہے۔ لغوی اعتبار سے Essay کا مفہوم ہے کسی موضوع کے لئے کوشش کرنا۔ اس کا مقصد مکمل اور جامع تفتیش نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کے کسی پہلو کے چند نقوش کو اُبھارتا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ بنیادی طور اور اصولی اعتبار سے یہ سخت غلطی ہے کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ ہیں اور ہر ایک کے حدود جدا جدا ہیں۔"

(ادب کا تنقیدی مطالعہ)

ڈاکٹر سید محمد حسنین کا خیال ہے:

"انشائیہ میں داخلیت یعنی Subjectivity کا ہونا شرط ہے۔ یہ داخلیت انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات کی غماز ہوتی ہے۔ یہ اس کے مشاہدہ، کثرت مشاہدہ کا ثبوت دیتی ہے۔ یہ داخلیت مجرد نہیں ہوتی۔ یہ خارجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی اور شگفتہ بیانی ہے۔ اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتا بلکہ پرائے دل، دماغ کے پاس بھی جا پہنچتا ہے۔ اس کی باتیں رنگا رنگ ہوتی ہیں۔ یہ ذاتی ہوتی ہوئی بھی پرائی بو باس لے کر آتی ہیں۔ اچھے اور معیاری انشائیوں میں داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے ایک شیفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی شیفتگی ہوتی ہے جو وقتی نہیں ہوتی۔ اس کی تر و تازگی کو ثبات حاصل

ہوتا ہے اور یہ ہمہ گیر ہوتی ہے۔۔۔ سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ کر دینا اور غیر سنجیدہ کو سنجیدہ بنا دینا، معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا انشائیہ نگار کی نیرنگی نظر کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے...... مزاح کو میں انشائیہ کا جوہر اعظم خیال کرتا ہوں۔ یہ انشائیہ نگار کی سیرت کا خمیر ہے اور یہی اس کی قلمکاری کا رنگ روغن، کیفیہ نگار کی طرح وہ محزوں یا قنوطی نہیں ہوتا۔ زندہ دلی اس کا مسلک ہے، خوش طبعی اس کی عادت اور شگفتہ بیانی اس کا مذاق۔ انشائیہ نگار سیلانی ہوتا ہے، خفقانی نہیں ہوتا۔ اس کی وحشت میں غمنا کی نہیں طربنا کی ہوتی ہے۔ وہ سودائی بن سکتا ہے، پر مجنوں نہیں ہو سکتا۔ وہ صحرا نوری کر سکتا ہے، سر نہیں پھوڑ سکتا۔"

(صنف انشائیہ اور چند انشائیے)

عبادت بریلوی تحریر کرتے ہیں:

"انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی اور ادبی نہیں ہوتا۔ معلومات کا فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں۔ اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے، جس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔" ("انشائیہ نمبر"، "ادیب" علی گڑھ)

اختر علی تلہری نے یوں اظہار خیال کیا ہے:

"انشائیہ اپنے محدود معنیٰ میں اس صنف ادب کو کہتے ہیں، جو مکاتیب کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ لیکن یہاں اس کا وسیع مفہوم مراد ہے۔ جس میں ادب کی وہ تمام اصناف داخل ہیں، جن میں تخیل کا تخلیقی عمل نمایاں ہو۔" ("انشائیہ نمبر"، "ادیب"، علی گڑھ)

پروفیسر محمد یٰسین کہتے ہیں:

"انشائیہ ادب لطیف کی وہ صنف ہے، جسے عام طور پر ہلکے پھلکے ادب (Light Literature) سے منسوب کرتے ہیں۔ یعنی جس میں

انشاء پردازی کا مقصود علمی و ادبی یا سماجی و اصلاح نہیں بلکہ محض نشاطی
اور انبساطی ہے۔ مقالہ نگاری کی سنجیدگی کے بغیر بھی ایک کامیاب انشاء
پرداز محض اپنی انفرادیت کے بل بوتے پر اپنے فن میں وہ کمال کر سکتا
ہے جو دوسروں کو بہ آسانی نصیب نہیں ہوتا۔''

(انشائیہ نمبر،''ادیب''علی گڑھ)

پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے:

''انشائیہ دراصل ایسے اور ادب لطیف کے درمیان واقع ہوتا ہے
نہ یہ ادب لطیف اور ادب پاروں کی طرح کھوکھلا اور بے مغز ہوتا ہے اور
نہ ایسے کی طرح خشک۔ انشائیہ ادب لطیف اور ادب پاروں سے حسن
بیان لیتا ہے اور ایسے سے موضوع کی Stability اول الذکر ہمیشہ جزو
اعظم ہوتا ہے۔'' (اشارہ، ماہنامہ، پٹنہ، مارچ 1960ء)

ڈاکٹر جانسن کا خیال ہے:

''انشائیہ ایک ذہنی ترنگ ہے، جس میں بے ترتیب، غیر منضبط
اور ناپختہ خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔''

(The English Essays and Essayists)

بیکن کا کہنا ہے:

''ایسی مختصر تحریریں جن میں بغیر کسی تجسس اور کھوج کے کسی
حقیقت کا اظہار ہو جائے میری نظر میں انشائیے ہیں۔''

(English Essays)

آر۔ ڈبلیو جیپسن لکھتے ہیں:

''انشائیہ کسی شئے یا واقعہ کی تشریح، تفسیر یا بیان ہو سکتا ہے۔ اس
میں استدلالی، تنقیدی، مباحثی یا سوانحی تحریریں شامل کی جا سکتی ہیں۔
انشائیہ طویل بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی۔ اس کا لب و لہجہ سنجیدہ بھی
ہو سکتا ہے اور سبک بھی۔ اس کا اسلوب جذباتی، رمزیہ، محسوساتی یا

طنزیہ ہو سکتا ہے۔ اس کے موضوعات میں حقیر چیزیں بھی ہیں اور اعلیٰ
مضامین بھی۔ انشائیہ ہیزلٹ پر بھی ہو سکتا ہے اور اسکول کے کسی
شرارتی بچے کے بارے میں بھی۔'' (Essays by Modern Writers)

آر۔ سی۔ گوفن لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں انشائیہ کا تعلق قدیم یونانی طنز نگاری سے
ہے، جسے فنی اصطلاح میں "Satura" کہتے ہیں۔ اس میں ایسی نظمیں
شامل تھیں، جن میں نہ غنائیت کی شدت ہوتی تھی اور نہ ڈراموں کی سی
توانائی بلکہ جن میں ایک لاابالی پن اور بے ربطی ملتی ہے۔ Satura میں
جارحیت کا کوئی تصور یا عنصر نہیں تھا۔''

(Some Round About Papers)

انشائیہ کی تعریف کے سلسلہ میں مذکورہ بالا فن کاروں کے تصورات و خیالات میں چند
امور مشترک اور چند متضاد ہیں۔ تصورات و خیالات کا یہ اختلاف ایک فطری امر ہے
کیوں کہ انشائیہ ایک ادبی تخلیق ہے اور ادبی تخلیقات کا تعلق چونکہ مختلف فن کار اور ان کے
ذہن و دماغ سے ہوتا ہے اس لئے فن کاروں کے تصورات و خیالات میں تنوع اور تضاد کا پایا
جانا یقینی اور لازمی ہے۔ مذکورہ فن کاروں کے تصورات و خیالات کا تجزیہ کرنے سے معلوم
ہوگا کہ بے تکلف انداز بیان، غیر رسمی طریقۂ عمل، شخصی اظہار، بے ربطی، مزاحیہ اور طنزیہ فضا
اور جامع اختصار انشائیہ کی امتیازی خصوصیت ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے انشائیہ کا میدان
بڑا وسیع ہے۔ انشائیہ نگار کی نگاہ رائی اور پہاڑی دونوں کو دیکھتی ہے۔ ایک انشائیہ میں سقراط
و بقراط کے فلسفے کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور قیس و فرہاد کی صحرا نوردی اور کوہ کنی بھی۔ انشائیہ
نگار آسمان کے تارے بھی توڑتا ہے اور سمندر کی تہوں سے موتی بھی نکالتا ہے۔ ایورسٹ کی
چڑھائی ہو یا پولو میدان، ارہر کا کھیت ہو یا پارلیامنٹ، ہیرے کی کان ہو یا کھیرے کی دکان،
انشائیہ نگار ہر جگہ آزادانہ گھومتا ہے۔ اس کا قلم محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔
اس کی دنیا رنگا رنگ ہوتی ہے۔ اس کی جھولی میں ہاتھ ڈالیے تو ہیرے اور کنکر دونوں ہی ملیں

گے۔وہ ہر وادی میں آزادانہ پھرتا ہے اور اپنی جھولی میں رنگ برنگ کے پھول بھی جمع کرتا ہے اور سنوار بھرے تالاب سے گھونگھے بھی اٹھالیتا ہے۔سنجیدہ موضوع کو غیر سنجیدہ بنا کر پیش کرنا اس کا کمال سمجھا جاتا ہے۔خیالات اس کے قلم سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں۔اس کا ذہن دائیں بائیں کبھی نہیں مڑتا دنیا کی ہر چیز انشائیہ کا موضوع بن سکتی ہے۔انشائیہ نگار پر انگریز مصنف کا یہ قول صادق آتا ہے:

"He can catch hold of anything and can make some thing out of nothing"

اور بقول جے۔ پی۔ مورٹن

''انشائیہ نثر کا ایک ایسا ٹکڑا ہے، جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔''

انشائیہ نگاری واقعہ نگاری نہیں ہے۔واقعات کی پیش کش میں انشائیہ نگار کا قلم بڑا محتاط ہوتا ہے۔انشائیہ نگار واقعات سے کام لیتا ہے۔مگر انشائیہ کی طبعی نزاکت اس کے پیش نظر ہوتی ہے۔انشائیہ میں تاثرات کی بوقلمونی ہوتی ہے۔واقعات کی جگہ زیادہ تر محاضرات (Anecdotes) کام آتے ہیں۔انشائیہ کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی ،تنوع اور رنگا رنگی میں مضمر ہوتا ہے۔افسانہ کا جامع اختصار انشائیہ میں بھی ہوتا ہے۔لیکن افسانہ نگار، افسانہ نگاری کے اصولوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے اور انشائیہ نگار کی طرح وہ بے لگام نہیں ہوتا۔ انشائیہ میں کوئی مرکزی خیال بھی نہیں ہوتا جو اس کے منتشر خیالات کو زنجیری سالمیت عطا کرے۔انشائیہ نگار بت پرست نہیں، وہ بت شکن اور بت تراش ہوتا ہے۔انشائیہ میں واقعات کا استعمال اور برتاؤ انشائیہ کے مخصوص رنگ میں ہونا چاہئے۔انشائیہ کی روح دراصل وہ شخصی تاثرات اور محاضرات ہیں جو داخلی اور خارجی رنگوں کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

انشائیہ سنجیدہ بھی ہوتا ہے اور غیر سنجیدہ بھی۔مختصر بھی ہوتا ہے اور طویل بھی۔ایک انشائیہ نگار معمولی بات کو غیر معمولی اور غیر معمولی کو معمولی بنا کر پیش کرتا ہے۔اس کا قلم سیلانی ہوتا ہے۔لیکن انشائیہ نگار حواس باختہ نہیں ہوتا۔وہ ایک موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اور قاری کو دنیا کی سیر کرادیتا ہے۔اس کی بے ربط باتوں میں موہوم سی زنجیریت ہوتی ہے۔

انشائیہ نگار جہاں دیدہ ہوتا ہے اور ادبی دنیا کا بہترین باتونی بھی۔وہ ایک بات ختم کرتا ہے اور فوراً دوسری بات شروع کر دیتا ہے۔بات سے بات نکالنے میں اسے کمال حاصل ہوتا ہے اور اچانک چپ بھی سادھ لیتا ہے۔دل میں کچھ اور کی حسرت باقی رہ جاتی ہے۔قاری پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔خیالات دھندلے دھندلے اور منتشر نظر آتے ہیں۔قاری ان کو گرفت میں لاکر مضمون کا روپ بخشنے سے قاصر ہوتا ہے۔بات بڑھانے اور اٹھانے میں انشائیہ نگار مطلق العنان ہوتا ہے۔منزل سے دوری یا موضوع سے بے نیازی انشائیہ نگاری کا ایک ایسا وصف ہے، جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔موضوع اور نفس مضمون کے درمیان ایک موہوم سا ربط ہوتا ہے۔اس کے جملے مختصر مگر جامع ہوتے ہیں اور ہر جملے معنوی اعتبار سے منفرد ہوتا ہے۔بقول شخصے کھونٹی اور لباس میں جو رشتہ ہے وہی انشائیہ کے موضوع اور نفس مضمون میں ہوتا ہے۔انشائیہ نگار اپنے موضوع کے ہر گوشے پر روشنی نہیں ڈالتا اور نہ مقالہ نگار کی طرح منطقی استدلال کو کام میں لاتا ہے۔وہ اپنے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اور اس کی نگاہ ساری دنیا پر ہوتی ہے۔پہلے جو کچھ لکھ چکا ہوتا ہے، اس سے وہ بے نیاز ہوتا ہے لیکن اس کے جملے مجذوب کی بڑ نہیں ہوتے۔وہ جو کچھ کہتا ہے، سادہ لفظوں میں کہتا ہے۔صحراؤں کی سیر کرتا ہے لیکن کسی درخت سے اپنا سر ٹکراتا نہیں ہے۔جھاڑیوں سے گزرتا ہے لیکن اپنا دامن بچا کر۔وہ مجنوں کی طرح بھٹکتا ہے مگر ہوشیاری کے ساتھ۔انشائیہ نگار دراصل ہوشیار پاگل ہوتا ہے۔وہ جنون میں بکتا ہے لیکن اس کی بکواس بے معنی نہیں ہوتی۔وہ زمین چھوڑ کر آسمان کا رخ کرتا ہے مگر زمین کو دیکھتا بھی رہتا ہے۔وہ جوش میں آتا ہے مگر ہوش کے ساتھ۔وہ آسمان کی سیر کرتا ہے مگر آنکھیں کھلی رکھتا ہے۔رات کی سیاہ زلفوں کو تابناک ستاروں سے سجا کر وہ ذہنی سکون محسوس کرتا ہے۔وہ شوخ بچوں کی طرح اُچھلتا ہے، مچلتا ہے، بیٹھتا ہے اور دوڑتا ہے لیکن میدان نہیں چھوڑتا۔وہ باتونی ہوتا ہے لیکن اس کی باتوں سے اکتاہٹ یا بوریت نہیں ہوتی۔ادب لطیف یا ادب پاروں کی طرح انشائیہ بے مغز نہیں ہوتا اور نہ مضمون و مقالہ کی طرح انشائیہ نگار متعین نکات (Fixed Points) کا پابند ہوتا ہے۔انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی ،تنوع

اور رنگا رنگی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ انشائیہ کے ہر جملہ میں نئی تازگی ہوتی ہے۔ اس کے جملے غزل کے منفرد اشعار اور مصرعے کی طرح ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنے اندر غنائیت کے علاوہ جامعیت بھی رکھتے ہیں۔

انشائیہ کی طرح طنز، ظرافت اور مزاح کی حیثیت ادب میں صنفی نہیں بلکہ توصیفی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ میں طنز، ظرافت اور مزاح تینوں چیزیں ملتی ہیں۔ لیکن انشائیہ کو طنزیہ، ظریفانہ اور مزاحیہ تخلیق آپ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ کوئی طنزیہ، ظریفانہ اور مزاحیہ تخلیق انشائیہ ہوسکتی ہے۔ طنز و ظرافت اور مزاح کا استعمال ایک انشائیہ میں بطور وصف ہوتا ہے اور ان تینوں کی مدت سے انشائیہ کی روح پھڑک اٹھتی ہے۔ مزاح انشائیہ کا ایک بنیادی وصف ہے اور انشائیہ کے غیر رسمی طریقہ اظہار میں شگفتگی اور تازگی بھی دراصل مزاحیہ فضا ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ مزاح انشائیہ کے لئے حیاتین ہے۔ مزاح کے مقابلہ میں طنز کی انشائیہ میں کم گنجائش ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طنز کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے سماج کے ناسوروں کو نشتر لگانا اور قوم کی کمزوریوں کو اجاگر کر کے قہقہے لگانا۔ طنز کے پیچھے طنز نگار کا اصلاحی مقصد کارفرما ہوتا ہے۔ جس کے سمجھنے کے لئے ذہانت درکار ہوتی ہے۔ طنز نگار کا وار بھرپور ہوتا ہے اور اس کے وار کی شدت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ طنز کی خلش کو برداشت کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ طنز کی خلش کم کرنے کے لئے ظرافت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ایک ظریف طبع انسان روتے آدمی کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ظریف آدمی کی نقل و حرکت اور انداز بیان کچھ ایسا عجیب و غریب ہوتا ہے کہ اپنے کاموں میں منہمک انسان بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظریف آدمی میں سنجیدگی، وقار یا رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا۔ مزاح نگار جس چیز پر ہنستا ہے، اس سے محبت کرتا ہے اور طنز نگار جس پر طنز کرتا ہے، اس سے برہم ہوتا ہے۔ زندگی اور ماحول سے طنز نگار کی برہمی کے نتیجے میں چہرے کے بدنما داغوں کو بے نقاب کرنے اور دوسرے کی کمزوریوں پر قہقہہ لگانے کے پیچھے نفرت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مزاح نگار دوسرے کی کمزوریوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ نفرت نہیں کرتا بلکہ ان کمزوریوں میں خود کو شریک جانتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے تاثرات کے اظہار کے وقت

دوسروں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا قلم ذہنی رو کے ساتھ حرکت پذیر ہوتا ہے۔ اس کی تحریر کا مقصد اصلاح یا کسی نظریہ کی اشاعت ہرگز نہیں، بلکہ صرف شخصی تاثرات کا اظہار ہے۔ انشائیہ میں طنز کی زیادہ گنجائش اس لئے نہیں ہے کہ طنز نگاری کا مقصد انشائیہ کے فن کو مجروح کرتا ہے۔ ظرافت نگار اور مزاح نگار کی طرح انشائیہ نگار خوش مذاق اور خوش طبع ہوتا ہے۔ جمالیاتی رنگوں سے کھیلتا ہے۔ خیالات کے باغ میں گھوڑے دوڑاتا ہے اور خوب صورت پھولوں سے اپنی دنیا سجاتا ہے۔ اس کی سادگی بڑی پرکار ہوتی ہے۔ شاعری کی طرح انشائیہ کا لب و لہجہ بھی نرم نازک اور پانی کے شیریں چشمہ کی طرح رواں دواں ہوتا ہے۔ انشاء پردازی اور مزاح کو انشائیہ نگار بڑا عزیز جانتا ہے۔ خشک سے خشک موضوع کو بھی جمالیاتی چھڑکاؤ سے شگفتہ اور تر و تازہ بنا دیتا ہے۔

انشائیہ نگار اپنا نظریہ کسی پر تھوپتا نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے، اپنے لئے لکھتا ہے۔ اس کی تحریروں سے دوسرے بھی محظوظ ہوں، اس کی آرزو اس کے دل میں نہیں ہوتی۔ اداریہ اور انشائیہ کا بنیادی فرق یہی ہے کہ اداریہ میں کسی مقصد یا نظریہ کی اشاعت ہوتی ہے جب کہ انشائیہ کے مضامین سے آپ کا متفق ہونا انشائیہ نگار ضروری نہیں سمجھتا ہے۔ مدیروں کی ادارتی تحریر میں جھنجھلاہٹ کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ لوگ اس کے نظریہ یا خیال کو مان لیں۔ انشائیہ نگار کی شگفتہ بیانی کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ لوگ اس کے خیالات سے متفق ہو جائیں۔ مدیر اپنی باتوں کو منوانے کے لئے مقالہ نگار کی طرح منطقی استدلال کو کام میں لاتا ہے۔ لیکن انشائیہ نگار منطقی استدلال کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔

انشائیہ نگار اپنے داخلی جذبات اور تاثرات کو پیش کرتا ہے۔ اس کی داخلیت میں ایسی کوئی آنچ نہیں ہوتی۔ جس سے دل و ذہن کے جھلنے کا اندیشہ لاحق ہو۔ اس کی داخلیت خارجیت کی ہم نوا ہوتی ہے۔ وہ اپنے دل کی بات ضرور کہتا ہے لیکن اس بات سے دوسرے، دلوں کی بو باس بھی آتی ہے۔ ایک کامیاب انشائیہ نگار خلوت میں جلوت کا تماشا پیش کرتا ہے۔ انشائیہ کا ہر لفظ جذبات و محسوسات میں ڈوبا ہوتا ہے۔ اس کے ہر جملہ میں نئی تازگی اور شگفتگی ملتی ہے۔ یہاں نہ جذبہ کی شدت ہوتی ہے اور نہ محسوسات کی پیش کش کا انداز پرسوز

ہوتا ہے۔ انشائیہ کے داخلی اظہار میں خارجی اثرات غیر محسوس طور پر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ انشائیہ نگار اپنے داخلی عینک سے خارجی مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ چیزوں کو دیکھتا ہے چھوتا ہے اور محسوس کر کے محظوظ ہوتا ہے۔ تاثرات کے اظہار میں وہ اپنی ذات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ شخصی اظہار انشائیہ کا ایک نمایاں وصف ہے۔ مکتوب نگاری کے برخلاف شخصی اظہار کے معاملہ میں انشائیہ نگار کسی غیر کی موجودگی کو بالکل خاطر میں نہیں لاتا۔ انشائیہ میں جو بات کہی جاتی ہے، اپنی ذات کے حوالہ سے کہی جاتی ہے۔ مگر انشائیہ خودنوشت سوانح عمری بھی نہیں۔ جس میں سوائے "انا" کے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اس میں داخلی اور خارجی رنگوں کا حسین امتزاج اور دھوپ چھاؤں کی بہار ہوتی ہے۔

انشائیہ نگاری کا مقصد انبساطی ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار قنوطیت کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتا۔ وہ اگر چہ اپنے کو نہیں بھولتا لیکن اپنے درد و کرب کو بھلا دیتا ہے۔ وہ اپنے زخموں سے ہمدردی کا سلوک نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اسے کریدتا رہتا ہے۔ زخموں کو چھیڑنے سے اسے تکلیف نہیں ہوتی مسرت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ فرد پر جماعت کو اور کل کو جزو پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے مگر انفرادی طور پر نہیں۔ وہ خوش رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو خوش دیکھنا پسند کرتا ہے۔ زندہ دلی اس کا مسلک ہے۔ ہر خوشی میں ایک دوسرے کو شریک دیکھنا اس کا مذہب ہے۔ وہ انتار جائیت پسند ہوتا ہے کہ ناکامی اور یاسیت اس کی قربت سے بھی گھبراتی ہے۔

□□□

سلیم اختر

انشائیہ کیا نہیں

اگر چہ انشائیہ کا جوانی یا خواب جوانی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا لیکن اس کے باوجود صورتِ حال یہ ہے کہ انشائیہ کی اتنی زیادہ متنوع بلکہ پر تضاد تعریفیں کی گئی ہیں کہ:

ہوں گی اے خواب جوانی تیری تعبیریں بہت

والی بات نظر آتی ہے بلکہ اب تو کثرتِ تعبیر نے انشائیہ کی تعریف کو ادبی "تائٹ میٹر" میں تبدیل کر دیا ہے...... اس حد تک کہ منیر نیازی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

"انشائیہ ایک ایسا حرف ہے جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔

انشائیہ کی تعریف کو ہدف بنا کر چاند ماری کرنے والوں کو عمومی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ جو خود انشائیہ نگار ہیں اور جو انشائیہ نگار نہیں مگر نقاد ہیں۔ اگر چہ علمی مباحث اور ادبی مسائل کی تفہیم کے ضمن میں شاید اس نوع کی عمومی گروہ بندی چنداں سود مند ثابت نہ ہو اور اگر کسی اور صنف کا معاملہ ہوتا تو شاید اس سے کچھ فرق بھی نہ پڑتا یعنی اس انداز پر فکشن کے بارے میں بحث نہیں کی جا سکتی کہ فکشن لکھنے والے اور فکشن نہ لکھنے والے ناقدین...... لیکن انشائیہ کی بحث میں یہ اضافی امر ہی اساس ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ انشائیہ نگار شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی انداز کے انشائیہ کو درست تسلیم کرتا ہے، جس انداز کا انشائیہ وہ خود قلمبند کرتا ہے، یا کر سکتا ہے۔ اس لیے اس کے بموجب "اصلی تے وڈا" انشائیہ وہی ہوتا ہے جیسا وہ خود قلمبند کرتا ہے لہٰذا وہ جس انداز کا انشائیہ قلمبند کرنے سے قاصر رہتا ہے وہ سرے سے اسے انشائیہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس نوع کی پالتو تعریفوں کا نتیجہ

یہ نکلا کہ انشائیہ کی تعریف، اس کی خصوصیات اور تکنیکی لوازم کے بارے میں خلطِ مبحث سے جو ناگوار بحثیں چھڑیں ان کی بنا پر انشائیہ کی تعریف علمی کی بجائے محض نجی بن کر رہ گئی ہے۔ انشائیہ میں مزاح ہو یا نہ ہو، اس میں طنز ہو یا نہ ہو، اسے سنجیدہ ہونا چاہیے یا غیر سنجیدہ۔ اس سے کسی نوع کی معلومات کا حصول ممکن ہے یا ناممکن، اس میں روحِ عصر کی ترجمانی کی صلاحیت ہو یا وہ اس سے عاری ہو۔ اس کا زندگی سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ یہ اور اسی نوع کے دیگر فنی تقاضے جو دیگر اصنافِ ادب میں بالعموم طے شدہ سمجھے جاتے ہیں۔ انشائیہ میں آج تک اگر ان کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کیا جا سکا تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انشائیہ نگار اس معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ وہ دوسرے کے انداز کو درست تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاں اچھا انشائیہ کم لکھا جا رہا ہے، البتہ اس پر اچھی بحثیں زیادہ بہتر ہو رہی ہیں چنانچہ احتشام حسین کے بقول:

> ''گزشتہ چند سالوں سے اردو کے کچھ ادیب خاص طور سے انشائیہ کے حدود متعین کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ان میں سے بعض نے خود بھی انشائیے کے مطابق انشائیے لکھ رہے ہیں لیکن اس فکر میں نہیں ہیں کہ وہ انشائیے کی تعریف بھی کریں۔ یہ وہ ہوشیار لوگ ہیں جن کو آم کھانے سے کام ہے گٹھلیاں گننے کا کام دوسرے کے سپرد کرنا چاہتے ہیں یا اکبرؔ الٰہ آبادی کی زبان میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ: ''شعر میں کہتا ہوں بچے تم کرو''

جہاں تک انشائیے پر تنقیدی تحریروں کا تعلق ہے تو ان میں بیشتر کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ ان میں اخذ نتائج کے ضمن میں Inductive Method سے کام نہیں لیا جاتا یعنی انشائیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی مشترک خصوصیات یا مابہ الامتیاز خصائص کے استنباط کی بنیاد پر بات کرنے کے برعکس پہلے سے طے شدہ نتائج، مفروضوں یا پھر پالتو تعصبات کی روشنی میں اچھے یا بُرے انشائیہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے یعنی وہی فرموں پر ٹوپی فٹ کرنے والی بات، اب فرمہ تو اٹوٹ ہے اس لئے ٹوپی کی گردن مروڑتے رہو۔ اس لیے انشائیہ کی پہچان، شناخت،

شجرۂ نسب یا امرونہی پر مبنی انشائیہ کیا ہے قسم کے مضامین پڑھ کر ذہن ایسا الجھتا ہے کہ جی چاہتا ہے اے کاش کوئی ایسا مضمون بھی لکھے جس کا عنوان یہ ہو، انشائیہ کیا نہیں!

آیئے ناقدین کی تعریفوں کے آئینہ میں انشائیہ کے سراپا کا جائزہ لیتے ہیں۔ سر فہرست ڈاکٹر وزیر آغا ہیں جو پاکستان میں انشائیہ کے قافلہ سالار ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک معروف مقالہ ''انشائیہ کی پہچان'' میں ''انشائیہ کی جان'' یہ بتائی ہے:

> ''......لیکن اگر آپ ان گھسی پٹی راہوں سے الگ ہو کر ایک نئے زاویے سے سمندر کے متمنی ہیں تو آپ سمندر کی طرف پشت کر کے کھڑے ہو جائیں اور پھر جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھیں تو آپ کو ایک ایسا منظر دکھائی دے گا جو آپ سے پہلے شاذ ہی کسی اور کو نظر آیا ہوگا ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنے کی یہ روش دراصل آپ کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کرے گی جو دیکھنے کے مروج انداز سے آپ کو آزاد کر دے، اس نئے مقام کی تسخیر کے بعد آپ کے ہاں جو عجیب و غریب ردعمل مرتب ہوگا وہی انشائیہ کی جان ہے''۔

مشکور حسین یاد نے اپنی تالیف ''ممکناتِ انشائیہ'' میں انشائیہ کی تعریف کے ضمن میں اسی خیال کا اظہار کیا:

> ''چونکہ انشائیہ ادب کا ایک فطری اظہار ہے اس لیے ہر ادیب اس کا موجد ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں جب اس کے ادب کا آغاز ہوا تو انشائیہ وجود میں آیا اس لئے کسی کا یہ دعویٰ کرنا کہ صرف وہی انشائیہ کا موجد ہے ایک کھلی حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ انشائیہ کی تعریف لفظوں میں نہیں ہوا کرتی، انشائیہ کی تعریف یا تو انشائیہ پڑھنا یا انشائیہ لکھنا''۔

نظیر صدیقی نے انشائیوں کے مجموعہ ''شہرت کی خاطر'' کے دیباچہ میں انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے قول محال کا سہارا لیتے ہوئے یوں لکھا:

''انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں میں مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے...... یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان اور نفس مضمون میں وہی نسبت ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان کا مضمون سے مربوط ہونا اتنا ضروری نہیں جتنا مضمون کا مضمون نگار سے متعلق ہونا ضروری ہے۔''

ڈاکٹر سید محمد حسنین انشائیہ نگار بھی ہیں اور انشائیہ پر ایک مقبول کتاب ''صنف انشائیہ اور انشائیے'' کے مرتب بھی۔ ان کے خیال میں:

''انشائیہ ادب کی وہ کمین گاہ ہے جہاں قلمکار بیٹھ کر جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے اکرام اور دشنام سے بے پروا ہو کر ہر نام اور ہر کام کی عظمت اور ذلت کا محاسبہ کر سکتا ہے۔ اپنی نابکاریوں کے اظہار و اشتہار پر ہم انشائیہ نگار پر کوئی قانونی دفعہ نہیں چلا سکتے کیونکہ ادب کا یہی وہ گوشہ ہے جہاں قلمکار کو ہر طرح کے بیان کی چھوٹ ہے۔ یہ گفتار کا وہ غازی ہے جسے سات نہیں سیکڑوں خون معاف ہیں۔''

یہ تو تھیں چار انشائیہ نگاروں کی تعریفیں ایسی تعریفیں جو کسی حد تک ان کے اپنے انشائیوں کے فنی مقاصد کی ترجمانی بھی کرتی نظر آتی ہیں۔ آیئے ناقدین کی تعریفیں بھی دیکھ لیں کہ وہ انشائیہ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ڈاکٹر اختر اور ینوی کے ''ترنگ'' کے دیباچہ سے رجوع کیا جاتا ہے جس کے بارے میں سید محمد حسنین کی یہ رائے ہے کہ انشائیہ کے موضوع پر یہ پہلا تنقیدی مضمون ہے۔ ڈاکٹر اور ینوی نے انشائیہ کی کئی خصوصیات گنوائی ہیں۔ ہمارے بعض حضرات انشائیہ میں مزاح کو پسند نہیں کرتے جبکہ

ڈاکٹر اختر اور ینوی کے بقول:

''انشائیوں میں مزاح کا عنصر بھی ضروری ہے ایک انشائیہ نگار مزاح کے ترکش کا ہر تیر استعمال کر سکتا ہے مگر سلیقہ شرط ہے مثلاً مزاح لطیف سے لے کر طنز تک کی یہاں گنجائش ہے اور ہنسی مذاق، بولی ٹھولی، پھبتی، سوانگ، گدگدی، چٹکی اور ظرافت کی دوسری قسموں کا بر محل استعمال انشائیوں میں جان ڈال دیتا ہے جملہ بازی یا فقرے کسنا یا وقت کی سوجھ یا پتے کی کوئی بات کہہ دی یا کوئی چبھتا ہوا ریمارک یا ہلکی سی چوٹ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے ظرافت کا استعمال ہر جگہ خوش مذاقی چاہتا ہے۔''

کلیم الدین احمد نے حسنین عظیم آبادی کے انشائیوں کے مجموعہ ''نشاط خاطر'' کے پیش لفظ میں لکھا:

''خط کی طرح انشائیہ بھی اپنی تلاش اور اپنی دریافت ہے جس میں انشائیہ نگار اپنے کردار کے پوشیدہ سرچشموں کو پالیتا ہے جس میں اس کی شخصیت کے متضاد عناصر ابھر آتے ہیں اور یہ اٹمل، بے جوڑ اور ہم آہنگی سے عاری نظر آتی ہے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو ابھارتا ہے اور اس طرح ان سے نجات پالیتا ہے۔ اس کا اصل موضوع اس کی شخصیت اور اس کی آزادی ہے کیونکہ دانشمند وہی ہے جو اپنی شخصیت کو پانے اور اپنی فطری آزادی کو ہاتھ سے جانے نہ دے۔''

ماہنامہ ''ادیب'' علی گڑھ کے انشائیہ نمبر (مئی ۱۹۵۹ء) میں انشائیہ کے موضوع پر مذاکرہ میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مختصر ترین الفاظ میں انشائیہ کی تعریف یہ کی:

''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حُسنِ انشا ہے اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں بجائے مغز و مضمون کے اصل توجہ حُسنِ عبارت پر ہو۔''

اسی مذاکرہ میں علامہ اختر علی تلہری نے اس خیال کا اظہار کیا:

''انشائیہ اپنے محدود معنی میں اس صنفِ ادب کو کہتے ہیں جو مکاتیب کی شکل میں ظہور پذیر ہوا لیکن یہاں اس کا وسیع مفہوم مراد ہے جس میں ادب کی وہ تمام اصناف داخل ہیں جن میں تخیل کا تخلیقی حُسن نمایاں ہو......انشائیہ تخیل کی عمل فرسائیوں کا نتیجہ ہے اگر کوئی ذہن تخیل کا سرمایہ دار نہیں ہے تو اس سے کبھی کوئی ''انشائیہ'' جسے واقعی ''انشائیہ'' کہا جا سکے وجود میں نہیں آ سکتا۔''

ڈاکٹر محمد حسن بھی اسی مذاکرہ میں شامل تھے اُنہوں نے انشائیہ کے بارے میں یہ کہا:

''میرے نزدیک انشائیہ یا ایسے صرف تابناک اور خود آگاہ قسم کی شخصیت ہی کے قلم سے نکل سکتے ہیں۔ انشائیہ یا مضمون تو بنیادی طور پر شخصی یادداشت ہے اور ظاہر ہے کہ جس قدر شخصیت زیادہ ہمہ گیر، خود آگاہ اور عظیم ہوگی اتنی ہی اس کی یادداشتیں دلچسپ ہوں گی۔''

سید صفی مرتضیٰ کی کتاب ''اردو انشائیہ کے تعارف'' میں سید احتشام حسین کے بقول:

''(انشائیہ کو)......''ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والوں کے ذہن پر منطق اور استدلال کے ذریعہ نہیں محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب مفکرانہ اندازِ بیان کے ذریعہ اپنا تاثر قائم کرے۔''

ڈاکٹر آدم شیخ نے اپنی مرتبہ ''انشائیہ'' میں ''خط و خال'' کے عنوان سے جو مقدمہ شامل کیا اس میں انہوں نے انشائیہ کے ''خط و خال'' اجاگر کرتے ہوئے یہ کہا:

''انشائیہ ایک ذہین، رنگین مزاج، ترقی پسند اور روایت شکن فن کار کے جذبات اور احساسات کا پرتو ہی ہوتے ہیں۔ ایک انشائیے میں لکھنے والے کے ان دبے ہوئے جذبات کا اظہار ہوتا

ہے جن کی راہ میں اس کے عہد کی سماجی، مذہبی اور اخلاقی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ انشائیہ نگار مروجہ اور فرسودہ روایتوں سے مانوسیت اور مطابقت پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے انفرادی نظریات اور کشمکش اظہار کے ذرائع ڈھونڈتی ہے۔ ادیب اس اظہار کے لئے زبان اور تحریر کا سہارا لیتا ہے لیکن اصنافِ ادب میں بھی جو تحریریں انشائیہ نگار کے نئے اور معنی خیز خیالات کی حامل ہوتی ہے اپنے مواد، ہیئت اور انداز بیان کی وجہ سے دوسری تحریروں سے منفرد ہوتی ہیں، یہی انشائیے ہیں۔''

''اردو لیسیز'' کے مرتب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی کے بموجب:

''ایسے نگار اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں حیات و ممات اور حوادثِ کائنات سے متعلق شوخی بیان کے ساتھ بعض اوقات صاف صاف اور بعض اوقات رمز و کنایہ میں کسی اخلاقی پہلو کو پیش کرتا ہے......ایسے نگار کی کامیابی کا گُر اس میں مضمر ہوتا ہے کہ وہ پند و نصیحت، طنز و مزاح اور لطافت زبان و بیان کو کام میں لاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسے نگار کے لئے اسک تا ساہر سے موضوع کا کام دیتی ہے اور وہ حقیر سے حقیر شئے کی اہمیت اور حسن کو اجاگر کر دیتا ہے۔''

جبکہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنے مخصوص اسلوب میں انشائیہ پر یوں اظہار خیال کیا ہے:

''انشائیہ مضمون نگاری کا ایک مخصوص انداز ہے اس میں بعض ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا ہر مضمون میں پایا جانا ضروری نہیں۔ انشائیہ کا موضوع عام طور پر علمی اور تحقیقی نہیں ہوتا معلومات کا فراہم اس کا مقصد نہیں، اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے

> جاملتی ہے۔ اس کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔ اس زندگی
> کے عام معاملات اس میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں معاملات
> کے نشیب وفراز کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔"

ان اصحاب نے اپنے انشائی مذاق اور تنقیدی شعور کی روشنی میں انشائیہ کے بارے میں جو کچھ لکھا اس سے جہاں اس کے مزاج کی لچک واضح ہو جاتی ہے وہاں بلحاظ تدبیر کاری اس میں تنوع کی وسعت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر انگریزی میں ایسے کی تعریفوں کے حوالے نہیں دیئے اور اس لیے کہ اب اردو میں انشایئے کے بارے میں اچھی بری آراء کی کمی نہیں۔ اردو میں اس صنف نے ایک صدی کا تخلیقی سفر طے کیا ہے اور اس سفر کے مختلف مدارج در اصل مختلف انشائیہ نگاروں کی تخلیقی اُپج کے مظہر ہیں۔ اس لیے ہمیں اپنے مخصوص مزاج کے حامل انشائیہ کو انگریزی تعریفوں کی روشنی میں پرکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ سر سید نے شعوری طور پر اس صنف کو اردو میں متعارف کرایا اور اُن انگریز اہل قلم کے نام بھی دیئے جن سے وہ متاثر ہوئے تھے مگر اس کے باوجود اُنہوں نے اس صنف کو اپنے مخصوص قومی مقاصد کے خاطر استعمال کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کی۔ بالفاظِ دیگر صنف کا تصور تو مستعار تھا مگر انہوں نے اپنی تحریروں کو ایڈیسن یا سٹیل کا چربہ بنانا اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے انشایئے کی انفرادیت بھی اس میں مضمر ہے کہ اس نے ماحول کے زیر اثر روح عصر کی ترجمانی کی اور یوں اپنا تشخص برقرار رکھا۔ اسے بعض حضرات ادبی بدعت سمجھتے ہیں میں اسے ان کا اجتہاد سمجھتا ہوں۔ انشائیہ ہی نہیں بلکہ کسی بھی صنف ادب کے کسی دوسرے ملک یا زبان اور بیگانہ کلچر میں پہنچنے یا فروغ پانے یا مقبولیت حاصل کرنے کے لئے یہی بنیادی شرط پاتی ہے کہ وہ اس قوم کے مخصوص مزاج اور اجتماعی شعور کی عکاسی کر سکے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تو ہمیشہ غریب الوطن رہے گی۔ ہمارے ہاں ناول، افسانہ انگریزی کے زیر اثر آئے تھے مگر اُنہوں نے ہمارے احوال کی یوں ترجمانی کی کہ وہ اب ہمیں "اپنے" معلوم ہوتے ہیں جبکہ اختر شیرانی اور ن۔م راشد جیسے شعراء کی کوششوں کے باوجود سانیٹ اردو میں مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس لیے کہ سانیٹ میں

ادا کئے جانے والے تمام تصورات، احساسات اور جذبات کو نظم اور غزل میں بھی بآسانی ادا کیا جا سکتا ہے اور یہی حال اردو میں انشائیہ کا بھی ہے کہ جن باتوں کو افسانہ، مضمون یا مقالہ میں کہنے کی گنجائش نہ تھی انشائیہ نے ان کی ادائیگی کے لئے ایک ذریعہ دے دیا اور اس میں انشائیہ کا جواز مضمر ہے۔ میں نے تو صرف یہ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے انشائیہ میں اظہار کی لچک ملتی ہے اسے اس کی امکانی حد تک لے جاتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

> "انشایئے، افسانے، ڈرامے اور دیگر فنی صورتوں میں بھی
> لکھے جاتے ہیں اور ان کا رشتہ کبھی ناول سے، کبھی ڈرامے سے کبھی
> افسانے سے جاملتا ہے درحالیکہ اپنے اپنے بنیادی رویے کی وجہ سے
> نہ یہ ڈراما ہیں نہ افسانہ، اور نہ ناول صرف ان فارموں کو جدا قسم کے
> رویے کے لئے اختیار کر کے انشائیہ نگار نے اپنی تخلیق پیش کی ہے۔"

اس لحاظ سے اگر ڈاکٹر احسن فاروقی نے تنقیدی انشائیہ ('نیا دور' کراچی خاص نمبر ۶۷۔۶۸) بعنوان "تنقید علم اور جہالت" قلمبند کیا تو وہ گویا انشائیہ میں لچک کے جو امکانات ہیں انھیں ان کے منطقی حد تک لے جا رہے تھے۔ ویسے انشائیہ کو اس انتہا تک لے جانا انشائیہ کی انفرادیت کو مجروح کرنے کا باعث بن سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تحریر کے جس وصف کو "انشائیت" سے موسوم کیا جاتا ہے تحریر اس سے عاری ہو کر اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے مگر وہ انشائیہ نہ رہے گی۔ ہر صنفِ ادب کے مخصوص فنی تقاضے ہوتے ہیں ایسے تقاضے جو تدبیر کاری اور اسلوب کو خاص رنگ میں رنگنے کا موجب بنتے ہیں یوں دیکھیں تو اصناف بھی آزاد اور خود مختار مملکتوں کی مانند اپنی اپنی حدود میں رہتی ہیں تاہم ایک صنف دوسری پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اس نوع کی اثر اندازی سے خاص قسم کی تخلیقی چمک بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس معاملہ میں فنی نزاکتوں کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے اس لئے انشائیہ اگر دیگر اصناف پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو اس وقت جب وہ اسلوب کے خمیر میں مل کر اپنا تشخص ختم کر کے شیر و شکر ہو جائے لیکن اس کے برعکس ہوا تو کباب میں ہڈی والی بات بن جائے گی۔

آغاز میں درج معروف انشائیہ نگاروں کی تعریفوں کا تجزیاتی مطالعہ کرنے پر واضح ہو جاتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ذہن میں انشائیہ کا تصور حالتِ معکوس سے مشروط ہو چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ انشائیہ نگار چیزوں کو نئے تناظر میں دیکھتا ہے اور اس تجزیہ کے حظ میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرتا ہے ورنہ وہ انشائیہ قلم بند نہ کرتا لیکن ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں یہ بنیادی حقیقت فراموش کر گئے کہ چیزوں کو نئے زاویے سے دیکھنے کے لئے وقوعات، حوادث اور افراد کی طرف ''پشت کر کے کھڑے ہو جائیں اور پھر جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے'' دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ غلام جیلانی اصغر نے بھی اپنے ایک مضمون ''انشائیہ کیا ہے'' میں اسی انداز کی بات کی ہے:

> ''آپ جب انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی سا زاویہ مل جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ سر کے بل کھڑے ہو کر دنیا کو دیکھ رہے ہوں اور آپ پر زندگی کی ایسی ابعاد منکشف ہو رہی ہوں جو اس سے آپ کے اندر کی آنکھ یعنی تیسری آنکھ سے پوشیدہ تھیں۔ آپ چاہیں تو پہاڑ کی کسی چوٹی سے بھی چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں بھی اشیاء کا ایک نیا رخ آپ پر واشگاف ہو جائے گا''۔

یہ نہیں معلوم تھا کہ انشائیہ نگاری کے لئے یوگا کی مشقیں بھی ضروری ہیں اسی طرح اگر وہ احتیاطاً یہ بھی ہدایات دے دیتے کہ پہاڑی کی چوٹی کی کتنی بلندی ہو تو خاصی سہولت رہتی کیونکہ بلند سے بلند تر ہوتے جاتے ہیں نہ صرف یہ کہ نگاہ کے زاویے تبدیل ہوتے جاتے ہیں بلکہ بلندی کا ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں سے نیچے کا تمام منظر معدوم ہو جاتا ہے۔ انشائیہ جو ایک سیدھی سادی بلکہ خاصی بے ضرر صنفِ ادب ہے اسے احباب کی تعریفوں، توجیہات اور تشریحوں نے عجیب و غریب چیز بنا کر پیش کر دیا ہے جبکہ سیدھی سی بات یہ ہے کہ فن کار کے تخلیقی مشاہدہ کا جسمانی حرکات سے مناظر کی تبدیلی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں جبکہ خود غلام جیلانی اصغر ''اندر کی آنکھ یعنی تیسری آنکھ'' کی اہمیت کو بھی سمجھتے ہیں تو پھر سر کے

بل کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہر تخلیقی فن کار زندگی کو نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو وہ تخلیقی فن کار کیسے کہلائے گا لیکن اس کے لئے شاعر، افسانہ نگار، مصور یا سنگ تراش کو چمگادڑ سے، انسپریشن لینے کی کیا ضرورت ہے؟ چیزوں کو نیا مناظر عطا کرنے والی تخلیقی اُپج ہوتی ہے جس کا تعلق بصارت سے نہیں بلکہ بصیرت سے ہوتا ہے۔ ہر تخلیقی فن کار اس معاملے میں دیوتا سمان ہوتا ہے کہ وہ تیسری آنکھ بھی رکھتا ہے اور یہ تیسری آنکھ ہی اسے یہ اہلیت عطا کرتی ہے کہ وہ افراد، اشیاء اور وقوعات کے بارے میں عمومی اور مروج ردعمل کا اظہار کرنے کے برعکس تخلیقی سطح پر انھیں نئے روپ اور نئی سطح پر انھیں نئے روپ، نئی زندگی اور نئی توانائی سے ہمکنار کرتا ہے۔ دراصل اوریجنل بننے کی تمنا میں ڈاکٹر وزیر آغا اسی انداز کی عجیب و غریب مثالیں دیتے رہتے ہیں جو اگرچہ خوشنما الفاظ کا مرکب ہوتی ہیں لیکن ان کی اہمیت اسی بنا پر صفر ہوتی ہے کہ ان سے انشائیہ کا مسئلہ واضح ہونے کے برعکس مزید الجھ جاتا ہے۔ کسی صنف (یا کسی بھی چیز) کی تعریف جن لفظوں میں کی جائے وہ ایسے منطقی ہوں کہ تعریف پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہو جائے کہ تعریف کرنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور یہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے۔ یہ اس لئے لازم ہے کہ تعریف بھی دراصل ایک نوع کی دلیل ہوتی ہے۔ چند خصوصیات کی موجودگی اور پھر چند خصوصیات کی عدم موجودگی کی بنا پر تعریف کر کے تعریف کی جانے والی صنف (یا شے، یا فرد، یا تصور یا خیال، یا عمل) کو، دوسری سے ممیز کرتے ہیں اور وہی تعریف کامیاب سمجھی جائے گی جو اوصاف اور خصائص کی موجودگی اور عدم موجودگی کے کلیہ کو مدنظر رکھے گی۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی تعریف مکمل یا سالم یا ثابت نہیں ہو سکتی اور اس لیے مختلف النوع تعریفیں ہوتی رہتی ہیں لیکن ہر تعریف سے کم از کم اتنی توقع تو بے جا نہ ہوگی کہ وہ کم از کم یہ تو واضح کر دے کہ وہ کس چیز کی تعریف ہے۔ روزنامہ ''جنگ'' ۱۹۸۲ء میں انشائیہ کے بارے میں ایک مذاکرہ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ کی یہ تعریف کی:

> ''انشائیہ گویا جزیرہ کا پھول ہے اور یہ جزیرہ مواج سمندر کے اندر وہ نقطہ ہے جو اپنی جگہ پرسکون ہوتا ہے یہاں سے آپ مواج

سمندر کو دیکھ سکتے ہیں لیکن خود اس میں شامل نہیں ہوتے ۔ بیسویں
صدی ایک مؤاج صدی ہے۔ انشائیہ اس میں ایک ایسے جزیرہ کی
طرح ہے جہاں سے اس صدی کے پورے تلاطم کو دیکھا جاسکتا ہے۔''

یہ تعریف بے حد شاعرانہ ہے خوبصورت الفاظ کا مرکب ہے لیکن یہ تعریف منطقی نہیں کہ یہ اتنی بے مہار تعریف ہے کہ انشائیہ کے ''نقطہ'' کی جگہ کوئی بھی لفظ رکھ دینے سے یہ تعریف نہ صرف اس پر فٹ آئے گی بلکہ انشائیہ کے مقابلہ میں اس کی بہتر اور اچھی تعریف بھی نظر آئے گی مثلاً انشائیہ کی جگہ جدید شاعری، علامتی افسانہ، نثری نظم حتیٰ کہ مصوری بلکہ کسی مصور کی کسی مشہور تصویر (مثال: لیونارڈ دوا ونچی کی ''مونا لیزا'' گویا کی ''نیکڈ ماجا'' یا پکا سو کی ''گیرنیکا'') پر بھی اسی تعریف کو کامیابی سے لاگو کیا جاسکتا ہے یہی نہیں بلکہ اسی تعریف میں تو اتنے امکانات پوشیدہ ہیں کہ اسے کسی بھی مشہور شخصیت پر لاگو کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی یا خود ڈاکٹر وزیر آغا الغرض امکانات کے در وا ہوتے جا رہے ہیں چنانچہ ہم اسے کسی مجموعے کا فلیپ بھی بنا سکتے ہیں۔

اسی مذاکرہ میں ڈاکٹر صاحب نے اسی انداز کی ایک اور گول مول بات یوں کی ہے:

''......انشائیہ بھی کہتا ہے کہ دریا عبور کر کے دوسرے کنارے کو
دیکھا جائے اور پھر دوسرے کنارے سے پہلے کنارے پر ایک نظر ڈالی
جائے انشائیہ چیزوں کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے کا رویہ ہے''۔

ہمیں اپنی جہالت کا اعتراف کہ اپنا حال تو یہ ہے:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اسی انداز کی شاعرانہ مبہم اور غیر واضح (لہٰذا گمراہ کن) تعریفیں کرنے کا بے حد شوق ہے کہ وہ الفاظ اور انداز بدل بدل کر اس نوع کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں چنانچہ دریا والی اس مثال کو انھوں نے اپنے انشائیوں کے مجموعہ ''دوسرا کنارا'' کے پیش لفظ میں نہ صرف دہرایا بلکہ خصوصی انداز میں اس کی صراحت کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا:

''انشائیہ نگار بالکل یہی کرتا ہے وہ شے یا منظر کو سامنے سے
دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے۔ یوں اس کی
معنویت کو گرفت میں لے لیتا ہے جو ہمہ وقت ایک ہی مانوس زاویے
سے مسلسل دیکھنے کے باعث اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔''

دراصل ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں نئے زاویہ نگاہ کی تشکیل جسمانی حرکت اور پھر اس کے نتیجہ میں پیش نظر یا تناظر میں تبدیلی سے مشروط ہوکر رہ گئی ہے لیکن یہ تصور غیر تخلیقی ہے اور اسی لیے محدود بھی۔

جب ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک مضحکہ خیز تعریف پیش کر دی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈاکٹر انور سدید اس معاملہ میں پیچھے رہ جاتے چنانچہ انھوں نے بھی اپنی فطرت کے عین مطابق انشائیہ نگار کی یہ تعریف فرمائی:

''انشائیہ نگار اس انبوہ میں شریک ہے جو پگڈنڈی پر چلتے چلتے
کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے لیکن زہر خند یا ہنسی کو جنم دینے کی بجائے انشائیہ
نگار اسی کیچڑ سے اکتساب سرور کر رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو ایسی
شگفتہ باتیں بتا رہا ہے جو اسے مٹی کی سوندھی خوشبو سونگھنے،
زمین کے لمس سے آشنا ہونے اور کیچڑ کا ذائقہ چکھنے سے پہلے معلوم
نہیں تھا۔''

جو لوگ ادب اور ادیب کے نفسیاتی مطالعہ کے منکر ہیں انھیں ان منہ بولتی سطروں کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ کیسے لاشعور نے شخصیت کی کجی کی طرف انگلی اٹھا دی جس شخص نے تمام عمر شرفا پر کیچڑ اچھالی ہو اور خود اس میں لوٹ لگائی ہو وہی کیچڑ کی مثال دے کر اس سے ''اکتساب سرور'' کرتے ہوئے ''اپنے ساتھیوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا'' سکتا ہے۔ شاید اس لئے انشائیوں کی مانند ڈاکٹر انور سدید کی تمام تنقید بھی محض کیچڑ سے ''اکتساب سرور'' میں تبدیلی ہوگئی اور یوں ان کی بلند پایہ تنقیدی آرا محض ''ساتھیوں کو شگفتہ باتیں'' سنانے کی چیز بن کر رہ گئیں۔ **فاعتبرو یا اولی الابصار!**

علمی مباحث میں اس انداز کی Over Simplification بے حد نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور بالخصوص جب معاملہ اصناف، ان کی تعریفوں اور ان کے طریق کار کا ہو تو اس انداز کی گفتگو مسئلہ کو روشن کرنے کے برعکس دھند لکے میں اضافہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ جسم اور اس کی حرکت اور اس کے نتیجہ میں نگاہ کے تبدیل ہوتے زاویوں کو ان کی ظاہری حیثیت میں قبول کر لیتے ہیں اس لیے وہ سطح تک رہتے ہیں۔ ہم اس ضمن میں ان سے لمبی چوڑی فلسفیانہ بحثوں کی توقع نہیں رکھتے لیکن علمی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر قلم اٹھانے کے باعث ان سے اتنی سی صراحت کی توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ جو بات پہلے وہ خود اس کے بارے میں اپنے ذہن میں واضح ہوں اور پھر اپنے قارئین تک بھی اپنی بات کو پہنچا سکیں۔ انھوں نے انشائیہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا لیکن افسوس کہ ان کے تمام لکھے نے انشائیہ کی بحث کو مزید الجھا دیا جس کا ایک سبب ان کی عجیب وغریب تعریفیں بھی ہیں اگر معاملہ ہم جیسے فانی انسانوں کا ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا جو جی میں آئے کہو اور جس طرح چاہو تعریف کر لو، لیکن ڈاکٹر وزیر آغا خود کو انشائیہ کی صنف کے بانی اور اسی اصطلاح کے موجد اور خیر سے پاک و ہند میں انشائیہ نگاری کی تحریک کے سالار کارواں کہلاتے ہیں اس لیے ان کے قلم سے جب ایسی بلند پایہ تعریفوں کا اخراج ہو تو ان کا اسی بنا پر نوٹس لینا ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے قافلہ کی گمراہی کا تو سبب بنتے ہی ہیں کہ وہ میر کارواں ہیں اور ان کے ارشادات انشائیہ کے سوئے قافلہ کے لیے صدائے جرس کا کام کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ادب کے قارئین، طالب علموں اور ناقدین کے لئے بھی عمومی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کو "دوسرا کنارا" والی بات بہت پسند آئی ہے کیونکہ اپنے انشائیوں کے مجموعہ "دوسرا کنارا" میں بھی انھوں نے اسی انداز کی بات کی ہے:

> "انشائیہ "دوسرے کنارے" کو دیکھنے ہی کی ایک کاوش تو ہے۔ مراد محض یہ نہیں کہ آپ دریا کا پل عبور کر کے کنارے پر پہنچیں اور پھر اس سے لطف اندوز ہوں اپنی جگہ یہ بات بھی غلط نہیں مگر اصل

> بات یہ ہے کہ جب آپ دوسرے کنارے پر پہنچتے ہیں تو آپ کا ہر روز کا دیکھا بھالا "پہلا کنارا" دوسرا کنارہ بن کر آپ کے سامنے اُبھر آتا ہے۔"

اگر اس تعریف کی اتنی سی تحریف کر دی جائے کہ "دریا کا پل عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچیں" کہ ہدایت نظر انداز کر دی جائے اور انسان تیر کر دریا عبور کرے یا کشتی میں بیٹھ کر دریا عبور کرے یا ریل یا بس یا کار کے ذریعہ عبور کرے تو پھر دوسرے کنارے کا منظر کیسا لگے گا؟ ڈاکٹر وزیر آغا تو خیر سے علامتی شاعری بھی فرماتے ہیں وہ اس حقیقت کو کیوں فراموش کر گئے کہ افراد اشیاء، وقوعات، حوادث اور مظاہر کو نئے زاویے سے دیکھنے کے لئے کناروں پر کود پھاند کی ضرورت نہیں ہوتی کہ ہم اپنے وجود میں دونوں کنارے دیکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کی ندی کے ایک کنارے پر کھڑے دنیا کو دکھائی دیتے ہیں جبکہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ہم ذات کی ندی کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوں۔ اس کیفیت سے دوئی، بُعد یا فیصلہ کا جو احساس جنم لیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں نفسی کشمکش جس آشوبِ ذات کا موجب بنتی ہے وہ ادب کا عظیم ترین مطالعہ ہے کہ یہی انسان کا مطالعہ ہے۔ انسانی نفسیات سے آگہی رکھنے والا تخلیقی فن کار (اور اس کا انشائیہ نگار ہونا ضروری نہیں) اپنے تخلیقی وجدان سے اس کشمکش کے محرک بننے والے نفسی عوامل کی گرہ کشائی کرتا ہے لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کے لئے غالباً اتنی گہرائی میں جانا ممکن نہیں اس لیے وہ سطح تک رہتے ہوئے محض جغرافیائی انداز سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کی بات کرتے ہیں اور اگر اسی انداز پر بات کرنی ٹھہری تو پھر سڑک کے بھی تو دو کنارے ہوتے ہیں اسے بھی چھوڑیئے آپ کمرے میں الگ الگ دروازوں سے داخل ہوں تو فرنیچر کی ترتیب کے زاویوں میں تبدیلی کے باعث کمرہ کا منظر تبدیل ہو جاتا ہے لہٰذا یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ انشائیہ نگار ایک دروازہ سے کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا کے الفاظ میں "سامنے سے دیکھنے کے بجائے عقب سے اس پر ایک نظر ڈالتا ہے"...... اور کھٹ سے انشائیہ تیار کر لیتا ہے۔ الغرض اس

انداز کی مثالیں وضع کرنی مشکل نہیں لہٰذا مثالیں وضع کرتے جاؤ اور انھیں انشائیہ پر چسپاں کرتے جاؤ اور اس امید کے ساتھ کہ اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔ ویسے ڈاکٹر وزیر آغا کی ان تعریفوں کے بارے میں گفتگو کرنے والا میں پہلا گناہگار نہیں کیونکہ مجھ سے پہلے محمد ارشاد بھی اپنے مقالہ ''موٹتین، انشائیہ اور انشائیہ نگار'' میں ڈاکٹر صاحب کی تعریف کا تجزیاتی مطالعہ کر چکے ہیں:

''وزیر آغا جنھیں اردو انشائیہ کا مزاج شناس خیال کیا جاتا ہے اس کی پیش کردہ تعریف نمونے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے وہ انشائیہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں 'انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ اشیا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طرح گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ ''تعریف'' محض شاعرانہ انداز بیان ہے اسے تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے الفاظ سے مفہوم بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی مسمریزم کی تعریف (Eulogy) کر رہے ہیں یا پھر کسی شعبدہ بازی اور یا خواب نامہ یوسفی یا تحلیل نفسی کے مطابق خوابوں کی تعبیر کرنے والے یا پھر خواب دیکھنے والے کو۔ یہ تعریف دیگر خامیوں سے قطع نظر مبہم الفاظ پر مبنی ہے۔ تعریف کے منطقی قواعد میں ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ تعریف مبہم، پیچیدہ اور مترادف الفاظ میں نہیں ہونی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ یہاں حدِ زیرِ تعریف (انشائیہ) ہی واضح نہیں ہے جس کی تعریف کی جا رہی ہے تو انشائیہ نگار کا لفظ کیوں کر واضح خیال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرنا، اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کچھ اس طرح (گرفت میں

لینا) انسانی شعور (انشائیہ نگار کا یا قاری کا) اپنے مدار سے ایک قدم باہر آنا ایک نئے مدار کو وجود میں لانا، مبہم اور پیچیدہ الفاظ ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بیان جدید علامتی افسانے اور ناول اور اینٹی ناول اور وجودیاتی تنقید اور تحلیل نفسی کے ماہرین کی معالجاتی رپورٹوں کے بارے میں بھی بغیر کسی تردّد اور تامل کے درست ثابت کیا جا سکتا ہے۔''

ڈاکٹر وزیر آغا کے بعد نظیر صدیقی اور محمد حسنین کی آراء کا مطالبہ کریں تو وہاں بھی کچھ اسی قسم کا انداز کارفرما نظر آتا ہے۔ نظیر صدیقی کی ''شہرت کی خاطر'' کے دیباچہ میں سے جو اقتباس دیا گیا اس میں سے طوالت سے بچنے کے لئے جو جملے حذف کر دیئے گئے تھے وہ بھی یہاں درج کئے جاتے ہیں ان کے بموجب انشائیہ:

''وہ ادبی صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ، یعنی بالفاظِ غالب لکھنے والے کی بے خودی میں ہوشیاری اور ہوشیاری میں خودی پائی جاتی ہے۔ یہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور کہیں جھوٹ میں سچ کی۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسرے کی پگڑی اچھالی جاتی بلکہ اپنی پگڑی اور دوسرے کا نام بھی۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں لکھنے والا صرف دوسروں کی کمزوریوں پر نہیں ہنستا بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسرے کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ وہ صنفِ ادب ہے جس میں تفریح اور تنقید ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہیں اور بصیرت اور ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں......''

جیسا کہ گزشتہ سطروں میں لکھا گیا نظیر صدیقی Paradox کے ذریعہ خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ خود انشائیہ میں نہ تو اس نوع کے تضادات کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور نہ ہی انشائیہ کے اسلوب کا رنگ ان سے چوکھا ہوتا ہے۔ اس طرح انشائیہ

اگر انشائیہ نگار کی شخصیت کا ترجمان اور اس کے منفرد زاویہ نگاہ کا عکاس ہے تو پھر اس نوع کی ''نیمے دروں نیمے بروں'' قسم کی تعریفوں سے اس کے خصوصی ذائقہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی پھر یہاں بھی وہی بات نظر آتی ہے جو ڈاکٹر وزیر آغا کی تعریفوں میں بنیادی خامی تھی یعنی اسے دوسری اصناف یا اشیاء پر بھی منطبق کیا جا سکتا ہے مثلاً طنز و مزاح اور پیروڈی کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے بلکہ نظیر صدیقی کی یہ سطری تو انشائیہ کے برعکس انور سدید کی تنقید پر بلیغ تبصرہ معلوم ہوتی ہیں:

''......نہ صرف اپنا نام اور دوسرے کی پگڑی اچھالی جاتی ہے
بلکہ اپنی پگڑی اور دوسرے کا نام بھی۔''

اسی طرح جب ہم یہ پڑھتے ہیں تو پطرس کے مزاح کا بنیادی وصف ذہن میں آ جاتا ہے:

''......لکھنے والا صرف دوسروں کی کمزوریوں پر نہیں ہنستا بلکہ
اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔''

ویسے میرا خیال ہے کہ یہ سطریں لکھتے وقت نظیر صدیقی کے تحت الشعور میں ان کا اپنا انشائیہ ''شہرت کی تلاش'' ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نوع کی اقدار میں اسلوب کی خوبصورتی کے باوجود بات قطعی اور دوٹوک نہیں کی جاتی جس کے نتیجہ میں ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے چنانچہ محمد حسنین جب انشائیہ کو ادب کی ایسی ''کمین گاہ'' قرار دیتے ہیں جہاں قلمکار جس پر چاہے تیر چلا سکتا ہے ''تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا انشائیہ نگار ایک حساس ادیب اور سنجیدہ مزاج قلمکار ہونے کے برعکس 007 ہے، جیمز بانڈ ہے جسے ہر مجسٹی کی سیکرٹ سروس نے "License to kill" دے رکھا ہے کیونکہ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ انشائیہ نگار کو سات نہیں سیکڑوں خون معاف ہیں''۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ استعارے کے ذریعہ سے بات سمجھائی جا رہی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ استعارہ میں مفہوم کی گریز پائی ہی اسے علمی تعریف کے لئے ناموزوں بنا دیتی ہے۔ میں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیق اور ڈاکٹر محمد حسنین یا دیگر حضرات نے انشائیہ کے علمی پہلوؤں کو اجاگر کرنے یا اس کی تنقیدی اساس استوار کرنے کے لئے جو مساعی کی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس طرح ان حضرات

کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس انداز کی شاعرانہ استعاراتی اور ڈھیلی ڈھالی تعریفوں کے باعث ہی انشائیہ کی بحث ایسی الجھی کہ اب تو انشائیہ لنڈے کا کوٹ محسوس ہونے لگا ہے جو نااہل ادیبوں کی ادبی ستر پوشی کے کام آ رہا ہے۔

مشکور حسین یاد نے انشائیہ کی تکنیک اور اس سے وابستہ تنقیدی مباحث کو ''ممکنات انشائیہ'' میں سمیٹا ہے جو اس بنا پر اور بھی قابلِ توجہ ہے کہ اردو کی حد تک یہ انشائیہ پر پہلی باضابطہ تالیف ہے اور اس لحاظ سے علمی حلقوں میں اس کی اچھی پذیرائی بھی ہوئی۔ مشکور حسین یاد نے ایک کام یہ کیا کہ کتاب کی تحریر میں انشائیہ کا اسلوب کارفرما رکھا اور یوں ہلکے پھلکے انداز میں نئی بات کہی ہے۔ مشکور حسین یاد انشائیہ کو ام الاصناف سمجھتا ہے اگرچہ یہ تصور نزاعی ہے لیکن اس طرح سے مشکور حسین یاد نے انشائیہ کو شخصی انشائیہ کو ذرا سی آبجو میں بند کرنے کی بجائے اسے محیط بے کراں بنا دیا کیونکہ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی قایل ہیں:۔

''میں صنفِ انشائیہ کو ادب کی امکانی صنف کا نام بھی دیا کرتا
ہوں، میرے خیال میں آئندہ بھی اگر کوئی نئی صنفِ ادب وجود میں
آئی تو وہ انشائیہ کے بطن ہی سے وجود میں آئے گی''

شاید بعض اصحاب کے لئے یہ بھی متنازعہ فیہ ہو لیکن یہ بات کہنے کے لئے جس جرأت کی ضرورت ہوتی ہے اس کا کریڈٹ تو مشکور حسین یاد کو ملنا ہی چاہئے۔

بات ہو رہی تھی انشائیہ کی تعریف کی تو اس ضمن میں بھی مشکور نے اچھی بات کہی ہے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ انشائیہ جس قدر آسانی سے آنے والی چیز
ہے یہ اسی قدر طرح طرح کی تعریفوں کے باعث الجھ کر رکھ گیا ہے
''......انشائیہ تو سرتاسر ایک تخلیقی سرگرمی ہے اور یہی اس کی
سچی اور حقیقی تعریف بھی کہی جا سکتی ہے۔''

لیکن اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ برقرار ہے کہ ''تخلیقی سرگرمی'' کے بغیر تو کسی طرح کی بھی تخلیق ممکن نہیں پھر وہ انشائیہ سے ہی کیوں مشروط رہے؟

غلام جیلانی اصغر اچھے انشائیہ نگار ہیں لیکن جب انشائیہ پر لکھنے بیٹھے تو انھوں نے بھی اسی استعاراتی انداز میں بات کی چنانچہ اپنے مضمون ''انشائیہ کیا ہے؟'' میں فرماتے ہیں:

''انشائیہ (ایسے) سے اتنا ہی مختلف ہے جتنی کہ حالی کی مسدّس انیس کے مرثیہ سے۔ حالانکہ ہیئت کے لحاظ سے دونوں ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ انشائیہ میرے نزدیک ایک ایسی ادبی تحریر ہے جو اپنے انداز سے پہچانی جاتی ہے۔ جگر نے انشائیہ کے بارے میں ایک عمدہ شعر کہا ہے:

حُسن وہی ہے حسن وہ ظالم ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

اگر سارا انشائیہ آپ کی گرفت میں آجائے تو یہ اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔ انشائیہ میں گریز کی کیفیت ہوتی ہے آپ جب ایک سرے سے اسے پکڑنا چاہتے ہیں تو دوسرا سرا آپ کی انگلیوں سے پھسل جاتا ہے۔''

انشائیہ اور ایسے میں جو امتیاز کیا گیا ہے وہ غالباً اس لیے کہ غلام جیلانی اصغر مزاج اور ذائقہ کے لحاظ سے انگریزی ایسے اور انشائیہ کو جداگانہ سمجھتے ہیں اس حد تک کہ ہیئت اور تدبیر کاری میں مماثلت کے باوجود بھی وہ ان دونوں کو جداگانہ تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور جس منطقی مغالطہ پر استوار ہے اگر اسے دیگر اصناف ادب پر بھی منطبق کیا جائے تو افسانہ اور شارٹ اسٹوری، خاکہ اور اسکیچ، سفرنامہ اور ٹریولوگ وغیرہ سب دوئی کے شکار نظر آئیں گے۔ ادبیات کا ایک سیدھا سا اصول ہے ایسا اصول جس کی کارفرمائی عالمی سطح پر بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ اصناف کی تکنیک، اصول اور تدبیر کاری وغیرہ بھی سب کچھ مستعار ہوتا ہے لیکن تخلیق کار اپنی دھرتی کی خوشبو سے اسے اپنا لیتے ہیں۔ شعور عصر سے اسے اپنی زندگی کا استعارہ بنایا جاتا ہے اور پھر یوں معرضِ وجود میں آنے والی تخلیق روحِ عصر کا آئینہ بنتی ہے۔ اگر انشائیہ محض ایسے کا چربہ رہتا تو اس نے ایک صدی کا تخلیقی سفر طے نہ کیا ہوتا۔ اتنی طویل مدت گزار لینے کا یہی مطلب ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہماری ذہنی زندگی کی بعض ضروریات کی تکمیل ہوتی رہی ہے۔ اور پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ مسدّس مسدّس ہی رہتی اگر حالی

اور انیس نے اسے مختلف موضوعات کے لئے استعمال کیا ہے تو یہ امر اضافی ہے اساسی نہیں!

غلام جیلانی اصغر صاحب ''اوراق'' میں چھپنے کے باوجود اچھے انشائیہ نگار ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ انشائیہ کی معنویت کو بند مٹھی کی ریت بنانے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں اگر ان کے ذہن میں تجریدی انشائیہ کا کوئی مخصوص تصور ہے تو اور بات ہے لیکن اگر وہ مروج انشائیہ ہی کی بات کر رہے ہیں تو نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں غلام جیلانی اصغر سمیت باقی حضرات کے انشائیہ بھی سمجھ میں آتے ہیں بلکہ اکثر انشائیے تو محدود بلکہ Myopic مشاہدہ اور روکھے پھیکے اسلوب کی بنا پر اتنے روکھے پھیکے ہوتے ہیں کہ انھیں رعایتی نمبر دے کر پاس کرنا پڑتا ہے مثلاً اگر ڈاکٹر وزیر آغا کا سارا انشائیہ گرفت میں آجاتا ہے تو غلام جیلانی اصغر کے استدلال کی رو سے یہ اس کی ''ناکامی کی دلیل'' ٹھہرے گی جبکہ میں ایسا سمجھنے کو تیار نہیں۔ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے!

یہ جو انشائیہ کے بارے میں اتنا خلط مبحث ہے تو اس کی ایک وجہ اسی انداز کی تعریفیں بھی بنتی ہیں اور جیسا کہ ابتداء میں لکھا گیا انشائیہ کی اس نوع کی تعریفیں بالعموم انشائیہ نگاروں نے کر رکھی ہیں اور یہ بالعموم ایسی ایسی تعریفیں ہیں جو ان کے اپنے انشائیوں کا جواز بنتی ہیں اس لئے شاعرانہ اسلوب اور استعاراتی پیرایہ سے بچ کر سیدھی سادی نثر میں اگر انشائیہ کی تعریف مقصود ہو تو پھر میرے خیال میں ''بیدار ذہن کے حامل تخلیقی شخصیت کی زندگی کے تنوع سے زندہ دلچسپی کے بامزا نثر میں مختصر اور لطیف اظہار کو انشائیہ قرار دیا جاسکتا ہے!''

اس تعریف میں بیدار ذہن اور تخلیقی شخصیت انشائیہ نگار کی ہے، زندگی کا تنوع موضوعات کی کثرت کا ضامن ہے۔ زندہ دلچسپی نظر کی تازہ کاری کی مظہر ہے، بامزا نثر انشائیہ کے اسلوب کا وصفِ خاص ہے اور لطیف اظہار نزاکتِ بیان سے وابستہ ہے۔ اگر مزید گہرائی میں جایئے تو ذہن انشائیہ نگار کی تعلیم، مطالعہ اور استدلال سے عبارت ہے جبکہ اس کے تمام نفسیاتی کوائف کے مجموعہ کا نام شخصیت ہے۔ اس لئے اگر ذہن بیدار ہو اور شخصیت تخلیقی ہو تو یقیناً انشائیہ کے لئے ''یہ مٹی بڑی زرخیز ہے''۔ دیگر تعریفوں کے مانند

شاید یہ تعریف بھی جزوی صداقت کی حامل ثابت ہو لیکن یہ اس بناء پر قابل توجہ ہے کہ ایک تو بات سمجھ میں آجاتی ہے اور جو بات سمجھ میں آتی ہے وہی کہی گئی ہے۔ اس لئے اس کی ایک سے زائد تشریحات یا توجیہات نہیں ہو سکتیں لہٰذا کثرتِ تعبیر کی بھول بھلیاں میں معنی کی ڈور کا سرا گم نہیں ہو جاتا اور پھر انشائیہ کے ضمن میں زاویہ نگاہ، اختصار، اسلوب اور حسن بیان جن پر بالعموم زور دیا جاتا ہے تو وہ سب اس تعریف میں آجاتے ہیں اور پھر اس تعریف کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نہ تو ٹانگوں میں سے جھک کر دیکھنا پڑتا ہے، نہ عقب میں دیکھنا پڑتا ہے اور نہ ہی سر کے بل کھڑے ہونے کی ضرورت ہیا ورنہ ہی کیچڑ میں لوٹ لگانی پڑے گی۔

□□□

مشکور حسین یاد

انشائیہ بطور ایک اصلاح ادب

مجھے اپنے اس مختصر سے مضمون میں یہ نہیں بتانا کہ انشائیہ کا لفظ سب سے پہلے کب ظہور میں آیا۔ اسے کس نے عربی کے لفظ انشا سے انشائیہ کی صورت بخشی، محمد حسین آزاد یا مہدی افادی نے سب سے پہلی اپنی تحریر میں استعمال کیا یا ''ترنگ'' کا دیباچہ لکھتے وقت 1940ء میں اختر اور ینوی نے اسے خاص معنی میں برتا، ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ قیام پاکستان کے بعد 1957ء تک اُردو میں اس لفظ نے انگریزی کے لفظ ایسے کی جگہ استعمال ہونے کا رواج نہیں پایا تھا۔

انشائیہ کو ''ایسے'' کے لئے 1958-59ء ہی میں مختص کیا گیا۔ بہرحال انشائیہ کے لفظ کی اس طرح تحقیق کرنا میرا کام نہیں یہ کسی محقق کے لئے چھوڑتا ہوں۔

میں تو صرف یہاں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم اُردو والوں نے جو لفظ انشائیہ ''ایسے'' کی جگہ استعمال کرنا شروع کیا ہے اپنے معنی کے اعتبار سے ''ایسے'' کے لفظ سے کہیں زیادہ مناسب اور موزوں ہے بلکہ سچ پوچھئے تو مناسب اور موزوں کے الفاظ بھی انشائیہ کی وسعت اور ہمہ گیری کو واضح نہیں کرتے۔ ''ایسے'' کے معنی تو محض کوشش کرنے یا قدم اٹھانے کے ہیں اور یہ معنی کسی طرح بھی ان معنی کے عمق اور افق کا احساس نہیں دلاتے جو لفظ انشائیہ کے معنی میں پوشیدہ ہیں۔

یہ درست ہے کہ جب کوئی لفظ ایک اصطلاح کی صورت اختیار کرتا ہے تو اپنے معنی میں محدود ہو جاتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لفظ ایک اصطلاح بن جانے کے بعد بھی اپنے اصل معنی یعنی لغوی معنی سے اصطلاحی حوالے کے ساتھ بالکل قطع تعلق نہیں کر لیتا بلکہ سچ پوچھئے تو اس کے لغوی معنی ہی کے باعث اس کے اصطلاحی معنی

پر صحیح طور پر روشنی پڑتی ہے۔ اصطلاح تو محض اس لفظ کے ظاہر کو محدود کرتی ہے۔ لفظ کے باطن کی وسعت اور گہرائی جوں کی توں رہتی ہے، لہٰذا کسی لفظ کو اصطلاح بنانے سے پہلے اس کے اصل معنی کو پیش نظر رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس بات کو دوسری طرح سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر کسی لفظ کا بطور اصطلاح تجزیہ کرنا مقصود ہو تو ہمیں پہلے اس لفظ کے اصل معنی پر غور کرنا چاہئے تاکہ ہم یہ پتہ لگاسکیں کہ اس لفظ کو اصطلاح کا رتبہ دینے سے قبل کہاں تک دقت نظر سے کام لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ غزل کو لیجئے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ غزال سے نکلا ہے اور اس کے لغوی معنی ہرن کی اس درد بھری آواز کے ہیں جو اس کے منہ سے اس وقت نکلتی ہے جب شکاری کتے اسے شکار کے لئے دبوچ لیتے ہیں۔ غزل کے ان لغوی معنی کو سامنے رکھ کر جب ہم غزل کے اصطلاحی معنی پر غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس صنف سخن کے لئے یہ لفظ نہایت سوچ سمجھ کر منتخب کیا گیا ہے۔ غزل کے لغوی معنی میں غزل کے اصطلاحی معنی کی روح پوشیدہ ہے اور جس چیز کو ہم تغزل کہتے ہیں وہ اس لفظ کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ جیسے ہی غزل کا لفظ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو جہاں ہرن ایسا خوصورت جانور صحرا کی وسعتوں میں قلانچیں بھرتا دکھائی دیتا ہے وہاں ہمیں اس کی گردن پر چھری چلتی بھی دکھائی دیتی ہے۔ گویا ہمیں بیک وقت زندگی کی رعنائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور اس کے درد و کرب کی شدت کا بھی۔ بس یوں سمجھئے ہم غزل کے لفظ کو کیا دیکھتے ہیں۔ تغزل کے جملہ مفاہیم مجسم ہو کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

فرانسیسی ادیب مون تین کو ہم اس بات کی داد تو ضرور دیں گے کہ اس نے سب سے پہلے 1571ء میں ایسے کا لفظ ایک ادبی اصطلاح کے طور پر پوری دنیائے ادب کو دیا، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کہ بطور اصطلاح یہ لفظ اپنا مفہوم بطریق احسن ادا نہیں کرتا اور اس کی اولین وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس لفظ کے لغوی معنی اس وسعت اور گہرائی کے حامل نہیں ہیں جن کا تقاضا اس کے اصطلاحی معنی کرتے ہیں، لیکن یہاں ہم لفظ ایسے کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ مونتین نے ادب کے سرچشمہ کو محسوس تو کرلیا لیکن وہ پوری طرح اس کی وسعتوں اور گہرائیوں کا احساس نہ کرسکا۔ اگر مونتین کو یہ بھی احساس ہو جاتا کہ جس طریق اظہار کو اس نے ایسے کا نام دیا ہے وہ محض ایک صنف ادب

نہیں بلکہ ادب کے اظہار کا منبع و مصدر اور سرچشمہ ہے تو مجھے یقین ہے وہ اس کا نام ایسے ہرگز نہ رکھتا۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں اور آپ جانتے بھی ہیں ایسے کے معنی کوشش، سعی یا اقدام کے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے یہ معنی انسان کے اس بے ساختہ فطری اور تخلیقی ادبی اظہار کی روانی کا ساتھ کہاں دے رہے ہیں جو اس طریق اظہار کی جان ہے، اس لئے میرا کہنا یہ ہے کہ لفظ انشائیہ فرانسیسی زبان کے لفظ ایسے سے کہیں زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ انشائیہ میں تو تخلیقی کیفیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ میرا مطلب ہے انشائیہ کا لفظ تو بنا ہی انشا سے ہے جس کے معنی تخلیق کرنے کے ہیں۔ دوسری طرف ایسے کے لغوی معنی کوشش یا اقدام کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں اس خلاقانہ فطری بہاؤ کا دور دور بھی نشان نظر نہیں آتا، جس فطری بہاؤ کو ایک انشائیہ یا ایسے کی بنیادی خصوصیت کہا جاتا ہے۔ کوشش یا قدام میں تو ارادہ کا دخل ہوتا ہے یعنی جب تک انسان ارادہ نہ کرے اس کے کسی عمل کو کوشش کا نام نہیں دیا جاسکتا اور جو کام اس سے ازخود سرزد ہوتے ہیں وہ کوشش کے زمرے میں شامل نہیں کئے جاسکتے۔ ادھر ادب کے جس طریق اظہار کو ایسے کہا جاتا ہے وہ ہر تخلیقی عمل کی طرح ارادہ سے زیادہ عمل کا متقاضی ہے گویا کوشش میں جو تکلف شامل ہوتا ہے وہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میرے اس کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ کسی کوشش کے بغیر وجود میں آجاتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ انشائیہ کو یا اس کی تخلیق کو کوشش کا نام دینا مناسب نہیں اگر انشائیہ کو محض ایک کوشش کا درجہ دیتے ہیں (جیسا کہ ایسے کے لفظ سے ظاہر ہے) تو ہمارے لئے اس کے تخلیقی عمل کی صحیح تعریف کرنا ممکن نہیں رہتا۔ تخلیقی عمل کے لئے بے تکلفی بے حد ضروری ہے اور کوشش خود کتنی بھی آزادی سے کی جائے اس میں تکلف کسی نہ کسی طور در آتا ہے۔ کہا جاتا ہے مونتین نے انکسار کے طور پر اپنی اس ادبی کاوش کو ایسے کا نام دیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو، لیکن یہاں میں پھر یہی گذارش کروں گا کہ اگر مونتین نے انکسار میں آکر یہ نام رکھ لیا تھا تو انکسار کا تعلق محض انکسار کرنے والے کی ذات سے ہوتا ہے۔ ایک ادبی اصطلاح کو وضع کرتے وقت اگر اس کو وضع کرنے والا فقط اپنی ذاتی چیز سمجھتا ہے اس حد تک تو ہم اس نام کو درست سمجھ سکتے ہیں، لیکن اگر یہ اصطلاح عام ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں اس کے لغوی اور اصطلاحی معنیٰ کو پس منظر میں رکھ کر گفتگو کرنے کا پورا پورا حق

حاصل ہے۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جیسا کہ آپ جانتے ہیں ایسے کا لفظ فرانسیسی زبان میں عربی سے لیا گیا ہے۔ عربی میں سعی کوشش کو کہتے ہیں اور اس میں ''ال'' لگا کر یعنی ''السعی'' کہہ کر اس کوشش کو خاص کوشش کے معنی دیئے گئے ہیں۔ گویا ایسے کے معنی خاص کوشش کے ہوئے۔ اس طرح غور کیا جائے تو کوشش کو خاص کوشش کہہ کر اسے معنوی اعتبار سے عام کوشش سے جدا کر دیا گیا ہے اور یوں جیسا کہ سطور بالا میں بیان ہوا ہے یہ کوشش سپاٹ اور بے کیف نہیں رہ جاتی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوشش کو خاص کہہ کر اس میں ادبی رنگ پیدا کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ کوشش عام کوشش نہیں ہے، بلکہ ایک ادیب کی کوشش ہے۔ میں سمجھتا ہوں ایسے کے لفظ کو بطور اصطلاح اپنانے کے حق میں جو سب سے بڑی بات کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ ادیب کی کوشش صرف فرانسیسی ادیب مون تین کی کوشش نہیں بلکہ تمام ادیبوں کی کوشش ہے اور یوں جہاں اس لفظ میں ایک وسعت پیدا ہوتی ہے وہاں انکسار کی شمولیت بھی محض کسی ایک ادیب کا انکسار کہلانے کی حد کو پھلانگ جاتی ہے۔ تخلیقی ادب کے لئے ادیب کا منکسر المزاج ہونا ازبس ضروری ہے۔ انکسار خصوصیت کے ساتھ ایک ادیب کا انکسار اس کی خلاقانہ صلاحیتوں ہی کا آئینہ دار نہیں ہوتا، اس کے تخلیقی امکانات کا بھی پتہ دیتا ہے۔ میں لفظ ایسے کے حق میں بطور اصطلاح اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اس لفظ کی ان جملہ خوبیوں کے باوجود میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ انشائیہ کا لفظ ایسے کے لفظ سے پھر بھی زیادہ واضح المطالب ہے اور کوشش کو خاص کوشش کہنے کے باوصف ہم اس میں سے انسانی ارادہ کو خارج نہیں کر سکتے۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ انشائیہ کے لفظ میں جو ایک تخلیقی اضطرار کی کیفیت پائی جاتی ہے وہ ہمیں ایسے کے لفظ میں پھر بھی نظر نہیں آتی۔ انشائیہ کا لفظ تو ہمیں براہ راست تخلیقی اضطرار کا احساس دلاتا ہے اور بڑے بھرپور انداز میں دلاتا ہے، چنانچہ اگر آپ میری ان چند معروضات کی روشنی میں لفظ انشائیہ پر بطور اصطلاح ادب غور فرمائیں گے تو یقیناً ہمارے اس اردو کے لفظ کو فرانسیسی اور انگریزی کے ایسے کے لفظ سے بہتر پائیں گے۔

□□□

عرش صدیقی

انشائیہ کا مسئلہ

''اوراق'' کے افسانہ و انشائیہ نمبر میں غلام جیلانی اصغر اور سلیم اختر کے مضامین اور ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی آراء سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ''انشائیہ'' کی اصطلاح کو اُردو میں تسلیم تو کر لیا گیا ہے لیکن اس کے معانی اور اس کی حدود کے بارے میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بیشتر اہل قلم انشائیہ کو۔ Essay کا مترادف مانتے ہیں۔ لیکن غلام جیلانی اصغر کے خیال میں ''انشائیہ'' ایسے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنی کہ حالی کی مسدّس انیس کے مرثیے سے —— وہ مزید کہتے ہیں!

ہمارے یہاں 'اکثر لکھنے والوں کا یہی خیال ہے کہ جو تحریر کسی خاص فریم ورک میں صحیح نہ بیٹھ سکے اُسے انشائیہ کہہ دو۔ نظیر صدیقی کی کتاب ''شہرت کی خاطر'' ایسی ہی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ''نظیر صدیقی کی تحریریں انشائیہ کے اس مخصوص پیکر اور مزاج کے قریب نہیں آتیں جو A.P.Herbert,Chesterton,Lynd اور اُردو میں وزیر آغا، مشتاق قمر، جمیل آذر ایک دو نوجوان انشائیہ نگاروں کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔''

اسی طرح سلیم اختر کہتے ہیں کہ ''انشائیہ کو بالعموم مضمون سے خلط ملط کرتے ہوئے مزاحیہ، طنزیہ یا پھر تاثراتی مضمون قسم کی شے سمجھ لیا جاتا ہے جو کہ قطعی غلط ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔

''انشائیہ کے بارے میں یہ عمومی غلط فہمی ملتی ہے کہ یہ کوئی باضابطہ صنف نہیں اور یہ مضمون اور اس کی جملہ اقسام کا مترادف ہے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ مضمون اور اس کی دیگر اقسام سے

انشائیہ کے مقاصد اور تکنیکی لوازم قطعی طور سے ممتاز اور منفرد ہیں"۔

اس بات سے تو اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جس تحریر کو انشائیہ کا نام دے کر اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مختلف اقسام کے مضمونوں سے ایک الگ، منفرد اور مختلف چیز ہے اور اس سے بھی پورا اتفاق ہے کہ اس قسم کے انشائیے میں جس داخلی رنگ، شگفتگی، آزادہ روی اور خوشگوار غیر سنجیدگی وغیرہ کی نشان دہی کی جاتی ہے وہ اس قسم سے خاص ہیں لیکن اہم اور بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ زیادہ اہل قلم نے انشائیہ کو کن معنوں میں قبول کیا ہے

اگر صرف تعداد ہی پر انحصار کیا جائے تو فیصلہ اوراق کے اس شمارے کے مضمون نگاروں کے خلاف جاتا ہے کیوں کہ زیادہ تر انشائیہ کو Essay کا مترادف ہی مانا گیا ہے۔ احتشام حسین، نیاز فتحپوری، نظیر صدیقی، عبدالماجد دریابادی، اختر علی تلہری، عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، مشکور حسین یاد، سید شاہ، احمد سعید ہمدانی، آدم شیخ وغیرہ کا یہی خیال ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ بیس برس پہلے ادب لطیف میں انشائیہ کے بارے میں کیا کچھ کہا گیا تھا لیکن یہ بات تاریخ کا حصہ بن گئی ہے کہ ایک خاص قسم کی نثری تحریروں کے لئے جو ان دنوں زیر بحث آئیں ڈاکٹر وزیر آغا کی دی ہوئی اصطلاح۔ "انشائیہ" قبول کر لی گئی جو واقعی ایک اچھی اصطلاح ہے۔

ممکن ہے بعض اہل قلم اپنے طور پر مطمئن ہوں اور سمجھتے ہوں کہ انشائیہ کی اصطلاح کے معنی متعین ہو چکے ہیں لیکن میں ابھی تک اسے ایک مسئلہ سمجھتا ہوں جس کا فیصلہ باقی ہے۔

سوال یہ ہے کہ انشائیہ کی اصطلاح کو ان محدود سے معنوں میں استعمال کرنے کا کیا جواز ہے، جن معنوں میں اسے غلام جیلانی اصغر اور سلیم اختر نے استعمال کیا ہے اور آخر کیوں نہ اس اصطلاح کو ایک عمومی اصطلاح کے طور پر قبول کیا جائے۔ ان دونوں دوستوں نے بجا طور پر تسلیم کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ انشائیہ جیسا بھی ہے مغرب کی چیز ہے یعنی ہم نے اسے درآمد کیا ہے (یاد رہے کہ ہم نے غزل بھی درآمد کی تھی) یہ حقیقت تسلیم کر لینے کے بعد اس امر پر زور دینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ہمیں مغرب ہی سے اس اصطلاح اور اس کی حدود کے بارے میں کچھ راہ نمائی حاصل کرنا چاہئے۔ تسلیم کہ لفظ ایسے Essay ابتدا ان

معنوں میں استعمال نہیں ہوتا تھا جن میں آج ہو رہا ہے۔ حدود کا سکڑنے یا پھیلنے کا عمل تو غزل میں بھی ہوا ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ اُس قسم کی تحریر میں جنہیں مونٹین نے ایسّے کا نام دیا پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں ملتی تھیں۔ یہ بات صرف کسی حد تک ہی درست ہے ورنہ پہلے زیادہ تحریریں عموماً ٹھوس علمی معلوماتی اور خشک ہوتی تھیں جن میں اسلوب سے زیادہ علمیت کا اظہار اور معلومات کی فراہمی اہم ہوتی تھی۔ بیکن نے جس طرح اس صنف کو استعمال کیا دراصل اُسی استعمال نے Essay کی اصطلاح کے جدید معانی اور حدود کا تعین کر دیا۔ چنانچہ میں بعض نقادوں کی یہ رائے تسلیم نہیں کروں گا کہ Essay صرف Light ہلکا پھلکا ادب پیش کرنے کا ذریعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب انگریزی میں بھی Treatise قسم کے الفاظ متروک ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ بھی Essay نے لے لی ہے۔ Article کی اصطلاح رائج ضرور ہے لیکن Essay کا استعمال بہر حال زیادہ ہے۔ آج Essay میں افسانہ اور ناول اور ڈرامہ وغیرہ قسم کی اصناف کو چھوڑ کر باقی تقریباً سبھی تحریریں شامل ہیں۔ اس کا ثبوت آسانی سے Essays کی کوئی بھی کتاب دیکھ لینے سے مل جاتا ہے۔ Essay کو ایک عمومی اصطلاح کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور مختلف قسم کے Essays کی خانہ بندی کے لئے Essay کے ساتھ کوئی اور ایسا لفظ ملا کر ایک مرکب اصطلاح وضع کر لی گئی جو کسی خاص قسم کی بنیادی صفت کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ اس سے زیادہ کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ ان اصناف کی مکمل علیٰحدگی اور مکمل خانہ بندی ممکن نہ تھی۔ ہر صنف بالآخر کسی دوسری اصناف سے ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بارہا شاعری اور نثر کا فرق بھی ختم نہیں تو کم ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ انگریزی میں درج ذیل اصطلاحات کا استعمال فطری اور درست ہے اور ہماری راہ نمائی بھی صحیح سمت میں کرتا ہے۔

Socitical Essay, Refelctive Essay, Humorous Essay, Light Essay, Satirical Essay, Personal Essay (informal Essay), Narrative Essay, Descriptive Essay.

میں جاننا چاہوں گا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ آج Essay کی اصطلاح ہر قسم کے سنجیدہ اور ٹھوس مضامین کے لئے بھی استعمال نہیں ہو رہی۔ اگر کوئی مصنف کوئی ایسی نثری تحریر لکھنے میں کامیاب

ہو جاتا ہے جو Essay کی ذیل میں تو آتی ہے لیکن اس کے لئے امتیازی اصطلاح موجود نہیں تو اسی انداز پر نئی اصطلاح وضع کرنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری ہوگا۔ جب تک کہ اس کے لئے کوئی بالکل نیا نام استعمال کرنے کا لغت اور محاورے سے مکمل جواز نہ مل جائے۔

انشائیے کی اصطلاح کو کچھ دوستوں نے اس Informal Essay کے لئے جسے Personal Essay کہا گیا ہے استعمال کرنے پر اصرار کیا ہے لیکن ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے کہ آخر انشائیہ کو Essay کا مترادف سمجھنے میں کیا قباحت ہے جب کہ لغت اور محاورہ بھی اس کی سفارش کرتے ہیں۔ یہ بحث پرانی ہو چکی تھی لیکن میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ایک بار پھر اہل علم کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی جرأت کر رہا ہوں تا کہ وہ بحث جو ختم ہونے میں نہیں آ رہی کسی انجام کو پہنچ سکے۔ چنانچہ میں طالب علمانہ انداز میں لغت کی طرف رجوع کروں گا۔ لغت سے ''انشا'' کے یہ معانی ملتے ہیں:

''کوئی مضمون پیدا کرتا۔ طرز تحریر، مضمون نگاری۔ قواعد میں ایسا کلام جس سے کوئی خبر معلوم نہ ہو۔ عبارت لکھنا، بات پیدا کرنا۔ خط و کتابت کے قواعد کی کتاب۔''

اور ''انشا پرداز'' کے معانی یہ ملتے ہیں: مضمون نگار، ادیب، منشی، نثر لکھنے والا۔

اب اگر لفظ انشائیہ واقعی انشا سے ہے تو اس اصطلاح کے محدود استعمال کا جواز کیا ہے۔ میں یہ اصرار کروں گا کہ لفظ اور اصطلاح کے اشاراتی، استعاراتی، اصلاحی اور علامتی معانی کا تعلق، اس کے لغوی معنی سے بہرحال بنیادی طور پر قائم رہتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اہل علم سے اصطلاحوں کے لغوی معانی پر زیادہ توجہ دینے کی درخواست کرتا ہے تو اسے گردن زدنی نہیں سمجھا جانا چاہئے۔ چنانچہ 'انشا' کے جو بھی معنی ہوں' انشائیہ صرف اور صرف Essay کا مترادف ٹھہرتا ہے ـــ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ نظیر صدیقی ایسے اچھے انشائیہ نگار کو انشائیہ نگاری کے میدان میں سے باہر نکال دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ اصطلاح اُردو کو دی۔ ہمیں ان کی علمیت کا اعتراف بہرحال کرنا چاہئے۔ لیکن میں تجویز کروں گا کہ وہ اس مسئلے پر ایک بار پھر غور کریں اور دیکھیں

کہ ''انشائیہ'' کی اصطلاح کو Essay کے معنوں میں استعمال نہ کرنے کا کیا جواز باقی ہے۔ اگر آغا صاحب اس اصطلاح کو عمومی معنوں میں استعمال کرنے کی اجازت دے دیں تو یہ ایک بہت اچھی بات ہوگی۔ پھر انگریزی کی طرح لفظ انشائیہ کے ساتھ کوئی اور لفظ ملا کر مختلف قسم کے Essay کے لئے مختلف نام وضع کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو جائے گی اور ہم یہ بھی آسانی سے جان سکیں گے کہ مختلف انشائیہ نگار ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیے یقیناً وزیر آغا کے انشائیوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہ اس حد تک شخصی نہیں ہیں جس حد تک وزیر آغا کے اور کئی دوسرے انشائیہ نگاروں کے انشائیے ہیں Personal لیکن ہیں بہرحال وہ انشائیے ہیں۔ جن کی بنیادی خصوصیت طنز ہے یا پھر کسی حد تک مزاح۔ ہم اس مزاج کی بنیاد پر نظیر صدیقی کے انشائیوں کے لئے صحیح اصطلاح منتخب کر سکتے ہیں۔

اس موقع پر شاید یہ اعتراض کیا جائے گا کہ یوں تو ''انشائیہ'' کا لفظ ''مضمون'' کے مترادف ہو جائے گا، تسلیم یقیناً ایسے ہی ہوگا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہمارے پاس جب لفظ موجود ہے تو انشائیہ کو اپنانے کا کیا جواز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انشائیہ کا لفظ اپنے بنیادی معانی کے ذریعے بعض موقعوں پر مضمون سے بہتر ثابت ہوتا ہے۔ پھر یہ کہا جائے گا کہ ''انشاء'' عربی لفظ ہے اس سے ہم نے انشائیہ بنا لیا۔ عربی کے ساتھ فارسی یا ہندی کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا اور نہ ہی فارسی کے ساتھ یہ سلوک کیا جا سکتا ہے۔ یہ دلیل آج ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ اردو کا بنیادی کردار ہی اس کو مسترد کر دیتا ہے۔ دوسری زبانوں سے آنے والے الفاظ کو جب کسی نہ کسی شکل میں بدل لینے کی ہر زبان کو اجازت ہے تو اس قسم کی وہابیت کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔

لفظ ''مضمون'' بہت مظلوم ہے۔ ہمارے بعض نقاد اپنے جوش علم میں اس کا بار بار مذاق اڑا چکے ہیں۔ کبھی اسے ''جواب مضمون' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور کبھی اسے کوئی مخصوص معانی نہ رکھنے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ''انشائیہ'' (ان معنوں میں جن معنوں میں غلام جیلانی اصغر اور سلیم اختر نے اسے استعمال کیا ہے) مضمون کی ذیل میں کیوں نہیں آتا اور انشائیہ مضمون سے اور ایسے سے بالکل مختلف کیسے ہے۔ غلام جیلانی

اصغر صاحب نے حالی کی مسدس اور انیس کے مرثیے میں جس فرق کی طرف اشارہ کی ہے اور جس مماثلت کی نشان دہی کی ہے اسی قسم کا فرق اور مماثلت Essay کی مختلف ذیلی اصناف میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ انشائیہ اپنے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنی کہ حالی کی مسدس انیس کے مرثیے سے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ انشائیہ Essay نہیں ہے جیسا کہ مرثیہ مسدس نہیں ہے۔ مرثیے اور مسدس میں ایک لفظ یا چیز ''شاعری'' نے رشتہ پیدا کر دیا تو Essay (چلئے فی الحال اسے مضمون کہہ لیجئے جو غلط بھی نہیں) اور انشائیہ کے لئے وہ تیسرا کون سا لفظ ہے جو ان کی قدر مشترک کی نشاندہی کرے گا۔ واضح ہے کہ کوئی نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ وزیر آغا کے انشائیوں میں (جن کے لئے ایک مرکب اصطلاح استعمال ہو سکتی ہے) اور نظیر صدیقی کے انشائیوں میں (جن کے لئے ایک اور مرکب اصطلاح استعمال ہو سکتی ہے) وہی فرق ہے جو انیس کے مرثیے اور حالی کی مسدس میں ہے تو بات یقیناً قابل قبول ہوتی لیکن دشواری یہ تھی کہ اصغر صاحب نے تو نظیر صدیقی کو انشائیہ نگار ہی نہیں مانا۔

اگر انشائیہ کو مضمون کے معانی میں استعمال کرنا مناسب نہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ٹھوس علمی تحریروں کے لئے مثلاً سائنسی تحریروں کے لئے مضمون کا لفظ استعمال ہوتا رہے اور ان نثری Informal تحریوں کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال ہو جن کا مقصد سائنسی اور منطقی اور خالص فلسفیانہ انداز میں معلومات مہیا کرنا نہیں ہے۔ اس رائے کو تقویت لغت میں دیئے ہوئے ''انشاء'' کے ان معانی سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق انشاء قواعد میں ایسا کلام ہے جس سے کوئی خبر معلوم نہ ہو۔ چنانچہ ''مضمون'' اور ''انشائیہ'' میں تعلق کے باوجود یہ مناسب ہوگا کہ ٹھوس علمی تحریروں کے لئے مضمون اور ان شگفتہ تحریروں کے لئے جن کا مقصد ٹھوس انداز میں معلومات بہم پہنچانا نہیں اور جن میں زبان کے اشاراتی اور استعاراتی استعمال کے امکانات زیادہ ہیں اور جن میں اسلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے ''انشائیہ'' کا نام استعمال کیا جائے۔ یوں بڑی حد تک اس پریشانی سے نجات مل جائے گی جو اس وقت بعض اہل قلم کے انشائیہ کو انتہائی محدود معنوں میں استعمال کرنے پر اصرار سے پیدا ہوئی ہے۔ پھر یقیناً لفظ ''مقالہ'' پر بھی بحث ہوگی۔

سعد اللہ کلیم نے انشائیے کی بعض دوسری اصناف کے ساتھ قریبی مماثلت کا اعتراف کرتے ہوئے اسے انشائیے کی راہ میں ایک رکاوٹ قرار دیا ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہے۔ پریشانی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس مماثلت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سعد اللہ کلیم نے افسانے اور مزاح کو انشائیہ کا خطرناک مدِ مقابل ٹھہراتے ہوئے یہ ضروری قرار دیا کہ انشائیہ کہانی کا چسکہ رکھنے والوں کو وہی چسکہ اور مزاح کا چٹخارہ رکھنے والوں کو وہی چٹخارہ بھی دے اور انشائیہ بھی رہے۔ اگر انشائیہ ایسے کر سکتا ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں بلکہ یہ ایک خوبی ہی قرار پائے گا لیکن انشائیے کی یہ خوبی ایک بار پھر واضح کرے گی کہ ''انشائیہ'' کو ان محدود معنوں میں استعمال کرنے کا جواز نہیں ہے جن میں بعض دوست اسے استعمال کر رہے ہیں۔

غلام جیلانی اصغر اور سلیم اختر کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''انشائیہ'' کو محدود معنوں میں تمام نثری اصناف اور ذیلی اصناف سے ممیز کر دیا جائے اور ان سے الگ ایک چیز قرار دیا جائے اور سمجھا جائے اور سعد اللہ کلیم کی خواہش یہ ہے کہ اسے ہر قسم کی نثری تحریر پر (سوائے علمی ٹھوس مضمون کے) حاوی کر دیا جائے۔ پہلا مقصد تو حاصل نہ ہو سکا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ دوسرے مقصد کی تحریک اس حقیقت سے ہی ہوتی ہے کہ انشائیہ جیسا کہ اسے اصغر صاحب اور سلیم صاحب نے سمجھا ہے۔ ان بعض حدود کو توڑ ڈالنے پر مصر ہے جو انہوں نے مقرر کی ہیں اور یہ ڈر بھی ذہن میں ہے کہ بعض دوسری قسم کی نثری تحریریں بالخصوص دوسری قسم کے انشائیے اتنے ہی یا اس سے زیادہ دلچسپ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ بین السطور سعد اللہ کلیم کے مقالے میں میری آراء کی تائید موجود ہے۔

□□□

وزیر آغا

انشائیہ کا مسئلہ

کون نہیں جانتا کہ انشائیہ (خالص ایسے) کی ابتدا مونٹین نے کی۔ مونٹین غیر افسانوی نثر کو تخلیقی سطح پر لانے کا آرزومند تھا تاکہ یہ انکشاف ذات کا ذریعہ بن سکے۔ نیز کاروباری سطح سے اوپر اٹھ کر ادبی سطح پر آجائے۔ اس نے اپنے دلچسپ اور نادر تجربے کے ثمر کو Essais کا نام دیا۔ یہ تحریر کا ایک ایسا نمونہ تھا جس کی مثال پہلے کہیں موجود نہیں تھی۔ مناسب تھا کہ اس نئی چیز کو نام بھی نیا ہی تفویض کیا جاتا تاکہ وہ علمی، سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین سے الگ نظر آسکتی۔ مونٹین نے یہ اہم کام سرانجام دیا لیکن جلد ہی اس نئے نام کے سلسلے میں ایک ایسا المیہ ہوا کہ انشائیہ کے خاص پیکر کی اٹھان ہی معرض خطر میں پڑ گئی۔ ہوا یوں کہ ادھر مونٹین نے یہ لفظ اختراع کیا اور اُدھر زمانے نے اسے اس فراخدلی سے قبول کرلیا کہ اکثر لوگ اپنی سنجیدہ، ٹھوس اور بعض اوقات انٹ شنٹ تحریروں کو بھی ''ایسے'' کے نام سے پیش کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے خود ہمارے وطن میں جب ''اکادمی'' کا لفظ رائج ہوا تو اس کا مقصد ایک ایسا ادارہ تھا جو یونیورسٹی کی حدود کو عبور کر کے ایک اعلیٰ علمی اور ادبی معیار کے حصول کے لئے کوشاں ہو۔ مگر پھر اس لفظ کی مقبولیت ہی اس کے راستے کا سنگ گراں بن گئی۔ نتیجہ یہ کہ ''اکادمی'' کا لفظ عوامی سطح پر اُتر کر چھوٹی چھوٹی سٹیشنری کی دکانوں کی پیشانیوں پر بھی چمکنے لگا۔ کچھ یہی سلوک مغرب میں لفظ ایسے کے ساتھ ہوا کہ مونٹین نے اسے خاص قسم کی تحریر کے لئے استعمال کیا تھا لیکن وہ مقبول ہو کر ہر قسم کی غیر افسانوی نثر کے لئے استعمال ہونے لگا۔ حد یہ کہ 1690ء میں جان لاک نے اپنی فلسفے کی ضخیم کتاب کا نام An Essay Concerning Human Under Standing تجویز کیا۔ پھر اٹھارویں صدی میں لفظ ایسے کا دائرہ کار اور بھی وسیع ہوگیا۔ پوپ کا Essay on

Man اور ڈرائیڈن کا An Essay of Dramatick Poem اس کی چند مثالیں ہیں۔ انیسویں صدی میں رسکن نے اپنے سنجیدہ مضامین کو اور رچرڈ ہٹن نے اپنے مواعظ کو ایسے کے نام ہی سے پیش کیا اور یوں وہ لفظ جو شخصی سطح کے انکشافات کے لئے مختص کیا گیا تھا، بڑھ اور پھیل کر ساری غیر افسانوی نثر پر محیط ہوگیا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے اس عمل میں اس خصوصیت تک سے بے نیاز ہوگیا جسے اوّل اوّل ایسے کا جوہر قرار دیا گیا تھا۔

ایک مشہور نقاد ارل آف برکن ہیڈ نے خالص ایسے کی نشان دہی ان الفاظ میں کی ہے کہ جس طرح کوئی شخص اپنے باغیچے، گھر یا دوستی سے لطف اندوز ہوتا ہے بالکل اسی طرح ایک مفکر ادیب علم و ادب کی انتہائی سنجیدہ فضا سے باہر آکر اور خود کو ذہنی فراغت کی کیفیت میں مبتلا کر کے، اپنے ہی افکار سے محظوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ خیال ہے کہ انگریزی میں اچھے ایسز (Essays) کی تعداد بہت کم ہے۔ اور یہ ایسز بھی صرف ان بلند مرتبہ اذہان کی تخلیق ہیں جنہوں نے اپنی رو اور فرصت میں بڑے بڑے موضوعات پر چھوٹے چھوٹے نثری ٹکڑے لکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ برکن ہیڈ کا یہ بھی خیال ہے کہ انگریزی ایسے اپنی اس خاص شخصیت سے محروم ہو چکا ہے جو مونٹین نے اُسے عطا کی تھی اور اب ایسے کا لفظ ہر قسم کی ذہنی قلابازیوں کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ برکن ہیڈ کی اس بات سے اتفاق کرنا تو بہت مشکل ہے کہ انگریزی میں خالص ایسے کی آمد کا سلسلہ ہی رک گیا ہے کیوں کہ بیسویں صدی میں متعدد اعلیٰ پائے کے انگریز انشائیہ نگار پیدا ہوئے ہیں البتہ اس کی اس بات میں صداقت ضرور ہے کہ آج ایسے کا لفظ ہر قسم کے مضمون کے لئے عام طور سے استعمال ہونے لگا ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ انگریزی ایسز کا کوئی سا مجموعہ (Anthology) اُٹھا کر دیکھئے، آپ کو اس میں خالص ایسے کے پہلو بہ پہلو لاتعداد ایسے مضامین بھی مل جائیں گے جن کا اس خالص ایسے سے کوئی علاقہ نہیں جسے اوّل اوّل مونٹین نے رائج کیا تھا۔ ایسے کے سلسلے میں یہ ایک ایسا المیہ ہے جس نے مغرب میں ایسے کے فروغ کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ تاہم بیسویں صدی میں خالص ایسے کی پہچان از سر نو ہونے لگی ہے اور اب ہمیں متعدد ایسے انشائیہ نگار نظر آنے لگے ہیں جو ایسے کے اصل مزاج کو ملحوظ رکھنے پر مصر ہیں۔ ورجینا وولف، چسٹرٹن، لیوکس، بیر بوہم، رابرٹ لنڈ، وغیرہ انہی لوگوں میں سے ہیں۔ ان

میں سے بعض نے لفظ ایسے کے غیر محتاط استعمال کے پیش نظر یہ محسوس کیا کہ اب ایسے کا لفظ اس قسم کی تحریروں کے لئے کار آمد نہیں رہا جو ابتداً اس سے منسوب ہوئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسے کے ساتھ لائٹ یا پرسنل کے الفاظ لکھ کر اسے مضامین کے انبار سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ شاید وہ مجبور بھی تھے کہ لفظ ایسے کو بیک جنبش قلم منسوخ نہ کر سکتے تھے، ورنہ اس لفظ نے جس طرح اپنے مزاج اور مفہوم سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، اس کا یقیناً یہ تقاضا تھا کہ ایسے کے لفظ کو ترک کر کے کوئی اور ترکیب وضع کر لی جاتی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا مغرب میں انیسویں صدی لفظ ایسے کے سلسلے میں انتہائی ''دریادلی'' کا مظاہرہ کرنے پر بضد تھی۔ اتفاق دیکھئے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید احمد خان نے ایسے کو اُردو میں رائج کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ ان دنوں خود مغرب میں ایسے کا لفظ ہر قسم کے مضمون کے لئے بے محابا استعمال ہو رہا تھا اس لئے جب اُردو والوں نے اسے در آمد کیا تو یہ اپنے ساتھ خالص ایسے کی روایت کو لانے کے بجائے اُس رویے کو لایا جو ان دنوں میں مضمون نگاری کے سلسلے میں عام طور سے رائج تھا۔ بے شک مغرب میں ان دنوں بھی خالص ایسے لکھے جا رہے تھے لیکن یا تو وہ اُردو والوں کی پہنچ سے باہر تھے اور یا اُردو والے ان کی مزاج سے واقف نہ ہو سکے۔ چنانچہ کہنے کو تو انہوں نے مغربی ایسے کو اپنایا لیکن در حقیقت مغرب کی اُس روش کا تتبع کرنے لگے جو عام قسم کی مضمون نگاری پر منتج ہوئی تھی۔ میرے دل میں سرسید، شبلی نذیر احمد، میر ناصر دہلوی، مہدی افادی اور حسن نظامی وغیرہ کا بڑا احترام ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ ان بزرگوں نے اُردو نثر کی ترویج و ارتقاء کے سلسلے میں بڑی اہم خدمات سر انجام دی ہیں لیکن جہاں تک ایسے کا تعلق ہے انہوں نے مونٹین، لیمب اور ہیزلٹ، کے ایسیز کو سامنے رکھنے کے بجائے مضمون نگار کے اس میلان کو سامنے رکھا جو مغرب میں ایسے کے نام سے عام ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ اپنے مضامین میں کبھی تو اصلاحی رنگ کے تحت نصیحتیں کرنے لگے، کبھی علمی اور فلسفیانہ مسائل کو بڑے کرخت اور ٹھوس انداز میں بیان کرنے لگے، کبھی غیر سنجیدہ بننے کی دھن میں لڑکھڑائے اور کبھی نثر میں شعری کیفیات کو سمونے کی کوشش میں مضحکہ خیز نظر آنے لگے۔ لیکن وہ خالص ایسے کی طرف مائل نہ ہو سکے۔ میں اسے اُردو والوں کی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں نے اپنی ان نثری تحریروں کے لئے ایسے کا لفظ

استعمال نہیں کیا بلکہ انہیں ''مضمون'' کے نام ہی سے پیش کرتے رہے اور یہی مناسب بھی تھا لیکن جب بیسویں صدی کے نصف آخر میں انشائیہ (بطور خالص ایسے) اُردو میں داخل ہوا تو تحقیق کرنے والوں نے فوراً اس کا رشتہ سرسید اسکول کے مضمون نگاروں سے جوڑ دیا۔ اور یوں اُردو میں انشائیہ کو رائج کرنے والوں کے سامنے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی کہ وہ سب کام چھوڑ کر انشائیہ کو اس نئے رشتہ ازدواج سے بچانے کی کوشش کریں۔ اس مصیبت سے نپٹنے کا بہترین طریق یہ تھا کہ خالص ایسے کے لئے کوئی نیا لفظ رائج کیا جاتا۔ مضمون کا لفظ تو پہلے ہی استعمال ہو رہا تھا اور اس سے مراد ایک خاص قسم کی تحریر تھی۔ دوسری طرف ایسے کا لفظ خود مغرب میں بہت سی گرداڑانے کا باعث ثابت ہو چکا ہے۔ اور اس لئے اگر اسے رائج کیا جاتا تو پھر اہل مغرب کی طرح اس کے ساتھ ''پرسنل'' اور لائٹ کے الفاظ بھی منسلک کرنا پڑتے اور الجھنیں اور غلط فہمیاں پھر بھی باقی رہتیں، لہٰذا خالص ایسے کے نام لیواؤں نے مضمون اور ایسے دونوں کو ترک کر کے ''انشائیہ'' کا لفظ اپنا لیا تا کہ یہ خاص تحریر علمی، مذہبی، فلسفیانہ، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین نیز اخباری کالم اور جواب مضمون قسم کی تحریروں سے بآسانی الگ کی جا سکے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ انشائیہ مضمون نگاری کی روایت سے کس حد تک جدا ہے، میں نے ایک مختصر سا شجرہ مرتب کیا ہے مجھے یقین ہے کہ اس کے غائر مطالعہ سے بات آئینہ ہو جائے گی۔

ادب

نثر — شاعری

نثر: داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، سوانح عمری، سفرنامہ، انشائیہ، مضمون

مضمون: طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون، علمی مضمون، تحقیقی مضمون
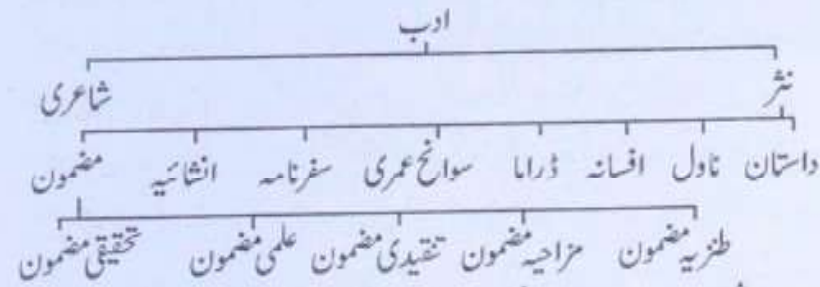
اس شجرے سے یہ بات مترشح ہے کہ انشائیہ، مضمون، کی ''شیلی''، نہیں بلکہ ایک بالکل الگ صنف ادب ہے۔ چنانچہ جب پروفیسر غلام جیلانی اصغر یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ انشائیہ، ایسے (مضمون) سے مختلف ہے یا سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں کہ ''انشائیہ کو بالعموم مضمون سے خلط ملط کرتے ہوئے مزاحیہ، طنزیہ یا تاثراتی مضمون کی شے سمجھ لیا جاتا ہے جو

کہ قطعی غلط ہے''۔ یہ تو دونوں حضرت اُسی گرد کو صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو ایسّے کے سلسلے میں مغربی ادب پر مسلط ہوئی اور پھر اردو میں بھی منتقل ہوگئی۔ جناب عرش صدیقی صاحب کا یہ خیال ہے کہ ''اگر تعداد پر انحصار کیا جائے''، یہ تو صورت یوں ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں احتشام حسین سے لے کر آدم شیخ تک لاتعداد لوگوں نے انشائیہ کو ایسّے (مراد مضمون) کے مترادف جانا ہے اور ان کے مقابلے میں انشائیہ کو ایسّے سے مختلف قرار دینے والوں کی تعداد کم ہے اس لئے فیصلہ مؤخر الذکر کے خلاف جاتا ہے۔ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں یہ جمہوری طریق کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں، دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ سرسید احمد خان کے زمانے سے لے کر آج سے چند برس پہلے کے زمانے تک اہل نظر نے ایسّے کے دونوں رخوں (یعنی خالص ایسّے اور عام ایسّے) میں حد فاصل قائم کرنے کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی؟ اس لئے کہ اس سارے دور میں ایسّے (مراد مضمون) لکھنے کی روایت تو موجود تھی لیکن ایسّے (مراد انشائیہ) کی کسی روایت نے سرے سے جنم ہی نہیں لیا تھا۔ پھر جب انشائیہ (بطور خالص ایسّے) اُردو میں داخل ہوا تو اس کی انفرادیت کو پرکھنے کے بجائے بعض حضرات نے صرف اس کے نئے نام یعنی ''انشائیہ'' پر اپنی توجہ صرف کی اور کمال دریا دلی کا مظاہر کرتے ہوئے اسے مضمون نگاری کی پوری روایت پر چسپاں کر دیا۔ گویا تاریخ نے خود کو اس طور دہرایا کہ جس طرح مونٹین کی ایک خاص وضع کی تحریروں کو دیا گیا ''ایسّے'' کا نام ہر قسم کی کاروباری اور غیر کاروباری تحریر کے لئے استعمال ہونے لگا تھا بالکل اسی طرح اُردو میں انشائیہ کے لفظ کو ہر قسم کے مضامین کے لئے عام طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ آج صورت یہ ہے کہ انشائیہ کے لفظ کو رائج کرنے والے اپنے طور پر پوری کوشش کر رہے کہ اس لفظ کا بھی وہی حشر نہ ہو جو مغرب میں ایسّے کا ہوا تھا لیکن اگر وہ اپنی مساعی میں کامیاب نہ ہو سکے اور دوسری طرف مضمون نگاری کے شائقین نے انشائیہ کے لفظ کو فراخدلی سے استعمال کرنا ترک نہ کیا تو پھر شاید ایک روز انشائیہ کا لفظ بھی بے کار ہو کر رہ جائے گا اور کسی ارل آف برکن ہیڈ کو دکھ کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ اردو انشائیہ اپنی اولین انفرادیت اور طہارت کو برقرار نہ رکھ سکا اور مضمون نگاری کی روش میں ضم ہو کر ختم ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ مضمون سے ایک بالکل الگ شے ہے اور ساری مصیبت دونوں

کے فرق کو گرفت میں نہ لے سکنے کے باعث پیدا ہوئی ہے بے شک ہمارے ہاں انشائیہ کو علمی تحقیقی اور تنقیدی مضمون سے الگ کرنے کا شعور اب پیدا ہو رہا ہے (اور یہ خوشی کی بات ہے) لیکن اسے طنزیہ اور مزاحیہ مضمون سے خلط ملط کرنے کی روش تا حال خاصی توانا ہے اور دراصل یہی وہ مقام ہے جہاں انشائیہ کے دامن کو کشادہ کر کے اس کے تحت غیر انشائی مضامین پیش کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مگر جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ طنزیہ مزاحیہ مضامین انشائیہ نگاری کے مختلف اسالیب نہیں بلکہ قطعاً الگ قسم کی تحریریں ہیں اور یہ فرق محض لہجے اور انداز کا فرق نہیں مزاج کا فرق بھی ہے۔ مثلاً غور کیجئے کہ ایک مزاحیہ مضمون کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں ''فاضل جذبہ'' خارج ہو جاتا ہے جب کہ انشائیہ میں جذبہ صَرف ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مزاح اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سننے یا پڑھنے والوں کے ہاں ایک توقع سی پیدا ہوتی ہے اور جذبات صَرف ہونے کے لئے بیدار ہو جاتے ہیں لیکن پھر یکایک مزاح نگار غبارے میں سے ہوا نکال دیتا ہے اور جذبات صَرف ہونے کے امکانات سے محروم ہو کر ہنسی کے جھٹکوں کی صورت میں خارج ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کہا جائے کہ ''شیخ سعدی سے لے کر شیخ چلی تک تمام مفکرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ خواب زندگی کا بہترین سرمایہ ہے وغیرہ تو ہنسی کو فی الفور تحریک مل جائے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ شیخ سعدیؔ کا نام آتے ہی قاری کے ہاں احترام کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا لیکن جب دوسرے ہی لمحہ شیخ سعدیؔ اور شیخ چلی کی مضحکہ خیز مماثلت سامنے آئی تو سینے میں پیدا ہونے والا احترام کا جذبہ یکایک فاضل ہو گیا اور جسم نے اسے ہنسی کے پٹاخوں کی صورت میں فوراً خارج کر دیا تا کہ طبیعت اعتدال پر آ جائے۔ مگر انشائیہ میں جذبات خارج نہیں ہوتے بلکہ نہایت خوبصورتی سے صَرف ہو جاتے ہیں: مثال کے طور پر ہیزلٹ لکھتا ہے:

One of the pleasantest things in the world is going a journey but I like to go by my self. I can enjoy society in a room, but out of door nature is company enough for me.

ظاہر ہے کہ اس فقرے میں فکر کی ایک سطح سے ایک دوسری سطح کی طرف زقند بھری گئی ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ مزاحیہ تحریر میں زقند کا رخ بلندی سے پستی کی طرف تھا (شیخ سعدی سے شیخ چلی کی طرف) اور اس کے نتیجے میں جذبات کا اخراج ہو گیا تھا مگر انشائیہ میں

زقند کا رخ نیچے سے اوپر کی طرف ہے اور جذبات صرف ہو گئے ہیں۔ انشائیہ نگار نے سفر کا ذکر کیا ہے اور اسے دنیا کا سب سے زیادہ فرحت بخش عمل قرار دے کر قاری کے دل میں سیاحت کے جذبے کو متحرک کر دیا ہے لیکن جب وہ دوسرے ہی لمحے سفر کے لئے ''اکیلا'' جانے کی شرط لگاتا ہے تو قاری کے جذبات فاضل ہو کر خارج نہیں ہو جاتے بلکہ امکانات کے ایک نئے جہان کے طلوع ہونے پر بڑی نفاست سے صَرف ہونے لگتے ہیں اور وہ اس نئی لطیف کیفیت میں خود کو سمو کر ایک عجیب سا لطف محسوس کرتا ہے۔ یہ تو محض دو فقروں کا موازنہ تھا جن میں سے ایک فقرہ مزاحیہ ادب کا Typical فقرہ ہے اور دوسرا انشائیہ کا۔ اب اگر سارا مضمون شے یا موضوع کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو سامنے لائے اور قاری کے جذبات کو خارج کرنے کا اہتمام کرے تو یہ مزاحیہ مضمون متصور ہوگا لیکن اگر کوئی نثر پارہ شے یا موضوع کے مخفی لیکن ارفع یا گہرے مفہوم کی طرف قاری کو راغب کر کے اس کے جذبات کو صَرف کرنے کا اہتمام کرے یوں کہ اس کے ہاں اعصابی اعتدال کے حصول کے بجائے سوچ کے ایک نئے سلسلے کو تحریک مل سکے تو وہ انشائیہ کے تحت شمار ہوگا۔ اسلوب کا فرق اس کے علاوہ ہے۔ مثلاً انشائی اسلوب کے سلسلہ میں عام طور سے شگفتگی کا لفظ استعمال ہوا ہے مگر بدقسمتی سے اس لفظ نے بھی زیادہ تر غلط فہمیاں ہی پیدا کی ہیں وجہ یہ کہ ایک عام قاری کے ذہن میں یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ ہنسی، تبسم اور شگفتگی ایک ہی کیفیت کے مختلف نام ہیں۔ لہٰذا جب اسے یہ بتایا جاتا ہے کہ انشائیہ سے شگفتگی اور مزاحیہ طنزیہ سے ہنسی یا تبسم پیدا ہوتا ہے تو وہ قدرتی طور پر ان سب کو ایک ہی صنف ادب متصور کر لیتا ہے۔ اس غلط فہمی کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ انشائی اسلوب کے لئے شگفتگی کے بجائے ''تازگی'' کا لفظ استعمال کیا جائے بلکہ اگر تخلیقی تازگی کہا جائے تو بہتر ہے۔ اس فیصلے کی دو وجوہ ہیں ایک تو یہ کہ انشائی اسلوب مجموعی طور پر تخلیقی سطح کا مظاہرہ کرتا ہے جب کہ مزاحیہ اور طنزیہ اسلوب مضحکہ خیز موازنہ پر انحصار کرتے ہوئے بالعموم ایک غیر تخلیقی سطح پر سرگرم رہتا ہے اور جہاں تضمین یا تصرف کو بروئے کار لاتا ہے وہاں بھی اس کا مقصد تضاد یا مماثلت کی مضحکہ خیزی کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ تخلیقی سطح کی تحریر کا وصف نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ بعض اوقات انشائیہ میں ''شگفتگی'' بالکل مفقود ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ Pathos پیدا ہو جاتا ہے گویا اسلوب کی

تازگی تو برقرار رہتی ہے لیکن اسلوب کا تاثر شگفتگی کے بجائے فکری یا سیت کو تحریک دینے لگتا ہے۔ ورجینا وولف کا انشائیہ "The death of the moth" اس کی بہترین مثال ہے کہ اس میں اسلوب کی تازگی تو برقرار ہے لیکن انشائیہ کا تاثر ایک عجیب سے حزن آمیز عرفان پر منتج ہوا ہے۔ چنانچہ اس بات کے اظہار میں مجھے تامل نہیں کہ انشائیہ مزاج اور اسلوب، ہر دو اعتبار سے مزاحیہ مضمون سے ایک الگ شے ہے اور ان دونوں کو اپنے یا مضمون کے تحت یک جا کرنا کسی طور بھی مستحسن نہیں۔

عرش صدیقی صاحب کا یہ مشورہ ہے کہ انشائیہ کا لفظ ساری Essay- Writing پر پھیلا دیا جائے اور اس کے ساتھ سابقے لگا کر طنزیہ انشائیے، مزاحیہ انشائیے، اور (خاکم بدہن) ''تنقیدی انشائیے'' کی تراکیب وضع کر لی جائیں لیکن سوال یہ ہے کہ آج تک اس کام کے لئے مضمون کا لفظ بڑی خوش اسلوبی سے استعمال ہوتا رہا ہے اور طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون، تنقیدی مضمون وغیرہ تراکیب بھی مستعمل ہو چکی ہیں تو پھر یکا یک مضمون کے بجائے انشائیہ کا لفظ استعمال کر کے تراکیب کے ایک نئے سلسلے کو جنم دینے کا کیا جواز ہے؟ قصہ در اصل یہ ہے کہ خالص اینے لکھنے والوں کو جب محسوس ہوا کہ لفظ مضمون ان کے لئے کار آمد نہیں تو انہوں نے لفظ انشائیہ وضع کر لیا اور اس میں کوئی ہرج بھی نہیں تھا لیکن جب یہ لفظ مقبول ہو گیا تو مضمون لکھنے والوں نے فی الفور لفظ ''مضمون'' کو ایک پرانا کھلونا سمجھ کر پرے پھینک دیا اور لفظ ''انشائیہ'' کو ایک نیا کھلونا جان کر سینے سے لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اب اگر خالص اینے کے نام لیوا صبر و شکر کر کے لفظ انشائیہ سے دست کش ہو جائیں اور اپنے لئے کوئی نیا لفظ وضع کر لیں تو بھی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ مضمون نگار حضرات کسی روز لفظ ''انشائیہ'' کو پرے پھینک کر اس نئے لفظ کی طرف نہیں لپکیں گے۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ لفظ انشائیہ خالص اینے کے لئے استعمال ہو اور طنزیہ مزاحیہ تحریروں کے ساتھ حسب سابق مضمون کا لفظ وابستہ رہے۔ ویسے بھی چونکہ انشائیہ تخلیقی سطح کی نثر پیش کرتا ہے جو علمی، تنقیدی، مزاحیہ اور طنزیہ نثر سے مزاجاً مختلف ہے لہٰذا لفظ ''انشا'' ہی سے اس کا رشتہ جوڑنا مناسب ہے جو طرز تحریر کی تخلیقی سطح کی نشان دہی کرتا ہے۔

□□□

اطہر پرویز

انشائیہ

انشائیہ کو میں انگریزی لفظ "ایسّے" کے معنوں میں لکھ رہا ہوں، ایسّے کے لئے اب تک اُردو میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان میں قریب ترین لفظ یہی ہے۔ کافی حد تک ایسّے کے معنی و مفہوم کو ادا کردیتا ہے۔ ہماری زبان میں اس صنف ادب کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی ہے اس لئے اُردو میں ایسّے کے مترادف لفظ کی تلاش بھی نہیں کی گئی۔ ہمارے یہاں عام طور پر لوگ "ایسّے" کے لئے "مضمون" کا لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن مضمون کے زمرے میں مذہبی، سیاسی، سماجی، مضامین سے لے کر علمی و ادبی، تحقیقی غرض ہر طرح کے مضامین آجاتے ہیں، لیکن ہم انہیں ادبی مقام نہیں دے سکتے کیونکہ یہ ادبی معیار کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔ ان کے اندر مواد ہوتا ہے اور ان کے اپنی ہیئت ہوتی ہے۔ ان مضامین کی افادیت بھی مسلم ہے اور اس کے موضوع سے متعلق پڑھنے والے اس سے لطف بھی لیتے ہیں لیکن یہاں سارا زور بات کو عالمانہ انداز سے کہنے اور معلومات فراہم کرنے پر صرف ہوتا ہے۔ یہاں علم و حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اسی لئے غور و فکر کا دامن ایک لمحے کے لئے نہیں چھوڑا جاتا اور ذہنی فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ سنجیدگی پہلی اور آخری شرط ہے۔ طنز و مزاح اس کو مجروح کرسکتے ہیں۔ بات کہنے کے انداز سے زیادہ بات کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن ادب کے کچھ اور مطالبے بھی ہوتے ہیں ہم ادب کے مفہوم کو پیش کرتے ہوئے اس پر تفصیل سے بحث کرچکے ہیں۔ انشائیہ میں ہمیں مضمون نگاری کا غیر شخصی انداز ملتا ہے۔ یہاں مصنف اپنی شخصیت کی مہر لگاتا ہے اس لئے کہ وہ معلومات فراہم کرنے یا پیدائش و اموات کے رجسٹر مرتب کرنے کا کام نہیں کرتا حالانکہ اس کی اپنی اہمیت مسلم ہے۔ انشائیہ نگار ادیب ہوتا ہے اور ادیب ہونے کے رشتے سے وہ زندگی کا نقاد اور اس کا مبصر ہوتا ہے۔ جس طرح نیند میں بھی

انسان سانس لیتا ہے اسی طرح انشائیہ لکھتے وقت بھی وہ زندگی سے بے نیاز نہیں رہتا وہ اس سے الجھتا اور اس کو سلجھاتا رہتا ہے۔ وہ دنیا دیکھتا ہے لیکن اس کا اظہار اپنے انداز سے کرتا ہے۔ سیاسی، سماجی، اور معاشی مسائل پر لکھتے وقت مصنف اپنی شخصیت کو علیحدہ کردیتا ہے اور اپنے موضوع کو غیر جانبداری سے پیش کرتا ہے اور حقیقتوں کا غیر جذباتی تجزیہ کرتا ہے۔ انشائیہ میں انسان اپنے تجربے اپنے انداز سے بیان کرتا ہے اور یہ تجربے اس کے داخلی احساسات کا ایک جز بن جاتے ہیں۔ جہاں حقیقتیں محض خارجی یا بیرونی دنیا میں نہیں رہتیں بلکہ ان سے دلوں کی بستیاں آباد ہوتی ہیں یہاں واقعات سے زیادہ واقعات کے ردعمل سے سروکار ہوتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے انشائیہ کے انداز کو اپناتے ہوئے انشائیہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ بڑی خوبصورتی سے اس کی وضاحت کرتا ہے۔

> "انہیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اس بچے کی سی ہوجاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہونچا ہو اور جس نے گھر کا کام بھی نہ کیا ہو، لیکن اس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کی بجائے الٹے برفی اور قلاقند کے دو بڑے بڑے لفافے تھمادیئے جائیں۔"

انشائیہ کے اپنے آداب ہوتے ہیں اس لئے کہ انشائیہ کی محفل ایک بزم بے تکلف ہے جہاں انسان اپنے دل کی بات مزے لے لے کر بیان کرتا ہے اس کے لئے کوئی پابندی نہیں ہے کہ یہ کہے اور وہ نہ کہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی محتسب ہوتا ہے اور نہ نقاد۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ پھر انشائیہ کا موضوع کیا ہوتا ہے۔ انشائیہ میں موضوع کی کوئی قید نہیں ہے یہاں اسے مکمل آزادی ہے کہ جس موضوع پر بات کرنا چاہے، کھل کر بات کرسکتا ہے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ وہ جے بی مورٹن کے قول کے مطابق نثر کا ایک ایسا چھوٹا ٹکڑا ہے جس میں مصنف دنیا کے کسی بھی موضوع کے باب میں اپنی ذات کا انکشاف کرتا ہے۔ اس کی تکنیک کے بندھے اصول نہیں ہیں۔ اگر افسانے اور ناول کی طرح اس کے عناصر کا بھی انتخاب کرلیا جائے تو پھر انشائیہ کی گاڑی پٹری سے اتر جائے گی۔ انشائیہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ کسی قسم کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ انشائیہ کا لکھنے والا ناول نگار یا پلاٹ

افسانہ نگار کی طرح اپنی بات کہنے کے لئے افسانوی ڈھانچہ نہیں بناتا۔ وہ کردار نگاری، نقطہ نظر اور پس منظر وغیرہ کی صناعی میں نہیں الجھتا، وہ ایسے یعنی انشائیہ لکھتے وقت ان تمام رسومات کو ایک طرف ڈال دیتا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کی حیثیت رسم ورواج سے بالاتر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ لکھنے والے کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر کی چھٹی کے بعد اپنے گھر پہونچتا ہے۔ چست وتنگ لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے۔ اور ایک آرام دہ مونڈھے پر نیم دراز ہو کر حقے کی نے ہاتھ میں لئے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔ یہاں ادب کے میکانکی عمل سے ہٹ کر زندگی کا مطالعہ نظر آتا ہے اور اس کام میں لکھنے والے کی اپنی داخلی کیفیت رہنما بن جاتی ہے۔ پاسبان عقل کا دل کے پاس رہنا ضروری ہے لیکن تخلیہ بھی انسان کی ضرورت ہے۔ انسان ہر وقت بھیڑ بھڑ کے میں زندگی گزارنا نہیں چاہتا وہ اپنی محفل خود مقرر اور خود سننے والا ہوتا ہے اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انشائیہ زندگی سے فرار کا نام ہے۔ زندگی کی حیثیت تو ہوا کی سی ہے جو ہر جگہ اپنے لئے راہیں نکال لیتی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ انشائیہ نگار زندگی کا نقاد بھی ہوتا ہے اور مبصر بھی۔ وہ انشائیہ کے ذریعے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا مقصد فوری اصلاح نہیں ہوتا اور نہ اس کے ذریعہ کسی مشن کی تبلیغ کرتا ہے لیکن زندگی اور اس کے مسائل کو بے نقاب کرنا بھی کوئی معمولی مشن نہیں۔ اس نے زندگی کو جس طرح برتا اور جس رنگ میں دیکھا ہے اسے وہ اپنی تمام تر داخلی کیفیات کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ البتہ چونکہ اس کا مقصد زندگی کی تفصیلات نہیں ہے اس لئے اختصار اور اس اختصار میں جامعیت اس کا اصول بن جاتا ہے وہ بات کو پھیلاتا نہیں، لفظوں کو چباتا نہیں، خیالات کا تجزیہ کرنے کے لئے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہ اپنی بات بلا کسی صناعی کے مختصر طور پر پیش کر دیتا ہے۔ گویا انشائیہ کا فن غزل گوئی کا فن ہے جہاں ایک شعر کے اندر ایک خیال سما جاتا ہے۔ جس طرح غزل گو اپنے خیالات کی تشریح نہیں کرتا انشائیہ نگار بھی یہ کام پڑھنے والے کے سپرد کر دیتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ خیالات اتنے اختصار کے ساتھ پیش کئے جائیں کہ سمجھنے میں دشواری پیش آئے بلکہ اس کے برخلاف یہاں تقریر کی وہ

لذت ہوتی ہے کہ آپ پڑھنے کے بعد خود کہنے پر مجبور ہو جائیں۔ ع

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ڈاکٹر سید محمد حسنین نے مقالے اور انشائیہ کا مقابلہ کرتے وقت صحیح لکھا ہے کہ "انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ شے پا لیتے ہیں، ایسی شے جو روزانہ کی سادہ اور سپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے۔ جو زندگی کے ٹھوس اور ناقابل انکار حقیقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔"

انشائیہ نگار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس کے انشائیہ میں انوکھے تجربے ہوں بلکہ اس کے برخلاف وہ تجربے ہونے چاہئیں جن سے روزمرہ زندگی کی صداقت ابھر آتی ہے لیکن عام آدمی اس کو راہ میں پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے کی طرح پار کر کے چلا جاتا ہے اور گھر پہونچنے کے بعد اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے راستے میں کیا دیکھا۔ انشائیہ نگار اس کیلے کے چھلکے پر کسی کو پھسلتا ہوا دکھاتا ہے یا اس چھلکے کو اٹھا کر کوڑے میں پھینک دیتا ہے اور اس وقت اس آدمی کو یہ احساس ہوتا کہ یہ منظر میری نظر سے بھی گزرا ہے یا یہ چھلکا میں بھی کوڑے میں پھینک سکتا تھا۔ رابرٹ لنڈ کے قول کے مطابق "ہم انشائیہ نگار صرف اتنا ہی چاہتے ہیں کہ وہ اپنے طرز تحریر سے ہمیں خوش کرے اور اپنے موضوع کو اختصار کے ساتھ کسی قدر نئی روشنی میں پیش کرے۔"

یہ نئی روشنی دراصل اس کے بیان کی تازگی ہے کیونکہ بات بظاہر پرانی ہو سکتی ہے۔ بہت گھسی پٹی بھی ہو سکتی ہے لیکن وہ ان پھولوں کی طرح ہے جو روز کھلتے ہیں مرجھاتے ہیں لیکن پھر بھی کیاری کا تازہ پن باقی رہتا ہے۔ انشائیہ نگار کی ذمہ داری ہے کہ وہ تازہ پھول کی طرف اشارہ کرے۔

انشائیہ نگار اپنے مضمون کے لئے پلاٹ نہیں بناتا وہ اس کا پورا ڈھانچہ تیار کرتا ہے کیونکہ اس کی پوری تصنیف اس کے ذہن میں پہلے سے موجود نہیں ہوتی' اس کے انجام سے واقف نہیں ہوتا۔ ایک خیال اس کے ذہن میں آتا ہے اور اس کے داخلی احساسات اس سے رشتہ قائم کر لیتے ہیں، شاید اسی لئے ڈاکٹر جانسن نے انشائیہ کو انسانی دماغ کی ڈھیلی ڈھالی اور بے پرواہ قسم کی اڑان کہا ہے۔ بلکہ وہ اسے غیر ہضم شدہ چیز سمجھتا ہے۔ ایک اور انگریزی نقاد نے انشائیہ کی تشنگی کو اس کی ضروری خصوصیات قرار دیا ہے۔ اختصار میں تشنگی تو ہوتی ہے

لیکن یہ تشنگی شدت اختیار نہیں کرتی بلکہ ہم اس سے لطف لیتے ہیں۔ یہاں بات نہ اتنی کم کی جائے کہ محض اشارے اور کنائے کی حیثیت رکھے اور نہ اتنی زیادہ کہ سننے والے تھک جائیں۔ جس طرح ہم بات کرتے ہوئے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ سننے والا ہماری بات سمجھ رہا ہے یا نہیں۔ اسی طرح انشائیہ نگار بھی سمجھتا ہے کہ اس نے اختصار کے باوجود اپنا مافی الضمیر صحیح طریقے سے ادا کیا یا نہیں۔ یہاں اختصار کے ساتھ جامعیت مشروط ہے۔

انشائیہ نگار کو اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ اپنے انشائیہ کو خیالات سے زیادہ بوجھل نہ بنادے کہ اس کا بوجھ مخاطب برداشت نہ کر سکے ورنہ اس کی حیثیت مضمون کی ہوجائے گی جس میں مختلف مسائل زیر بحث آتے ہیں اس کو یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ کس بات پر زور دیا جائے اور کسے یونہی رواروی میں بیان کر دیا جائے۔ انشائیہ نگار اپنی تخلیق میں منطق سے بھی گریز کرتا ہے۔ وہ اپنی بات کو دلیلوں سے ثابت نہیں کرتا بلکہ اپنے ذاتی احساسات کے ذریعے دوسروں کو پہنچاتا ہے کیونکہ اپنی بات کو دلیلوں کے ذریعہ ثابت کرنے اور اپنے خیالات کو فلسفیانہ اور سائنسی طریقے کے مطابق دوسروں تک پہنچانے کیلئے اور دوسرے طریقے موجود ہیں۔ اس کے لئے انشائیہ کا روپ مناسب نہیں۔ یہ تو بقول نظیر صدیقی ''وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے۔''

انشائیہ کی صنف ادب میں اس وجہ سے آئی ہے کہ لوگ اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے ایک ایسی صنف کے متلاشی تھے جہاں بات چیت کرنے کی پوری آزادی ہو جہاں اگر کسی پر تنقید کی بھی جائے تو اس کے لئے کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہونا پڑے کیونکہ انشائیہ ذاتی تحریر ہے۔ یہ اپنے مصنف کی شخصیت کا صحیح عکس ہوتا ہے اور اس کا اپنے مصنف سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے اور یہ رشتہ ہر لفظ کی تہہ میں نظر آتا ہے۔ مصنف اپنے انداز میں بے تکلفی سے بات کرتا ہے۔ یوں تو یہ انداز خطوط نگاری میں بھی عام ہے لیکن خطوط نگاری میں پھر بھی ایک دوسری شخصیت سامنے ہوتی ہے جو اسے اپنا مخاطب بناتی رہتی ہے اور جس کے

وجود کا خط لکھنے والے کو ہر لمحہ احساس رہتا ہے۔ لیکن انشائیہ کی بزم میں خود مصنف ہوتا ہے۔ یہاں وہ خود اپنی ذات سے انجمن ہے۔ یہاں بلندی بھی ہوتی ہے اور پستی بھی۔ اس لئے کوئی ایسا میدان نہیں جس کی پیائش کر کے حدود مقرر کئے جا چکے ہوں۔ یہاں کھیل شروع ہونے کے بعد ''ریفری'' کی سیٹی بجنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ یہاں لغزشیں بھی حسن بن جاتی ہیں کیونکہ یہاں بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں۔ ہر انشائیہ اپنا اصول خود وضع کرتا ہے کیونکہ یہاں بات سے زیادہ کہنے کا انداز اہمیت رکھتا ہے اسی لئے ہر انشائیہ مختلف ہوتا ہے ان میں تنوع اور رنگارنگی ہوتی ہے کیونکہ انفرادیت اس کی اولین شرط ہے۔

انشائیہ کے لئے فراغت درکار ہے اس کے لیے نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی فراغت بھی ضروری ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی ذہنی تھکن کو بھی دور کرتا ہے۔ وہ اس مسافر کی طرح ہے جو وہیں بیٹھ جاتا ہے جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔

چونکہ انشائیہ اپنے مصنف کی شخصیت کی غمازی کرتا ہے اور اس کی شخصیت ماحول کی پروردہ ہے اس لئے یہاں ماحول بھی نظر آتا ہے۔ ہر انشائیہ اپنے عہد کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ عہد اس انشائیہ میں سے ہر لمحہ جھانکتا رہتا ہے۔ زندگی اور اس کی کشمکش یہاں اپنی تمام تر عریانی کے ساتھ نظر آتی ہے۔

انشائیہ میں جہاں زندگی بغیر تصنع کے نظر آتی ہے وہاں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو پیش کرتے وقت ادیب اپنے خلوص کو بھی نذر کرے۔ یہاں ایک طرح کی سپردگی کی ضرورت ہے۔ یہاں انفرادیت ضرور ہوتی ہے لیکن احساس انفرادیت انشائیہ کو داغدار بھی بنا سکتا ہے اور انفرادیت کا خون ہوسکتا ہے، انشائیہ کسی قسم کی روک ٹوک برداشت نہیں کرسکتا۔

اچھی نثر کے لئے ضروری ہے کہ نثر لکھنے والا زبان و بیان پر اچھی طرح حاوی ہو۔ وہ اپنے انشائیہ کے اندر جھانک کر دیکھ سکے۔ انشائیہ نگار چونکہ بنیادی طور پر نثار ہوتا ہے اس لئے اسے نثر کے تمام آداب کو ملحوظ رکھنا چاہئے کیونکہ یہی پاس ادب اسے ادیب بناتا ہے۔

انشائیہ نگار کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بہت آسان ہے۔ ایک اچھے انشائیہ کو پڑھ کر یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات تو ہم بھی لکھ سکتے تھے اگر واقعی کوئی لکھنے

بیٹھے تو اسے معلوم ہو کہ لکھنا گویا تلوار کی دھار پر چلنا ہے کیونکہ ذرا سے بہکنے پر انشائیہ اپنی ہیئت کو کھو سکتا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''انشائیہ نگاری، دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ صرف ایک ذہنی اپج ہے اور مشکل اس لئے کہ ہر ذہنی اپج انشائیہ نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے بھی محض فکر کافی نہیں بلکہ ذکر بھی درکار ہے اور یہ ذکر آسان نہیں۔ اس کی اولین شرط عملی نفسیات ہے اور ادب میں آکر یہ ایک خاص اسلوب اختیار کر لیتی ہے جس میں فلسفہ، تنقید اور ادب کے تمام شعبے (مع طنز، تعریض، مزاح کے) ایک دوسرے سے گتھے نظر آتے ہیں''۔

انشائیہ کا ارتقا مختلف ملکوں میں اپنے اپنے طریقے سے ہوا اور اس کا تعلق اس ملک کی اپنی زبان' اپنے مزاج، اپنے سماج اور اپنے ماحول سے اتنا گہرا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں اس کا لطف کھوئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ انشائیہ مکمل طور پر اپنی فضا سے گتھا ہوا ہوتا ہے اس کا اپنی زبان سے گہرا رشتہ ہوتا ہے کیوں کہ اس کا طنز و مزاح، اس کی سادگی و تازگی اس کے اپنے ماحول میں ہوتی ہے۔ آپ اسے اس کے ماحول سے لگ کر دیجئے' اس کا لطف اور اس کی کیفیت کم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ ہر زبان میں اپنے اپنے ڈھنگ سے ترقی کر رہا ہے۔

دنیا میں سب سے پہلا انشائیہ نگار فرانس میں مونٹین تھا، اس کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ 1580ء میں شائع ہوا۔ یوں تو انشائیہ کے نمونے اس سے پہلے بھی ملتے ہیں۔ چین، عرب، ہندوستان، اور ایران وغیرہ ملکوں میں اس کی جھلکیاں مختلف نثری تحریروں میں ملتی ہیں۔ لیکن اس کو باقاعدہ ایک صنف کی شکل تو مونٹین نے ہی دی۔ اس نے ان انشائیوں میں شخصیت کے اظہار پر زور دیا اور اس نے اپنے تجربے، علم اور مشاہدوں کو انشائیوں کا روپ دیا۔ اس کا اثر یورپ کے ادبی ماحول پر پڑا اور لوگوں کا انداز فکر متاثر ہوا۔ مونٹین کے ایک انشائیہ ''خوف کی بات'' کا ایک پیراگراف ملاحظہ فرمائیے۔

''لوگوں کا یہ کہنا کہ میں انسانی فطرت کا ماہر ہوں، صحیح نہیں۔

میں یہی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کس پراسرار راستے سے ہمارے اندر خوف کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ بہر نوع اس کا محرک کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ خوف جس سرعت سے ہمارے فیصلوں کو بدلتا ہے، کوئی دوسرا تیزی کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہ خیال یقیناً صحیح ہے اس لئے کہ میں خود اکثر اس جذبے سے مغلوب ہو کر ایک ہیجانی کیفیت کا شکار رہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ انتہائی مستقل مزاج افراد بھی جب اس جذبے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ شدید استعجاب اور انتشار سے محفوظ نہیں رہتے۔ میں اس سوقیانہ قسم کے خوف اور ہیبت کو نظر انداز کرتا ہوں، جس کا محرک کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے جیسے آنجہانی افراد میں کسی کا کفن پوش حالت میں میں قبر سے نکلنا، یا پھر بھوتوں اور آگ اگلنے والے اژدھوں کا نمودار ہونا یا کوئی بھیانک خواب۔''

انگریزی میں انشائیہ کی اولیت کا سہرا بیکن کے سر ہے، لیکن بیکن کے یہاں سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔ بیکن کی حیثیت انگریزی نثر کے امام کی سی ہے اس کے انشائیوں میں فلسفے کی آنچ بھی شامل ہوگئی ہے۔ داخلیت کے ساتھ ایک قسم کی خارجیت کا بھی اضافہ ہوگیا ہے، اور ان سب کے ساتھ زندگی کے تجربے کی بھی آمیزش ہے۔ اپنے ایک انشائیہ ''مطالعہ کے بارے میں'' لکھتا ہے:۔

''مطالعہ، حسرت، حسن اور قابلیت کا ضامن ہے، مسرت تو ہمیں نجی طور پر حاصل ہوتی ہے مگر حسن مطالعہ کا اندازہ ہمیں گفتگو کے دوران ہوتا ہے اور قابلیت کا امتحان کاروباری زندگی کے متعلق فیصلوں میں کیوں کہ مشاق عملی طور پر زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں لیکن ان معاملات پر صحیح رائے اہل علم ہی دے سکتے ہیں۔ مطالعہ میں ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرنا محض تساہل اور محض آرائش بیان کے لئے اس کا استعمال تکلف اور محض اصولوں کی بنا پر رائے زنی علماء کا مزاج ہے۔

مطالعہ سے ہمارے اندر ایک قسم کی پختگی آتی ہے اور تجربے سے تکمیل ہوتی ہے کیونکہ ہماری فطری صلاحیتیں ایسے خودرو پودوں کی طرح ہیں جن کی کانٹ چھانٹ لازمی ہے اور مطالعہ زیادہ حد تک اس سمت میں کامیابی کی دلیل ہے۔''

بیکن کے بعد انگریزی ادبیات میں سرٹامس براؤن، ایڈیسن، اسٹیل، گولڈ اسمتھ، ہیزلٹ، چارلس لیمب، اسٹی ونسن، میکالے، رسکن، پیٹر، چسٹرٹن، گارڈنر اور رابرٹ لینڈ وغیرہ کے یہاں اس صنف ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ ان تمام انشاپردازوں نے انگریزی انشائیہ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

چارلس لیمب کا مقام انگریزی انشا پردازوں میں بہت بلند ہے اور اس کی عظمت کی بنیاد اس کی اپنی زندگی کا المیہ ہے۔ جس نے اس کی طبیعت میں سوز و گداز کا عنصر شامل کر دیا۔ محمد یسین صاحب کے الفاظ میں ''لیمب کے مضامین میں مزاح کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے کہ ہم پڑھنے پر مسکراتے بھی ہیں، گدگدی بھی محسوس کرتے ہیں لیکن اس مزاح کی تہہ میں غم کا عنصر بھی دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیمب کی زندگی ایک طرح کی ایثار کی زندگی تھی جس نے اس کے اندر ایک عجیب و غریب ظرف پیدا کر دیا تھا۔ ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں نے اس کے اندر سوز و گداز ضرور پیدا کر دیا تھا لیکن اس کا مطمح نظر کبھی قنوطی نہ ہو سکا'' لیمب نے اپنی زندگی کے اندر جھانک کر دیکھا اور اس نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی جھلکیاں اپنے انشائیوں کے ذریعہ دکھائیں۔ ''کنوارے کی شکایت'' لیمب کا ایک خوبصورت انشائیہ ہے اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

''یکا و تنہا فرد کی حیثیت سے میرے وقت کا بیشتر حصہ شادی شدہ لوگوں کی ان کمزوریوں کے مشاہدے میں صرف ہوا ہے جو میرے اس طرح کنوارا نہ رہنے پر شاید میری تسکین دل کا باعث بھی ہوتیں۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مردوں اور ان کی بیویوں کے جھگڑوں کا میرے اوپر کوئی اثر ہوا لیکن شادی شدہ لوگوں کے گھر مجھے جس بات کا

سب سے زیادہ رنج ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنی محبت کا شدید طور پر اظہار کرتے ہیں۔ اپنے کو دنیا سے الگ تصور کر کے ایک دوسرے کی دنیا میں کھو جانے کا مقصد ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔

شادی دراصل ایک قسم کی اختیار کلی ہے جو ہمارے لئے کم دل شکن نہیں۔ اس حق خود اختیاری کا مقصد تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ شادی شدہ جوڑے کنواروں کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں اپنے حق و حصہ کی ترغیب نہ دیتے لیکن یہ لوگ خواہ مخواہ اپنی حرکتوں سے ہمیں چھیڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔''

اردو ادب میں انشائیہ کا ارتقاء اپنے انداز سے ہوا۔ اگر ہم انگریزی انشائیوں کا معیار ذہن میں رکھیں اور اس کی کسوٹی پر اُردو انشائیوں کو پرکھنے کی کوشش کریں تو شاید ہمیں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اُردو میں انشائیہ کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یہاں انشائیہ کے نام یا اس کے خیال پر کچھ اور ہی لکھا جاتا رہا ہے، اس لئے کہ انگریزی میں انشائیہ سے جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے اس کی جھلکیاں ضرور مرزا غالب، سرسید، حالی، محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، مہدی افادی، سجاد انصاری، ناصر علی، حسن نظامی، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مولانا ابوالکلام آزاد، پطرس، فلک پیما، کنہیالال کپور اور کرشن چندر وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں لیکن صحیح معنوں میں کوئی بھی انشائیہ نگار نہیں ہے۔ ان میں کوئی مزاح نگار نظر آئے گا تو کوئی طنز نگار کوئی خاکہ لکھ رہا ہے تو کوئی اپنی انشائیہ نگاری کی صلاحیت کو خطوط نگاری میں صَرف کر رہا ہے۔ لیکن انشائیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تو ہے کہ اس میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ انگریزی میں بھی تمام انشائیہ نگار ایک سے نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے انشائیہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایڈیسن اور بیکن کے انشائیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ انشائیہ کے معاملے میں اتنے سخت احتساب کی ضرورت نہیں، کیونکہ فنی تخلیقات کے الگ الگ نام دینے پڑیں گے۔ اس لئے کہ اگر آپ پطرس کو محض مزاح

نگار کہیں گے تو پھر مہدی افادی یا ابوالکلام یا فلک پیما کے لئے کچھ اور نام رکھنے پڑیں گے۔ انشائیہ میں مزاح بھی شامل ہے اور طنز بھی یہ باتیں تو انشائیہ کے اندر اپنے آپ سما جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ اُردو کی اپنی روایات پر نظر ڈالنی چاہئے۔ مولانا محمد حسین آزاد کے نیرنگ خیال کے بعض مضامین انشائیہ کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آزاد کے تخیل نے اس میں تمثیل کا رنگ بھی شامل کر دیا۔ لیکن ان کا موضوع اور اس کے ساتھ آزاد کا انداز نگارش اسے کسی اور صنف کے مقابلے میں انشائیہ سے زیادہ قریب کر دیتا ہے۔ غالب کے یہاں اگرچہ انشائیہ لکھنے کی نیت نہ تھی ان کا شخصی انداز، دل کی بات کہنے کی تڑپ انہیں انشاپرداز ضرور بنا دیتی ہے۔ محمد حسین آزاد کے یہاں خارجیت کا عنصر پھر بھی نمایاں رہتا ہے اور غالب کے یہاں تو سرتاسر داخلیت ہے۔

سرسید ریفارمر تھے۔ ان کے یہاں ترقی پسند ادیبوں کی طرح مقصدیت پر نظر تھی۔ وہ مقصد کو انشا کی ڈیوڑھی پر ایک لمحے کے لئے بھی قربان کرنے کے لئے تیار نہ تھے اس لئے ان کے انشائیوں میں داخلیت کا عنصر بہت کم ہو گیا ہے۔ سرسید ذرا سی دیر کے لئے بھی دل کو پاسبان عقل سے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔ ان کے سامنے ایک بڑا مقصد تھا اور انہوں نے اس مقصد کے حصول کے لئے ادب کو محض ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ وہ تو کہیئے اپنی ذہانت کے ہاتھوں مجبور تھے جو ان کے قلم سے ''بحث و تکرار'' اور ''امید کی خوشی'' جیسے انشائیے نکل گئے۔

حالی تو سرسید کے ہم نوا تھے ان کے سامنے بھی ادب سے زیادہ اونچے مسائل تھے۔ ان کے انشائیہ، زمانہ، پر تبصرہ کرتے وقت عبدالغفار شکیل نے لکھا ہے کہ ''ان کا مضمون ''زمانہ'' وقت کا عین تقاضا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت سے حالی کے نام سے زیادہ سرسید کے کام کو تقویت پہونچی، لیکن پھر بھی لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے انہوں نے سادہ اور سپاٹ انداز سے ہٹ کر ایک انشاء پرواز کے طریقے کو اپنایا۔''

حالی کے انشائیوں میں ''زبان گویا'' کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حالی کی مزاج میں انکسار تھا، اپنی ذات کو نمایاں نہ ہونے دینے کا جذبہ تھا جس نے ان کے انشائیوں کو بلند تر نہ ہونے دیا۔ ورنہ ان کے یہاں کافی امکانات تھے۔

بیسویں صدی میں اُردو میں کئی اچھے انشاپرداز ہوئے جن میں شرر، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، پطرس، کپور وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں، حالانکہ ان میں زیادہ تر مزاح نگار اور طنز نگار ہیں، لیکن ان سب کے یہاں انشائیہ کا عنصر نمایاں ہے۔ اور اس کے بل بوتے پر نئے انشائیہ کی تعمیر ہو سکتی ہے۔

موجودہ دور میں وزیر آغا، نظیر صدیقی، داؤد رہبر کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ خورشید الاسلام بڑے کامیاب انشاپرداز ہیں۔ ان کے یہاں انشائیہ لکھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی صلاحیت کو تخلیقی تنقید لکھنے کی طرف موڑ دیا ہے اس لئے انہیں انشائیہ نگار کہنا زیادتی ہے۔ وزیر آغا بڑی کامیابی سے اس صنف کو آگے بڑھائے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''خیال پارے'' کے نام شائع ہوا ہے۔ ان میں بعض بے حد حسین انشائیے ہیں جنہیں انگریزی انشائیوں کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔

نظیر احمد صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ ''شہرت کی خاطر'' حال ہی میں چھپا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے انشائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''نظیر صدیقی ان لکھنے والوں میں سے ہیں جو اپنے مضامین میں کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن کہیں سلیقۂ اظہار کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے وہ اپنے مضمون کی تعریف نوک پلک درست کرتے ہیں۔ ان کے مضامین کا تانہ بانہ تو انگریزی زبان کے انشائیوں کا سا ہوتا ہے لیکن پیرایہ اظہار میں وہ رشید احمد صدیقی سے خاصے متاثر ہیں، کہیں کہیں وہ رشید صاحب کے شاگرد معنوی معلوم ہوتے ہیں۔'' مجموعی طور پر نظیر صدیقی کے یہاں ابھی فنی پختگی پیدا نہیں ہوئی ہے لیکن وہ صحیح راستے پر گامزن ہیں۔ امید ہے کہ مہارت پالیں گے۔ انشائیہ کا مستقبل بہت روشن ہے اور اب دھیرے دھیرے لوگوں کی نظر اس کے امکانات پر پڑ رہی ہے۔ اور بقول سید احتشام حسین اردو کو ابھی اس منزل تک پہونچنا ہے اور وہ بھی اس وقت ممکن ہے جب ذہن کی تیزی، طبیعت کی شگفتگی، معلومات کی وسعت اور قدرت بیان، سب ایک دوسرے میں محلول ہوں اور وہ ادب پارہ وجود میں آئے جس کی ابتداء، وسط اور خاتمہ سب یکساں طور پر اپنی ناتمامی کے باوجود جامعیت کے مظہر ہوں۔

□□□

نظیر صدیقی

کچھ انشائیے کے بارے میں

دنیا میں کوئی فن ایسا نہیں جس کی جامع اور مانع تعریف بسا اوقات محال کی حد تک مشکل نہ مانی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں میں انشائیے کی کوئی تعریف پیش کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ انشائیہ کیا ہے تو میرا جواب ہوگا کہ انشائیہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں حکمت سے لے کر حماقت تک اور حماقت سے لے کر حکمت تک کی ساری منزلیں طے کی جاتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں بے معنی باتوں میں معنی تلاش کئے جاتے ہیں اور بامعنی باتوں کی مہملیت اور مجہولیت اجاگر کی جاتی ہے یعنی Sense میں Non-Sense اور Non -Sense میں Sense ڈھونڈھا جاتا ہے۔ یہ وہ ادبی صنف ہے جس میں لکھنے والا غیر سنجیدہ ہونے کے باوجود سنجیدہ ہوتا ہے اور سنجیدہ ہونے کے باوجود غیر سنجیدہ یعنی بالفاظ غالب لکھنے والے کی بیخودی میں ہشیاری اور ہشیاری میں بیخودی پائی جاتی ہے۔ یہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں کہیں سچ میں جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے اور کہیں جھوٹ میں سچ کی۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں نہ صرف اپنا نام اور دوسروں کی پگڑی اچھالی جاتی ہے بلکہ اپنی پگڑی اور دوسروں کے نام بھی۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں لکھنے والا نہ صرف دوسروں کی کمزوریوں پر ہنستا ہے بلکہ اپنی کمزوریوں پر دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع دیتا ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں تفریح اور تنقید ایک دوسرے سے بغل گیر نظر آتی ہیں اور بصیرت و ظرافت ایک دوسرے کی سگی بہنیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان اور نفس مضمون میں وہی نسبت ہے جو کھونٹی اور لباس میں ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں عنوان مضمون سے مربوط ہونا ضروری نہیں۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں لکھنے والا کومن سنس اور کلچر سے اپنے ظاہری انحراف کے باوجود ان دونوں کی اشاعت

میں حصہ لیتا ہے۔ یہ وہ صنف ادب ہے جس میں Whim, Fancy اور Idiocyncracy ان تمام چیزوں کو راہ دی جا سکتی ہے لیکن جن چیزوں کی بنا پر کسی انشائیہ نگار کو اونچا رتبہ حاصل ہوتا ہے وہ Whim, Fancy اور Idiocyncracy نہیں بلکہ زندگی اور انسانی فطرت پر وہ تنقید ہے جو دونوں کے گہرے مشاہدے اور مطالعے پر مبنی ہوتی ہے۔ غالباً انشائیے کے اسی پہلو پر زور دینے کے لئے ایف ایچ پریچرڈ نے کہا تھا کہ ''اگر آپ انشائیہ نگار کے مقصد کو سمجھتے ہیں تو خیر۔ اگر نہیں سمجھتے اور اس کے تمسخر اور الفاظ کے ظاہری کھیل سے لطف اندوز ہونے پر اکتفا کر لیتے ہیں تو اس میں نقصان آپ کا ہے۔

انشائیے میں احمقانہ باتوں کی اجازت ضرور ہے لیکن صرف احمقانہ باتوں پر اکتفا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں۔ دراصل ادب کی کسی بھی صنف میں صرف قافیہ پیمائی سے کام نہیں چلتا۔ معنی آفرینی ضروری ہوتی ہے۔

شاعر کی طرح انشائیہ نگار کے لئے بھی لازم ہے کہ اگر وہ اپنے کام کا آغاز قافیہ پیمائی سے کرے جب بھی معنی آفرینی کی حدود تک ضرور پہنچے ورنہ قارئین کے قیمتی وقت پر اس کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔

انشائیہ شاعری کی جس صنف سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ غزل ہے۔ انشائیہ نگار سے انشائیے کا مطالبہ وہی ہوتا ہے جو ایک اچھے غزل گو سے غزل کا ہوتا ہے۔ یعنی بقول شاعر (محبوب خزاں) ایک اچھی غزل میں مطلع اور مقطع دونوں اچھے ہوں۔ پانچ شعر اچھے ہوں اور آٹھواں شعر نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ غزل میں بھرتی کا شعر نہیں ہونا چاہئے۔ ٹھیک اسی طرح انشائیے میں بھرتی کے پیراگراف نہیں ہونے چاہئیں۔ اور اگرچہ انشائیے کو مضمون کی ایک قسم کہہ سکتے ہیں کیونکہ انشائیہ مضمون کے فارم میں لکھا جاتا ہے۔ افسانہ یا ناول کے فارم میں نہیں۔ تاہم انشائیے کے اندر مضمونیت بالکل نہیں ہونی چاہئے۔ انشائیے میں معنی آفرینی، نکتہ سنجی اور بصیرت افروزی کی گنجائش ضرور ہے۔ لیکن خالص علمیت اور بقراطیت کے مظاہرے کی گنجائش ہرگز نہیں۔

علمیت اور بقراطیت انشائیے کے لئے یقیناً خطرناک ہیں لیکن اس کے لئے اس سے بھی زیادہ خطرناک خود انشائیے کی آزادیاں ہیں۔ انشائیہ سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر بھی

لکھا جا سکتا ہے اور غیر سنجیدہ سے غیر سنجیدہ موضوع پر بھی۔ لیکن سنجیدہ موضوع پر لکھتے وقت موضوع کو اس کی سنجیدگی سے آزاد کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور غیر سنجیدہ موضوع پر بھی لکھتے وقت غیر سنجیدگی کو زیادہ دور تک نہیں لے جانا چاہئے۔

ڈاکٹر جانسن نے انشائیے کو دماغ یا خیال کی ترنگ کہا ہے لیکن اچھا انشائیہ صرف خیال کی ترنگ نہیں ہوتا۔ اس میں مشاہدے اور تجربے کا رنگ بھی ہونا چاہئے۔

انشائیہ نگاری کی ایک شرط غالباً اولین شرط۔ اچھا نثر نگار ہونا ہے۔ ہر انثر نگار بڑا ناول نگار تو ہو سکتا ہے لیکن اچھا انشائیہ نگار کبھی نہیں ہو سکتا۔

یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ اچھا نثر نگار کسے کہتے ہیں۔ اس کے بہت سے معیار ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اسے جملہ لکھنا آتا ہو، دوسری بات جو انشائیہ نگار کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اُسے انشائیے کو شروع کرنے اور ختم کرنے کا فن آتا ہو۔ انشائیے کی طوالت اور اس کا اختصار کسی مقررہ اصول کا پابند نہیں۔ لیکن اس معاملے میں خود انشائیہ نگار کو یہ اندازہ کرنا چاہئے کہ اس کی تخلیقی توانائی طوالت کی متحمل ہو سکتی ہے یا نہیں۔

انشائیہ نگار مزاح نگار یا طنز نگار بھی ہو سکتا ہے لیکن ہر مزاح نگار یا طنز نگار کا انشائیہ نگار ہونا ضروری نہیں کیونکہ طنز اور مزاح اصناف ادب نہیں اوصاف ادب ہیں۔ اس بنا پر عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی تحریروں کی نمایاں صفت کے اعتبار سے طنز نگار یا مزاح نگار ہو لیکن اپنی تحریوں کی صنف کے اعتبار سے ناول نگار یا ڈراما نگار ہو۔ مثلاً چارلس ڈکنس ناول نگار اور مزاح نگار ہے جبکہ برنرڈ شو ڈراما نگار اور طنز نگار۔

انشائیہ بظاہر ایک بے ضرر صنف ادب ہے لیکن ایک لحاظ سے نہایت خطرناک صنف ادب بھی ہے اس میں سنجیدہ سے سنجیدہ بات سرسری انداز میں کہہ دی جاتی ہے۔ وہ سنجیدہ بات کسی کے بنیادی عقیدے اور رویے کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح انشائیے کے ذریعے انسانی ذہنوں میں غیر روایتی عقائد اور رویے کی کاشتکاری اور آبیاری نسبتاً زیادہ محفوظ عمل ہے۔ اس اعتبار سے انشائیہ نگار زندگی کے بہت سے معاملات میں فکر و مشاہدے کے لئے ایک نیا تناظر فراہم کرتا ہے۔ اسے قبول کرنا ضروری نہ سہی لیکن اسے سوچے سمجھے بغیر مسترد کر دینا بھی مناسب نہیں۔

□□□

کچھ انشائیہ کے بارے میں

اُردو انشائیہ نے جس مختصر عرصہ میں اپنا چہرہ بنایا ہے اور اپنی صنفی پہچان کے ساتھ ساتھ ایک رجحان کی شکل اختیار کی ہے وہ نہ صرف اس کی بطور صنف ایک قوت کا اظہار ہے بلکہ اس کے لکھنے والوں کے خلوص اور فنکارانہ چابکدستی کی دلیل بھی ہے۔ اس مختصر عرصہ میں انشائیہ بہت زیادہ متنازع صنف رہا ہے کہ مختلف لکھنے والوں نے اسے اپنے ذاتی حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور جس قسم کے لطیف مضامین وہ خود لکھتے رہتے ہیں، ان پر انشائیہ کا لیبل چسپاں کرتے رہے چنانچہ طویل عرصہ تک مزاح، طنز اور انشائیہ کی حد بندیاں نہ ہو سکیں اور ایک ہی مضمون میں کہیں مزاح کہیں طنز، کہیں انشائیہ کے ذائقے ابھرتے رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا پہلے نقاد اور انشائیہ نگار ہیں جنہوں نے نہ صرف انشائیہ کی صنفی حدود کا تعین کیا بلکہ خود انشائیے لکھ کر اس صنفی حدود کی عملی صورت بھی پیش کی۔

انشائیہ اظہار ذات کی ایک صورت ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انکشاف ذات کا ایک ایسا عمل ہے جس میں روحانیت کا ذائقہ بھی ہے اور مادیت کی مٹھاس بھی۔ انشائیہ نگار کسی خارجی یا داخلی حوالے سے ذات کے سمندر میں غواصی کرتا ہے اور اندرونی تہہ سے جو موتی نکال کر لاتا ہے اسے پڑھنے والے کے سامنے پیش کر کے اپنی غواصی کی مسرت میں اسے بھی شامل کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ اپنی مسرتوں میں دوسروں کو شریک کرنے کا عمل ہے اور یہ روحانی عمل بن جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ انشائیہ نگار کی شخصیت جتنی بڑی ہوگی اتنا ہی اس کے اندر کا سمندر بڑا ہوگا اور اتنی ہی اس کی غواصی گہری ہوگی سو وہ جو موتی نکال کر لائے گا وہ اتنا ہی قیمتی ہوگا اور اس کی مسرت اتنی ہی لطیف اور ارفع ہوگی۔ اس بات کو

وضاحت سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ دوسری اصناف میں کسی فن پارے کی عظمت میں لکھنے والے کی شخصیت سے زیادہ موضوع کا بڑا پن، تکنیکی مہارت اور اسلوب کی شگفتگی کو دخل ہوتا ہے چنانچہ یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض چھوٹی شخصیت کے ادیبوں نے بڑا ادب اور بعض بڑی شخصیتوں کے ادیبوں نے چھوٹا ادب تخلیق کیا ہے۔ انشائیہ کا معاملہ مختلف ہے۔ میری ذاتی رائے میں اچھے انشائیہ کے لئے بڑی شخصیت یا یوں کہہ لیجئے کہ شخصیت کی نفاست اور شرافت کا ایک خاص معیار ہونا ضروری ہے ورنہ موضوع جو بھی ہو، اسلوب جیسا بھی ہو انشائیہ میں فلسفیانہ عظمت، روحانی شگفتگی اور ارفع مسرت پیدا نہ ہوسکے گی۔ ایک کھردری شخصیت اچھا انشائیہ لکھ ہی نہیں سکتی۔ بڑی بڑی علمی اور تکنیکی توجیہات سے قطع نظر میری رائے میں انشائیہ کی ساری بحث شخصیت کی نفاست وشرافت کی ہے۔ جو لوگ اپنے اندر نفاست کی یہ صورت نہیں رکھتے وہ انشائیہ لکھتے لکھتے یا تو مزاح لکھ جاتے ہیں یا طنز کرنے لگتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں انشائیہ سے قطعی مختلف ہیں کہ ان کے لئے جمعہ بازار قسم کی شخصیت کا ہونا ضروری ہے جبکہ انشائیہ ایک اندرونی سفر ہے جس میں کسی جمعہ بازار کی گنجائش نہیں، انشائیہ کا سفر اکیلے کا سفر ہے۔ خلوص کے تقدس اور من میں ڈوب کر زندگی کی معنویت پانے کا سفر۔

سلیم آغا کے انشائیوں کے مجموعہ "سرگوشیاں" پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ انشائیہ آج کا سب سے زیادہ موثر ذریعہ اظہار ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انشائیہ مستقبل میں اظہار کا سب سے اعلیٰ ذریعہ ہوگا تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں، وجہ یہ کہ جدید عہد میں جو الجھاؤ اور باریکیاں زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان کا اظہار ہیئت کے جبر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ شاعری، افسانہ اور دوسری اصناف میں خیال کو تکنیک کے اتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات اس کی نزاکت اور اصلیت ہی غائب ہوجاتی ہے۔ انشائیہ میں خیال تکنیک کو اپنے بہاؤ میں لے کر چلتا ہے اور خیال نہ صرف اپنی نزاکتوں کے ساتھ اپنی اصلیت برقرار رکھتا ہے بلکہ پڑھنے والے کو ایک ازلی مسرت اور اور سچائی سے بھی ہمکنار کردیتا ہے۔

انشائیہ کے بارے میں تکنیکی بحثیں تو بہت ہوئی ہیں، میں ان بحثوں کی باریکیوں میں پڑے بغیر صرف اتنا عرض کروں گا کہ جب کوئی فن پارہ تکنیکی چالاکیوں سے مبرا ہو کر سوچ

اور فکر کی شمعیں اس طرح روشن کرے کہ پڑھنے والا ایک روحانی مسرت سے ہمکنار ہو جائے تو یہ تخلیق کا اعلیٰ ترین مقصد بھی ہے اور معیار بھی۔ انشائیہ اسی مقصد اور معیار کا نام ہے۔ جب کسی لکھنے والے کے پاس کوئی جذبہ، کوئی موضوع نہیں بھی ہوتا تو وہ اپنی فن کارانہ مہارت اور تکنیکی مہارت کی بنیاد پر کچھ لکھ ہی لیتا ہے۔ غزل میں تو یہ کاروبار عام ہے۔ انشائیہ غالباً وہ واحد صنف ہے جسے اس وقت تک نہیں لکھا جاسکتا جب تک اس کے لکھنے کی پکار اندر سے نہ ابھرے اور یہی اس کے نزول اور اعلیٰ تخلیقی عمل کی دلیل ہے، ظاہر ہے انسان خارجی عمل میں تو منافقت کرسکتا ہے لیکن اپنے باطنی عمل میں نہیں اور انشائیہ کا تعلق باطن سے ہے۔

انشائیہ نے مختصر عرصہ میں اپنا تکنیکی دائرہ مکمل کیا ہے اور اپنا نظام شمسی بنالیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی مرکزیت نے جہاں اس نظام کو فکری اور تکنیکی توانائی عطا کی ہے وہاں اس کے صنفی چہرے کو ابھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔

انشائیہ انسان اور انسان کے متعلقات سے بحث کرتا ہے اس لئے اس میں انسانی زندگی کے سارے ہی پہلو سمٹ آتے ہیں۔ بطور صنف بھی اس میں بڑا تنوع ہے۔ انشائیہ لکھنے والوں کے اپنے اپنے رویوں، مواد اور چیزوں کو دیکھنے کے زاویوں سے انشائیہ میں ایک ورائٹی ہے، دوسرے یہ کہ لکھنے والے کا پس منظر اور پیش منظر اس کے اظہاری رویے کو متعین کرتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ نگاروں نے بھی اپنے اپنے خام مواد کو اپنے اپنے اسلوبی پیکر عطا کئے ہیں وزیر آغا اور سلیم آغا کے یہاں دیہاتی، تراشی اور زمینی رشتوں کی گہرائی نظر آتی ہے جبکہ جمیل آذر اور مشتاق قمر کے یہاں شہری زندگی کی رواروی اور شور شرابے کی پیکر تراشی ہے۔ یہ بات اس لحاظ سے اچھی ہے کہ انشائیہ یکسانیت کا شکار نہیں ہوا۔

انشائیہ کا سفر جاری ہے اور ابھی تو اس نے اپنی وہ حیثیت بھی منوانی ہے کہ سچے جذبات کا اظہار صرف انشائیہ ہی میں ممکن ہے، اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ انشائیہ مستقبل کی صنف ہے اور آنے والے زمانے میں اظہار کا سب سے سچا رویہ بھی کہ باقی اصناف تو تکنیکی چڑھائیاں چڑھ چڑھ کر اب بری طرح ہانپ رہی ہیں۔ ایسے میں اگر انشائیہ نئی رت، نئی سمت، نئے سفر کی خبر دیتا ہے تو اس میں کیا شک ہے!

□□□

وزیر آغا

انشائیہ اور اُردو انشائیہ نگاری

انشائیہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں پچھلے تیس برس سے اور مغرب میں کم و بیش پچھلے تین سو برس سے یہ بحث جاری ہے کہ انشائیہ کیا ہے مگر تا حال انشائیہ کی کوئی ایسی تعریف Definition سامنے نہیں آسکی جو اسکے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کر سکے اس سے بعض لوگوں نے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا کہ انشائیہ بحیثیت صنف ادب ناقص ہے کیونکہ اس کی حدود متعین نہیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دیگر اصناف ادب کی حدود کا تعین ممکن ہو سکا ہے؟ کیا ہم غزل یا افسانے کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کیا ہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا ہم ان کی کوئی ایسی تعریف وضع کر سکتے ہیں جو حتمی ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر اشیاء اور مظاہر کو ہم پہچانتے ہیں مگر ان کو بیان نہیں کر پاتے مثلاً میں آپ سے پوچھوں کہ نیلاہٹ کیا ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ کہ میں اسے پہچانتا ہوں اور بآسانی اسے نشان زد کر سکتا ہوں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا آپ اسے بیان بھی کر سکتے ہیں؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ سو اصل بات یہ ہے کہ کیا آپ نے خیال، شئے یا مظہر کو پہچان لیا ہے؟ نیکی، سچائی، حسن ان میں سے کسی کی بھی حتمی تعریف ممکن نہیں لیکن پہچان بہر حال ممکن ہے، میں اپنے احباب سے یہ بات بار بار کہتا رہا ہوں کہ جس طرح آپ غزل کے ہزاروں اشعار میں سے صحیح غزلیہ شعر کو پہچان کر برملا کہہ اٹھتے ہیں کہ غزل کا شعر ہوگا اسی طرح آپ تربیت، ریاضت اور بار بار مطالعہ سے انشائیہ کو طنزیہ، مزاحیہ، فلسفیانہ، سائنسی یا دیگر وضع کے مضامین سے بآسانی الگ کر سکتے ہیں۔

اس دنیا میں ہر شئے دوسری اشیاء سے جڑی ہوئی ہے اور یہ خیال ہزاروں دیگر خیالات کی ڈور سے بندھا ہوا ہے لہٰذا جب آپ شئے یا خیال کے بارے میں کچھ لکھنے بیٹھتے

ہیں تو اردگرد کے ہزاروں پیش پا افتادہ خیالات اور پٹی پٹائی باتیں آپ کی تحریر میں شامل ہو جاتی ہیں یوں آپ کی اوریجنل سوچ کے راستے میں ایک قسم کی رکاوٹ یا Blockage نمودار ہو جاتا ہے۔ جب تک اس رکاوٹ کو دور نہ کیا جائے آپ پر موضوع کے ان چھوئے پہلو منکشف نہیں ہو سکتے۔ انشائیہ نگار کا اصل کام یہی ہے کہ وہ موضوع پر خود کو اس طور مرتکز کر لیتا ہے کہ اردگرد کے موضوعات کی مداخلت بے جا نہیں ہونے لگتی ہے پھر وہ موضوع کے ساتھ اس طرح کھیلنے لگتا ہے۔ جیسے وہ پہلی بار اس سے آشنا ہوا ہو۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو بچہ کا انداز نظر بھی انشائیہ نگار ایسا ہے کیونکہ وہ بھی اردگرد کی اشیاء اور مظاہر کو پہلی بار دیکھ رہا ہوتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ بچہ تو براہ راست مظاہر کی نیرنگی کا ادراک کرتا ہے جب کہ انشائیہ نگار پہلے موضوع سے چمٹی ہوئی پیش پا افتادہ باتوں کے چھلکے کو اتارتا ہے، پھر اس کے ان چھوئے پرتوں تک رسائی حاصل کر کے بچے ہی کی طرح حیرت زدہ ہوتا ہے یوں گویا وہ اپنے تخلیقی باطن کو برانگیخت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

آج سے کم و بیش بیس برس پہلے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا نام تھا Zen and the art of motor cycle maintenance مصنف کا نام تھا رابرٹ۔ ایم۔ پرسگ سننے میں آیا ہے کہ یہ بیسویں صدی کی چند اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسی کتاب میں ایک جگہ یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ کسی امریکی پروفیسر نے اپنی کلاس کی ایک طالبہ سے امریکہ پر مضمون لکھنے کو کہا چند روز کے بعد وہ طالبہ پروفیسر موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ وہ مضمون نہیں لکھ سکی کیونکہ اسے امریکہ کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں سوجھی جو پہلے سے معلوم نہ ہو۔ تب پروفیسر موصوف نے اس طالبہ سے کہا اچھا اگر یہ بات ہے تو تم اپنے موضوع کی طنابیں کھینچو اور امریکہ کے بجائے اپنے شہر پر مضمون لکھ لاؤ چند روز کے بعد وہ طالبہ آئی اور کہا کہ ابکی بار بھی اسے کوئی نئی بات نہیں سوجھی اس پر پروفیسر صاحب جز بز ہوئے اور طنزاً کہا اگر تم اپنے شہر پر بھی مضمون نہیں لکھ سکتیں تو شہر کے اوپیرا ہاؤس کے صدر دروازے کی طرف اپنی توجہ مرکوز کرو اور اس کے بائیں جانب کی اینٹوں کو موضوع بنا لو یہ کہہ کر پروفیسر موصوف مسکرائے اور بات آئی گئی ہو گی تاہم چند ہی روز کے بعد وہ طالبہ پانچ

ہزار الفاظ پر مشتمل ایک مضمون لکھ لائی۔ کہا کہ میں نے چند سطریں پہلی اینٹ پر مزید چند سطریں دوسری اینٹ پر لکھنے کے بعد جب تیسری اینٹ پر لکھنے کا آغاز کیا تو گویا دریا کا بندھ ٹوٹ گیا اور ان چھوٹے خیالات کے ایک سیل رواں نے آگے بڑھ کر مجھے شرابور کردیا۔ دیکھا جائے تو اس طالبہ نے وہی طریق اختیار کیا تھا جو ایک انشائیہ نگار کرتا ہے انشائیہ نگار بھی شے یا خیال کو اسکے ماحول سے کاٹ کر مقصود بالذات قرار دیتا ہے اور یوں قطرے میں دجلہ دریافت کرتا ہے، اس کام کے لئے وہ پٹے ہوئے اور پامال طریق کار کو ترک کر کے ایک نیاز اویہ نگاہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً وہ شے یا موضوع کے چھپے ہوئے پہلوؤں کو جاننے کے لئے یا تو اپنی جگہ سے سرک کر اسے دوسری جانب سے دیکھتا ہے یا پھر شے یا خیال کو اسکی متعین جگہ سے ہلا کر اس کے عقبی دیار پر ایک نظر ڈالتا ہے، دونوں باتوں کا ایک ہی مقصد ہے یعنی موضوع کے ان دیکھے پہلوؤں تک رسائی اس نکتے کو بیان کرنے کے لئے میں نے انشائیہ پر لکھے گئے اپنے مضامین میں متعدد مثالوں سے کام لیا ہے مثلاً ایک جگہ میں نے لکھا ہے کہ فرض کیجئے آپ دریا کے ایک کنارے سے اسکے دوسرے کنارے کو سال ہا سال سے دیکھتے چلے آ رہے ہیں لہٰذا یہ ایک مستقل نوعیت کی تصویر آپ کے ذہن پر مرتسم ہو چکی ہے اب آپ کسی روز دوسرے کنارے پر جا نکلیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں یا دوسرے کنارے ہی کو دیکھیں تو آپ کو ایک بالکل نیا منظر دکھائی دے گا۔ اسی طرح بچپن میں لڑکے بالے اکثر اوقات جھک کر اپنی ٹانگوں میں سے ماحول کو دیکھتے اور خوش ہوتے ہیں کہ انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا منظر بالکل بدلا ہوا دکھائی دینے لگا ہے عام زندگی میں دیکھیے کہ جب آپ کسی میدان کو ہموار سطح سے دیکھتے ہیں تو آپ کو اس کا محض ایک بُعد Dimension نظر آتا ہے لیکن اگر آپ قریبی پہاڑ پر سے اسی میدان پر نظر دوڑائیں تو آپ کو ایک اور ہی منظر دکھائی دے گا۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ اپنی مقررہ جگہ سے سرک جائیں یہی انشائیہ نگار بھی کرتا ہے۔ وہ روایت، عادت اور انا کی دیواروں کو پار کر کے جب ایک بچے کی سی حیرت آمیز حسرت کے ساتھ اپنے ماحول کو دیکھتا ہے تو اسے وہ سب کچھ نظر آ جاتا ہے جو سر پر بھاری عمامہ رکھے ناک کی سیدھ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے

والے بزرگوں کو بھی دکھائی نہیں دے سکتا۔

بات کی وضاحت کے لئے میں اُردو کے ایک انشائیہ ''آندھی'' کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں آندھی سامنے کا ایک موضوع ہے جب آپ اس پر کچھ لکھیں گے تو معلوم کوائف کا ہی سہارا لیں گے مثلاً یہ کہ جب کسی علاقے میں ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے تو اس سے ملحقہ علاقے سے جہاں ہوا کا دباو زیادہ ہو، ہوا کے تند و تیز جھونکے یا ریلے امڈ آتے ہیں اور اپنے سفر کے دوران مٹی، ریت اور جھاڑ جھنکار بھی اٹھا لاتے ہیں اسے ہم آندھی کہتے ہیں یا یہ کہ آندھی سے بہت نقصان ہوتا ہے' چھتیں اڑ جاتی ہیں' درخت گرتے اور انسان مرجاتے ہیں وغیرہ۔ اب اگر آپ آندھی سے کوئی مزاحیہ صورت حال پیش کرنے کے موڈ میں ہیں تو آپ وہی رویہ اختیار کریں گے جو برسات کے سلسلے میں نظیر اکبر آبادی نے کیا تھا اس نے برسات سے پیدا ہونے والی مضحک صورتِ حال پر نسبتاً زیادہ توجہ مبذول کی تھی اس کی نظم کا ایک بند مجھے یاد آ رہا ہے، نظیر اکبر آبادی نے لکھا تھا۔

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلنی زمین خوار — عاشق کو پر دکھائی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گلعذار — گرنے کا مکر کر کے اُچھل کود ایک بار
اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

اسی طرح جب آندھی کے موضوع پر طنزیہ یا مزیہ لہجہ ابھارنا مقصود ہو تو آپ رستم کیانی مرحوم کا تتبع کر سکتے ہیں، ایک بار جب کیانی صاحب بھکر گئے جو آندھیوں کے لئے بدنام ہے تو انہوں نے ایک جگہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بھکر کے بارے میں یہ کیسی غلط بات مشہور ہے کہ یہاں آندھیاں بہت آتی ہیں، حالانکہ میرا یہ تجربہ ہے کہ بھکر میں سال کے دوران صرف ایک بار آندھی آتی ہے جو اپریل سے شروع ہو کر اکتوبر تک جاری رہتی ہے۔

انشائیہ کا میدان طنزیہ، مزاحیہ یا معلوماتی طرز کے مضامین سے قطعاً مختلف ہے۔ چنانچہ میں نے آندھی کے موضوع پر لکھے گئے جس اُردو انشائیہ کا اوپر ذکر کیا ہے اس میں آندھی کو طنز یا مزاح کے لئے استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ آندھی کو مقصود بالذات قرار دے کر اس سے انشائی نکات پیدا کئے گئے ہیں مثلاً۔

"آندھی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ آپ کی توجہ کو بیرونی مظاہر سے ہٹا کر اندر کی روشنی پر مبذول کراتی ہے۔ یہ جو عرب، ایران، ہندوستان اور چین نے زندگی اور کائنات کے بارے میں فلسفیانہ مو شگافیاں کیں، کیا ان کا باعث ان ممالک کے لوگوں کی بعض غیر معمولی صلاحیتیں تھیں؟ ہرگز نہیں، ان کا باعث صرف یہ تھا کہ قدرت ان ممالک کو قرن با قرن تک آندھیوں سے نوازتی رہی اور اس کے باسیوں کی ظاہری آنکھوں میں خاک جھونک کر انہیں اپنے اندر کی تیرہ تار دنیا کو منور کرنے پر اکساتی رہی آندھی فطرت کی جاروب کش ہے اس کا کام تیزی اور پھرتی سے کوہ وصحرا، شہر و دیہات اور باغ وباغ کو ہر طرح کے خس و خاشاک سے پاک وصاف کرنا ہے ہمارے شہروں کے میونسپل کمشنروں کو آندھی کے طریق کار سے سبق لینا چاہئے۔

آندھی کی برکتیں ان گنت ہیں۔ آندھی کے تھپیڑے، تصنع اور فریب کے سارے پردوں کو چاک کر کے رکھ دیتے ہیں۔ سبک ساران ساحل کو شاید یہ بات پسند نہ آئے لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھیوں کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہین منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی اسکی حالت قابل رحم اور اسکی ذہنی پختگی محل نظر ہے۔"

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انشائیہ نگار نے ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر آندھی کی مخفیاتی توسیع کا اہتمام کیا ہے، آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اس کے لئے مزاح یا طنز شجر ممنوعہ نہیں ہے، اس نے انشائیہ میں بقدر ضرورت ان کو بھی برتا ہے مگر اس طور کہ نتیجے میں تبسم زیر لب نے جنم لیا ہے نہ کہ خندہ بیباک نے مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو انشائیہ کا کام موضوع پر سے متعین معانی کے میلے کچیلے پرتوں کو نوچ کر الگ کرنا تھا تا کہ نئے مفاہیم کی آمد کا راستہ ہموار ہو سکے انشائیہ "آندھی" میں یہ کام انجام دینے کی کوشش صاف نظر آتی ہے۔

اس سلسلے میں انشائیہ کو طنزیہ اور مزاحیہ سے ممیز کرنا بھی ضروری ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں طنز نگار ہمیشہ بلندی پر سے نشیب پر ایک نظر ڈالتا ہے جہاں اسے ناہمواریاں ہی ناہمواریاں نظر آتی ہیں دراصل نشیب بجائے خود ایک ناہمواری یا لڑکھڑاہٹ ہے جو زمین کی ہموار سطح سے منقطع ہونے کے باعث وجود میں آئی ہے۔ سو طنز نگار اس ناہمواری کو خندۂ استہزا میں اڑاتا ہے تاکہ سطح دوبارہ ہموار ہو جائے طنز نگار کے ہاں احساس تفاخر نمایاں اور ایذارسانی کا جذبہ غالب ہوتا ہے وہ جس چیز سے نفرت کرتا ہے اسے بیخ و بن سے اکھیڑ دینا چاہتا ہے تاکہ معاشرہ از سر نو صحت مند ہو سکے۔ دوسری طرف مزاح نگار نشیب میں خود کو کھڑا کرتا ہے یعنی خود ایک ناہمواری بن کر دوسروں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ اس پر ہنسیں جس مضمون میں طنزیہ انداز غالب اور ہنسی کے ذریعے اصلاح احوال مطلوب ہو، اسے ہم طنزیہ مضمون کہیں گے، دوسری طرف جس مضمون میں مزاحیہ انداز نمایاں اور آسودگی بہم پہنچانا مقصود نظر آتا ہو، مزاحیہ مضمون کا نام دیں گے انشائیہ ان دونوں سے مختلف چیز ہے۔ اس کا مقصد نہ تو اصلاح احوال ہے اور نہ وہ قہقہہ اگلوا کر اور یوں اندر کی خاص اسٹیم کو خارج کر کے آپ کو آسودگی یا Relief مہیا کرنے کا متمنی ہے۔ انشائیہ اسلوب کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ انشائیہ میں انشا کا عنصر بجائے خود اس بات پر دال ہے کہ انشائیہ اسلوب کی تازگی پر زور دینا چاہتا ہے اور اس کام کے لئے وہ مزاح اور اسکے اماثل کے علاوہ تشبیہ، استعارہ نیز اس سارے مواد کو بقدر ضرورت استعمال کرتا ہے جو اچھی ادبی نثر کا امتیازی وصف ہے چنانچہ آپ دیکھیں کہ انگلستان میں انگریزی زبان کی لطیف ترین کروٹوں اور کیفیتوں سے طلبہ کو آشنا کرنے کے لئے "لائٹ ایسے" یا انشائیہ کو بطور خاص نصاب میں شامل کرنے کی روش عام ہے۔ آج سے چند برس پہلے ہمارے ہاں۔ ایف۔ اے۔ کے کورس میں انشائیہ بھی شامل کر لیے گئے تھے جو ایک بہت اچھی بات تھی مگر بوجوہ اس روایت کو مستحکم ہونے سے روک دیا اور نصاب سے انشائیے حذف کر دیے گئے۔ اب جامعہ پشاور نے انشائیہ کو اعلیٰ جماعتوں کے نصاب میں شامل کر کے ایک ایسی عمدہ مثال قائم کی ہے جو دوسری یونیورسٹیوں کے لئے بھی قابل تقلید ہے۔ اس جملہ معترضہ کے لئے معذرت

خواہ ہوں مگر میں اس بات پر بہر حال زور دوں گا کہ انشائیہ وہ واحد نثری صنف ہے جو زبان کی صلاحیت کا امتحان بھی ہے اور زبان کے ارتقا کا باعث بھی ۔ یہ تو ہوئی اسلوب کی بات مزاحیہ اور طنزیہ مضامین سے انشائیہ اسلوب کے علاوہ اپنے رویہ کی بنا پر بھی مختلف ہے کیونکہ جہاں طنزیہ مضمون ایک Rod of correction بن کر ابھرتا ہے اور مزاحیہ مضمون اعصابی تسکین بذریعہ ہنسی مہیا کرتا ہے۔ وہاں انشائیہ شاعری اور افسانے کی طرح جمالیاتی چکا چوند بہم پہنچاتا ہے شاعری یا افسانے کے ذریعے ایسا کرنا آسان ہے کیونکہ ان میں سے اول الذکر جذبات اور محسوسات کے جزر و مد کا سہارا لیتا ہے جب کہ موخر الذکر کہانی کے اتار چڑھاؤ کو بروئے کار لاتا ہے مگر انشائیہ نہ تو شاعری ہے اور نہ افسانہ وہ تو غیر افسانوی نثر کو ادبی درجہ عطا کرنے کی ایک کوشش ہے ۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ کا کام مضمون کے پیکر کا شعر اور افسانے کے پیکر کا ہم پلہ بنانا ہے اور یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے، اس ضمن میں مختلف انشائیوں سے یہ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جو اپنے اندر چکا چوند پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں یعنی قاری کو معانی کی ایک عام سطح سے معانی کی لطیف تر سطح کی طرف جست بھرنے پر اکساتے ہیں۔

''سردی طبقہ نسواں سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کا سارا نظام مادری ہے۔ اس میں وہی شفقت ، خود سپردگی اور ملائمت ہے جو عام طور پر خواتین میں پائی جاتی ہے اس کے برعکس سرما کا سارا نظام پدری ہے یہ باپ کی طرح قدم قدم پر آپ کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے آپ جب ذرا اس کے وجود سے صرف نظر کرتے ہیں یہ آپ کو ڈانٹ پلاتا ہے اور کبھی کبھی ایسا سلوک کرتا ہے کہ سردی کا سارا تلطف اور مادرانہ شفقت یاد آجاتی ہے۔'' (سردی)

''شور ایک تیزابی طوفان کی طرح ہے جو سیلاب کی طرح آتا ہے اور پر امن گرد و پیش کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اس کے برعکس خاموشی اگر بتی کی خوشبو کیطرح ہے جو خود جلتی ہے لیکن دوسروں کو معطر

کر دیتی ہے۔'' (شور)

''ہمارا یہ کرۂ ارض ایک طویل عریض پلیٹ فارم ہی تو ہے جسے بنی نوع انسان نے انوکھے رنگوں ، رسیلی زبانوں ، خوبصورت نسلوں اور دلکش ثقافتوں سے مزین کیا ہوا ہے زمین پر ہی کیا موقوف یہ چاند اور لاتعداد ستارے جو خلائے بسیط میں معلق ہیں ان گنت پلیٹ فارم ہی تو ہیں ۔ زمین سے چاند کی طرف سفر کرنے کا عمل دراصل ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر قدم جمانے ہی کا عمل ہے اگر دیکھا جائے تو ہمارے جسم روح کے لئے دماغ، خیالات ، کے لئے اور لب بولوں کے لئے پلیٹ فارم ہی کا درجہ رکھتے ہیں جہاں وہ کچھ دیر قیام کرتے ہیں پھر رخصت ہو جاتے ہیں۔'' (پلیٹ فارم)

''غزل نے قصدے کی پسلی سے جنم لیا ہے۔ پسلی سے پیدا ہونا اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے نہ جانے کب سے غزل بے چاری قصیدے کی قید میں تھی بالکل جیسے داستان کی نرم و نازک شہزادی ہیبت ناک دیو کے طلسم میں گرفتار ہوگئی تھی مگر یہ قید و بند والی بات بھی شاید درست نہیں کیونکہ غزل تو قصیدہ کا اٹوٹ انگ تھی اسکی لاتعداد پسلیوں میں سے ایک پسلی تھی مگر پھر ایک روز یہ پسلی قصیدے کے ڈھانچے سے الگ ہوگئی اس نے سوچا بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہمہ وقت زمیں بوس ہوتے چلے جاؤ۔'' (غزل)

''ایک اچھی گاڑی ہر لحظہ ڈرائیور سے ہم کلام ہوتی ہے کیونکہ اس پر جو کچھ گزر رہا ہوتا ہے۔ اس پر جو کچھ گزرنے والا ہوتا ہے وہ سب کچھ باواز بلند بتا رہی ہوتی ہے صرف اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے جتنے ناز نخرے ہم نئی گاڑیوں کے اٹھاتے ہیں اگر پرانی گاڑیوں کے اٹھانے لگیں تو وہ مسلسل سڑک پر رہیں ورکشاپ نئی گاڑیوں کا نخرہ ہے اور

پرانی گاڑیوں کی مجبوری، نئی گاڑی تو خود ہم پر سوار ہوتی ہے جبکہ پرانی گاڑی پر ہم خود سوار ہوتے ہیں۔" (نئی پرانی گاڑیاں)

"انسان کتنا بھولا ہے اسے اتنا بھی علم نہیں کہ یہ سارا جہان ہوشربا اور یہ ساری خلقِ خدا اس صدائے بازگشت کا ایک روپ ہے جو صدائے کن کی صورت نمودار ہوئی تھی لیکن جو آج تک بے آواز ہے البتہ کسی روز یہ صدائے بازگشت صورِ اسرافیل بن کر پلٹے گی تو پھر شاید اسے اسکے وجود کی خبر ہو سکے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری چار دن کی زندگی فقط "کن" اور "صور" کے درمیانی وقفے کا نام ہے۔ کیا واقعی؟

(صدائے بازگشت)

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انشائیہ کا مسلک آزادہ روی ہے وہ شاہراہ پر سفر کرنے کو ناپسند کرتا ہے لہٰذا بار بار شاہراہ کو ترک کر کے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر سفر کرتا دکھائی دیتا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ اپنے عمل سے خود ہی ایک نئی پگڈنڈی تراشتا ہے۔ شاہراہ پر چلنے والوں کی نظروں میں پگڈنڈی اختیار کرنا وقت کا ضیاع ہے کیونکہ ایسا کرنے سے توجہ زندگی کے عظیم مقاصد سے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر مرکوز ہو جاتی ہے مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں اکبر اور اصغر Macro اور Micro میں حد فاصل قائم کرنا ایک بے معنی بات ہے کیونکہ یہاں جزو بھی اتنا ہی بے کراں ہے جتنا کہ کل اور معمولی شے کو بھی کسی دوسرے زاویے سے دیکھیں تو وہ غیر معمولی دکھائی دیتی ہے ہم انسانوں نے بھی اپنے تحفظ کے لئے ہر طرف قاعدوں، اصولوں، عقیدوں اور نظریوں کی دیواریں اٹھا رکھی ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں ہے مگر انشائیہ نگار کا کہنا ہے کہ اگر آپ ان دیواروں میں روزن نہیں بنائیں گے تو تازہ ہوا کی کمی کے باعث آپ کا سانس رکنے لگے گا دیکھا جائے تو انشائیہ بجائے خود ایک روزن ہے جس سے لگ کر آپ نہ صرف باہر کی تازہ ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ جس کے ذریعے آپ باہر کی وسیع و بے کنار دنیا سے بھی متعارف ہوتے ہیں۔ کسی شئے کو دیکھنا اسے اوڑھ لینے کے مترادف ہے سو جب انشائیہ

نگار روزن میں سے باہر کی دنیا کو دیکھتا ہے تو گویا اسے اوڑھ لیتا ہے یوں وہ اپنے بندی خانے سے آزادی پاتا ہے وہ نہ صرف خود آزاد ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو آزادی حاصل کرنے کا راستہ بھی دکھاتا ہے۔ اگر کوئی صنف ادب قید و بند سے رہائی کا ایسا اچھا انتظام کر سکے تو اس سے زیادہ جاندار صنف اور کیا ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ انشائیہ ایک ایسا روزن ہے جس کا رخ باہر کے علاوہ اندر کی طرف بھی ہے لہٰذا انشائیہ نہ صرف کائنات اکبر کی سیاحت کرنے میں کامیاب ہے بلکہ کائنات اصغر کی غواصی پر بھی قادر ہے دونوں صورتوں میں اسے شئے، شخصیت اور شاہراہ کی قید سے رہائی ملتی ہے۔

اوپر میں نے انشائیہ کو طنزیہ مزاحیہ مضامین سے ممیز کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں چند الفاظ میں انشائیہ اور عام مضمون کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عام مضمون سے میری مراد تنقید، تاریخ، سائنس یا سیاست کے موضوع پر لکھا گیا مضمون نہیں بلکہ عام سے غیر رسمی اور بظاہر غیر اہم موضوعات پر قلم بند کی گئی تحریر ہے۔ طنزیہ یا مزاحیہ مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا نسبتاً آسان تھا مگر غیر رسمی موضوع پر لکھے گئے مضمون کو انشائیہ سے الگ کر کے دکھانا قدرے مشکل ہے کیونکہ دونوں کا میدان ایک ہے تاہم اندازِ نظر کا فرق اتنا زیادہ ہے کہ دونوں کو ایک ہی زمرے میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے جو مضامین لکھے ان کے موضوعات تو تقریباً اسی وضع کے تھے جو انشائیہ نگار کو مرغوب ہے مگر مزاجاً یہ مضامین Essay کے تحت شمار ہو سکتے ہیں نہ کہ (Light Essay) کے تحت جن میں موضوع کو منطقی طور پر نہیں بلکہ تخلیقی طور پر اُبھارا جاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک ہی موضوع پر لکھے گئے ایک Essay اور ایک (Light Essay) کے چند اقتباسات پیش کر کے اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

منشی پریم چند نے "زمانہ" (دسمبر 1909ء) کے شمارے میں "گالیاں" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انواع و اقسام کی گالیوں کی فہرست پیش کر کے دشنام طرازی کی وبا کی مذمت کی تھی۔ اس مضمون سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"اس سے بڑھ کر ہمارے قومی کمینہ پن اور نامردی کا ثبوت نہیں

مل سکتا کہ جن گالیوں کو سن کر ہمارے خون میں جوش آجانا چاہئے ان گالیوں کو ہم دودھ کی طرح پی جاتے ہیں۔ یہ بھی قومی زبان کی ایک برکت ہے۔ قومی پستی دلوں کی عزت اور خودداری کا احساس مٹا کر آدمیوں کو بے غیرت اور بے شرم بنا دیتی ہے۔"

"غصہ میں ہم گالی بکیں، دل لگی میں ہم گالی بکیں، گالیاں بک کر زور لیاقت ہم دکھائیں گیت میں گالی ہم گائیں، زندگی کا کوئی کام اس سے خالی نہیں۔"

"حق تو یہ ہے کہ ابھی تک ہمارے رہنماؤں نے اس وبا، عام کی بیخ کنی کرنے کے لئے سرگرم کوشش نہیں کی۔ اس امر کے اعادہ کی ضرورت نہیں کہ گالیوں کا اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑتا ہے۔ گالیاں ہمارے نفس کو مشتعل کرتی ہیں اور خودداری اور پاس عزت کا احساس دلوں سے کم کرتی ہیں جو ہم کو دوسری قوموں کی نگاہوں میں وقیع بنانے کے لے ضروری ہے۔"

غور کیجئے کہ منشی پریم چند کے اس مضمون میں سرسید کی آواز کتنی صاف اور واضح سنائی دے رہی ہے، پریم چند نے موضوع کا انتہائی سنجیدگی سے منطقی انداز میں جائزہ لیا ہے اور موضوع کے بارے میں وہ سارے حقائق پیش کر دیئے ہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ گالیوں کی بیخ کنی کے لئے ایک پنج سالہ قومی منصوبہ کی بھی سفارش کر دی ہے۔ یہ تمام باتیں انشائیہ کے مزاج اور اسپرٹ کے منافی ہیں۔

منشی پریم چند نے یہ مضمون 1909ء میں لکھا تھا اس کے تقریباً ستر برس بعد اسی موضوع پر غلام جیلانی اصغر نے ایک انشائیہ لکھا اس انشائیہ سے میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں تاکہ مضمون اور انشائیہ کا فرق واضح ہو سکے۔

"گالی دینے کا یہ فائدہ ہے کہ آدمی گالی دے کر فارغ ہو جاتا ہے اور ذہنی طور پر ایک خوشگوار آسودگی محسوس کرتا ہے۔ اعصاب کا کھنچا

ؤ دور ہو جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں میں بہجت اور سرور کا عالم ہوتا ہے، پنجاب میں جو آپ کو ہشاس بشاس، مونچھیں پر وقار، پیٹ اور بڑ کیں مارتے ہوئے چہرے نظر آتے ہیں تو دراصل اس کی وجہ منہ نہار کی وہ گالی ہے جس پر تمام وید اور حکیم زور دیتے ہیں۔"

"گالی جتنی سقیم اور کمزور ہو گی گالی دینے والے کی شخصیت اتنی ہی گھٹی گھٹی ہو گی۔ گالی جتنی پروقار اور پرزور ہو گی شخصیت میں اتنا ہی وقار اور کشادگی ہو گی۔ چھوٹا آدمی ڈرے ڈرتے چھوٹی سی گالی دیتا ہے اور پھر فوراً اپنی ذات کے ڈربے میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن بڑا آدمی موٹی سی گالی کی کمند پھینک کر اسے ڈربے سے باہر کھینچ لاتا ہے۔"

"گالی دینے سے جمہوریت کو فروغ ملتا ہے۔ آمریت صرف اسی دور میں پنپ سکتی ہے جب گالیوں پر قدغن لگا دی جائے۔ اسی لئے ایک اچھے نظام میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اندر ہائیڈ پارک کی گنجائش رکھتا ہے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح جب ایک ہی موضوع کسی سنجیدہ مضمون نگار کے ہاتھوں سے نکل کر ایک آزاد طبع انشائیہ نگار کے ہاتھوں میں آیا تو اسلوب اظہار کے ساتھ ساتھ اسلوب خیال بھی تبدیل ہو گیا۔ منشی پریم چند اپنے موقوف کے سلسلے میں بے حد سنجیدہ ہیں ان کی جگہ کوئی مزاح نگار ہوتا تو انتہائی غیر سنجیدہ ہو جاتا ہے مگر انشائیہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کی ملتی ہوئی سرحد پر چہل قدمی کرتا ہے۔ یہ گویا پل صراط پر چلنے کا انداز ہے، وہ موضوع کے ساتھ گویا کھیلتا ہے، ایک ہی وقت میں موضوع کی ناہمواری کو بھی نشان زد کرتا ہے اور اس کے گہرے مفاہیم کو بھی۔ غلام جیلانی اصغر نے اپنے انشائیہ "گالی دینا" میں یہی انداز اختیار کیا ہے چنانچہ جب ہم انشائیہ پڑھ چکتے ہیں تو گالیوں کی قابل مذمت بالائی سطح اور اس کے مضحک نظام کے ساتھ ساتھ ہم پر اس کے گہرے مطالب اور نئے پرت بھی عیاں ہونے لگتے ہیں یوں ہم گالی کے روشن پہلوؤں تک رسائی پا کر اپنے پیش

پا افتادہ روایتی اصلاحی اور اخلاقی اندازِ نظر پر غور کرنے لگتے ہیں۔ انشائیہ ہنسنے ہنسانے کے عمل یا پند و نصائح کے کاروبار سے آگے کی چیز ہے جو انسانی فکر و عمل کو ایک نئے زاویئے سے دیکھتی ہے اور نتیجتاً ہمیں آگاہی کے ارفع مدارج تک لے جانے میں کامیاب ہوتی ہے۔

اُردو میں مضمون نگاری کا آغاز کرنے والوں میں سر سید احمد خاں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے مگر خود سر سید اس سلسلے میں مغرب کی مضمون نگاری سے متاثر تھے سر سید کے زمانے کی مغربی ادبیات میں مضمون نگاری نے تین واضح صورتیں اختیار کر رکھی تھیں ایک صورت تو علمی اور سائنسی یا اصلاحی مضامین کی تھی دوسری طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کی اور تیسری لائٹ ایسے کی جس میں مضمون نگار نے غیر افسانوی نثر کو ادب کی سطح تفویض کر دی تی۔ سر سید نے ان میں سے علمی اور اصلاحی طرز کو اُردو میں رائج کیا اور جہاں غیر رسمی موضوعات پر اظہار خیال کیا وہاں بھی زیادہ تر منطقی اندازہی کو اپنایا لہٰذا انہیں ہم اُردو میں لائٹ ایسے یعنی انشائیہ کا موجد یا علم بردار نہیں کہہ سکتے تاہم اُردو نثر کے فروغ کے سلسلے میں سر سید کی عطا سے انکار ممکن نہیں ہے آج اگر اُردو نثر نے اپنے علمی سائنسی اور تنقیدی نظریات کو پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے تو یہ سر سید کی اولین مساعی ہی کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف طنزیہ مزاحیہ مضامین کو اُردو میں رواج دینے کے ضمن میں زیادہ اہمیت اودھ پنچ اور اسکے معاونین کو حاصل ہے گو اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ان لوگوں نے زیادہ پھکڑ پن اور ہجویانہ اندازہی کو فروغ دیا بعد ازاں اُردو میں طنز اور مزاح ایک مثالی انداز میں نمودار ہوئے اور یہ سلسلہ ہمیں فرحت اللہ بیگ، فلک پیما، رشید احمد صدیقی، پطرس، کنہیا لال کپور اور امتیاز علی تاج سے لے کر مشتاق احمد یوسفی تک صاف دکھائی دیتا ہے۔ مضمون نگاری کی ان دونوں صورتوں کے بین بین خالص انشائیہ کی روش تھی جسے بعض ادبا نے غیر شعوری طور پر اپنانے کی کوشش تو کی مگر شاید ابھی ذریعہ اظہار یعنی اُردو نثر اس سطح پر نہیں پہنچ پائی تھی کہ انشائیہ کے لطیف نکات کو گرفت میں لے سکتی، یا شاید خود دیکھنے والوں کے ہاں ابھی انشائیہ کا مزاج واضح نہ تھا کہ انہوں نے اپنے مضامین میں یہاں وہاں انشائی نکتے تو پیدا کیے مگر کوئی مکمل انشائیہ لکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں بہت سے نام گنوائے گئے ہیں یہاں تک کہ بعض کرم فرماؤں نے ملا وجہی کو بھی نہیں

بخشا اور اس کی کئی پھٹی نثر پر بھی انشائیہ کا قشقہ لگا دیا ہے، دیگر جن لکھنے والوں کے نام لیے گئے ہیں ان میں محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ دہلوی، رتن ناتھ سرشار، وحید الدین سلیم، عبدالحلیم شرر اور ان کے بعد نیاز فتح پوری، شیخ عبدالقادر مہدی افادی، ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی، ابوالکلام آزاد اور بعض دیگر اکابرین کو خاص اہمیت حاصل ہے مگر دیکھا جائے تو ان لکھنے والوں میں بھی ناصر علی دہلوی، سجاد انصاری، خواجہ حسن نظامی اور ابوالکلام آزاد ہی وہ ادیب تھے جن کے ہاں انشائیہ کے مخصوص مزاج اور اسلوب کی طرف پیش قدمی کے شواہد ملتے ہیں، یہ وہ لوگ تھے جو انشائیہ نگار بنتے بنتے رہ گئے۔ وجوہ وہی تھیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا۔

ایک بات کا ذکر کر دوں یہ ادبا جن کا جھکاؤ لائٹ ایسے کی طرف تھا انہیں اس بات کی خبر نہیں تھی کہ وہ غیر شعوری طور پر کس سنہری چڑیا کو زیر دام لانے کے متمنی ہیں اسی طرح پاکستان کے وجود میں آنے سے ذرا قبل کرشن چندر، فلک پیما اور رشید احمد صدیقی ابھرے جن کے ہاں بھی انشائیہ نویسی کا رجحان شعوری سطح پر موجود نہیں تھا گو ان کے مضامین میں انشائی عناصر یقیناً موجود تھے اسی زمانے میں اختر اورینوی وہ پہلا ادیب تھا جس نے لوگوں کو شعوری طور پر ''لائٹ ایسے'' کے مزاج سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ اختر اورینوی نے علی اکبر قاصد کے مضامین کے مجموعے کا جو دیباچہ تحریر کیا اس میں پہلی بار نہ صرف ''لائٹ ایسے'' کے متقضیات کے بارے میں کھل کر لکھا بلکہ ''لائٹ ایسے'' کے لئے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا مگر جن مضامین (یعنی علی اکبر قاصد کے مضامین) پر اس نے لفظ انشائیہ چسپاں کرنے کی کوشش کی وہ عام سے مزاحیہ مضامین تھے جن کا انشائیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اختر اورینوی انشائیہ کے متقضیات کو پیش کرنے پر تو قادر تھا لیکن انشائیہ کو پہچاننے میں کامیاب نہ ہو سکا اس لئے اس کا تجویز کردہ لفظ انشائیہ بھی اس زمانے میں مقبول نہ ہو سکا۔

تقسیم کے فوراً بعد (بالخصوص پاکستان میں) انشائیہ نویسی کا رجحان اپنے واضح خد و خال کے ساتھ نمودار ہوا اس زمانے میں نصیر آغا، داؤد رہبر، جاوید صدیقی، ممتاز مفتی اور امجد حسین کے ایسے مضامین سامنے آئے جن میں سے بعض انشائیہ کے اولین نمونے تھے گو ان ادبا کو

اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ صنف انشائیہ میں طبع ازمائی کر رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ اپنی ترنگ میں اشیاء، تجربات اور تعقلات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے، مگر اس کے نتیجے میں ان کے ہاں جو تحریریں جنم لے رہی تھیں وہ مغرب کی مقبول صنف ادب یعنی ''لائٹ ایسے'' یا انشائیہ کے زمرے میں شامل تھیں۔ خود راقم الحروف کو اس بات کا اعتراف ہے کہ نصیر آغا کے نام سے اس کا جو پہلا انشائیہ ادبی دنیا میں چھپا تھا وہ بطور انشائیہ لکھا ہی نہیں گیا تھا البتہ اس کے تین چار برس بعد قیوم نظر کے ایما پر اس نے شعوری طور پر ایک انشائیہ بعنوان ''گرمی'' لکھا اور یہیں سے پاکستان میں انشائیہ نگاری کی ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز ہو گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گو راقم الحروف کو اس بات کا علم تھا کہ وہ ''لائٹ ایسے'' لکھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے لئے کوئی موزوں متبادل اُردو لفظ اسے سوجھا نہیں تھا چنانچہ آغاز کار میں ایسے ''لائٹ ایسے'' لطف پارہ وغیرہ الفاظ اور تراکیب رائج کرنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ انہیں دنوں ہندوستان میں فکاہی مضامین کے لئے بعض انشائیہ کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، راقم الحروف نے ''ادب لطیف'' کی معاونت سے اس لفظ کو ''لائٹ ایسے'' کے لئے استعمال کرنے کا آغاز کیا اور خوش قسمتی یہ ہوئی کہ نہ صرف اُردو انشائیہ کی تحریک کامیاب ہوئی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لفظ انشائیہ بھی مقبول ہو گیا۔

اُردو انشائیہ نگاروں کی پہلی کھیپ میں مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، جمیل آذر اور غلام جیلانی اصغر تھے ان میں مشکور حسین یاد انشائیہ شناس تو تھے مگر ایک تو وہ اصلاحی رویّے کی قدیم روایت کے تابع تھے دوسرے ان کے ہاں منطقی انداز نسبتاً نمایاں تھا مگر دوسرے انشائیہ نگاروں بالخصوص مشتاق قمر مرحوم، جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر، انور سدید، کامل القادری، اکبر حیدری، اور سلیم آغا قزلباش اور ارشد میر نے جو انشائیے لکھے وہ لائٹ ایسے کے معیار پر پورا اترتے تھے ان کے بعد لکھنے والوں کی ایک اور کھیپ سامنے آ گئی جس میں شہزاد احمد، رام لعل نابھوی، محمد اسد اللہ، حیدر قریشی، حامد برگی، انجم نیازی، بشیر صیفی، حسرت کاسگنجوی، جان کاشمیری، شمیم ترمذی، محمد اقبال انجم، خالد پرویز صدیقی، حنیف باوا، خیر الدین انصاری، محمد یونس بٹ، رشید احمد گوریجہ، مشتاق احمد، محمد ہمایوں، ناصر عباس نیر اور

دیگر بہت سے انشائیہ نگار تھے جنہوں نے اس صنف ادب میں طبع آزمائی کی اور کر رہے ہیں۔ آج اُردو انشائیہ اپنے عروج پر ہے اور ہر چند کہ اس تحریک کو اُردو ادب کا جزو بدن بنے ابھی چالیس برس سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا تاہم اس قلیل مدت میں بھی اس کے طفیل متعدد ایسے اعلا پائے کے فن پارے وجود میں آئے جنہیں ہم کامل اعتماد کے ساتھ مغرب کے بہترین لائٹ ایسیز کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ اُردو انشائیہ کی کامیابی کا ایک اہم ثبوت یہ بھی ہے کہ انشائیہ کی صنف کے خلاف بالخصوص ایک اخباری مہم چلائی گئی ہے جواب اُردو کے بعض سرکاری جریدوں میں بھی نظر آنے لگی ہے۔ کسی بھی صنف ادب کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگانا چاہئے کہ اس کے خلاف ردِعمل کی شدت کس قدر ہے۔ انشائیہ اور اُردو انشائیہ نے جو شدید ردِعمل پیدا کیا ہے وہ اب سامنے کی بات ہے تاہم اس ردِعمل میں مضمر بغض یا نفرت کی زیریں لہر کا احساس ابھی زیادہ لوگوں کو نہیں ہے مگر وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے جب ردِعمل کا یہ شخصی پہلو قاری پر عیاں ہو جائے گا۔ جب ایسا ہوا تو اُردو انشائیہ کے فروغ کے راستے میں آخری رکاوٹ بھی باقی نہیں رہے گی۔

□□□

سید محمد حسنین

ادب کی ایک خاص صنف: انشائیہ

انشائیہ نثری ادب کی ایک خاص صورت ہے۔ یہ اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب ایک مخصوص مقام کا مستحق ہے۔ ہر وہ بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، عام زبان میں ''مضمون'' موسوم کردیا جاتا ہے۔ یہ مضمون بڑا گول سا لفظ ہے۔ اس میں ویسا ہی ابہام ہے جو لفظ کہانی میں ہے۔ ہر ایسی بات جس میں کوئی قصہ بیان کیا گیا ہو، کہانی ہو جاتی ہے۔ یہ میر حسن کی سحر البیان ہو یا نذیر احمد کا ابن الوقت، سرشار کا فسانہ آزاد ہو یا امتیاز علی کی انارکلی، پریم چند کا آخری تحفہ ہو یا سردار جعفری کی نئی دنیا کو سلام۔ بنیادی طور پر یہ تحریریں کسی قصہ یا واقعہ سے متعلق ہیں۔ ان قصوں کی نوعیت گرچہ مختلف ہے مگر ان سب میں ایک بنیادی عنصر موجود ہے جو کہانی ہے۔

اس لحاظ سے ان مختلف تحریروں کو کہانی سے موسوم کرنا حق بجانب ہے۔ مگر ادب کی اصطلاح میں ایسا خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ کہانی ہوتے ہوئے بھی یہ صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ ان میں سے ہر صورت کی ایک مخصوص صنفی حیثیت ہے۔

یہی حال مضمون کا ہے۔ لفظ کہانی کی طرح یہ بھی ایک گول سا لفظ ہے۔ اس کے دائرے میں بہت سی باتوں کے سما جانے کی خاصی گنجائش ہے۔ عزیز و اقربا کے خطوط، جلسوں کی رپورٹ، ادبی اور ثقافتی تقریبات کا آنکھوں دیکھا حال، کسی دلچسپ شخصیت کا مرقع، کسی سنجیدہ امر پر فکر بخش خیالات۔ کسی بڑے آدمی کی حیات کا ایک ورق، کسی روزنامے کا اداریہ، کسی موضوع پر ذاتی تاثرات، الغرض اس نوع کی تمام باتیں، جو اختصار کے ساتھ نثر میں قلمبند کردی جائیں، بہ آسانی ''مضمون'' سے موسوم کردی جائیں۔ لیکن

ایک متعلم ادب کا ان مختلف تحریروں کو مضمون سے یاد رکھنا اس کی لاعلمی کا ثبوت ہوگا۔

انشائیہ مضمون کی ایک قسم ہے، مگر یہ وہ مضمون نہیں جس میں مراسلہ کی خیر و خیریت ملتی ہو، یا روئداد کی خشک کارروائیوں کا حال جس میں رپوتاژ کی پراثر طائرنگاہی ہوتی ہو یا خاکہ کے دلچسپ جلووں کی بوقلمونی، جس میں مقالہ کی فکر بخش بصارت ہوتی ہو، یا سوانح کی تاریخ وار مرقع نگاری جس میں روزنامچہ کے غیر متعلق بے ربط بیانات ملتے ہوں، یا اداریہ کا کسی عنوان پر مسلک کے تحت عامیانہ اظہار خیال۔ مراسلہ، روئداد، رپوتاژ، خاکہ، مقالہ، سوانح، روزنامچہ اور اداریہ وغیرہ بلاشبہ مضمون کی مختلف شکلیں کہی جاسکتی ہیں، لیکن ان میں چند شکلیں ایسی ہیں جو موضوع اور اسلوب کے بموجب اپنی خاص وضع و قطع رکھتی ہیں اور ان کی اپنی کوئی مخصوص صورت ہے۔ ایسی مخصوص صورت جس کی تعمیر یا تشکیل میں اصول، سلیقہ اور فن کا دخل ہے یا دوسرے الفاظ میں یہ ایسی صورتیں ہیں جنہیں ہم ''اصناف ادب'' کا مرتبہ دے سکتے ہیں۔ ان مضمون نما شکلوں میں انشائیہ بھی تحریر کی ایک مخصوص صورت ہے جس کا نثری ادب میں اپنا ایک صنفی مقام ہے۔ انشائیہ کو اس لئے مضمون جیسے گول لفظ سے موسوم کرنا بالکل نامناسب ہے۔ مضمون نویسی چھوٹے چھوٹے بچوں یا اسکول کے لڑکوں کا کام ہے۔ یہ شغل ادیب کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔

انشائیہ ادب کی ایک خاص صورت ہے یا صنف ہے۔ ادب کے مختلف اصناف میں اس کا رشتہ مقالہ سے قریبی ہے۔ کہانی کے اصناف یعنی داستان، ڈراما، ناول، افسانہ اور مثنوی سے اس کا واسطہ نہیں، باعتبار اس کا موازنہ مقالہ سے کیا جاسکتا ہے۔

مقالہ ادب کی وہ صنف ہے جس میں سنجیدگی، علمیت، متانت اور بصیرت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار کسی امر پر سنجیدگی سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی تیز شعاعوں سے نفسِ تحریر کے مختلف گوشے منور و نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ہم اس تحریر کو پڑھتے ہیں اور موضوع تحریر یا نفس مضمون سے اچھی خاصی واقفیت حاصل کرلیتے ہیں۔ انشائیہ نگار بھی کسی امر پر روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ روشنی رنگارنگ ہوتی ہے۔ اس میں دھندلکا اور براقی دونوں ہوتی ہے۔ یہ شعاعیں ہماری توجہ کو ایک ہی راستہ پر نہیں لگاتیں۔ بلکہ یہ اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ مقالہ پڑھنے کے بعد ہم کچھ سیکھتے ہیں یا کچھ پاتے ہیں۔ ایسی بات یا ایسا خیال جس سے ہماری علمیت میں گوناگوں اضافہ ہوتا

ہے۔جس سے ہماری شخصیت میں علم کی تابندگی آتی ہے۔انشائیہ پڑھنے کے بعد ہم کوئی گم کردہ
شے پالیتے ہیں۔ایسی شئے جو روز کی سادہ وسپاٹ زندگی میں آنکھوں سے روپوش رہتی ہے۔
جو زندگی کی ٹھوس اور نا قابل انکار حقیقتوں اور صداقتوں میں اوجھل رہتی ہے۔

آپ جانتے ہیں، یہ دنیا حیوانوں سے بھری پڑی ہے۔اس میں شیطانوں کی تعداد
بہت زیادہ ہے۔لیکن زندگی اور خوشگوار زندگی کو انسانوں کی حاجت ہے اور انسان بن کر
انسانیت کا اندازہ کرنا بڑا دشوار ہے۔یہ ہر کے بس کی بات نہیں۔انسانی قدروں کی تمیز اور
پہچان کے لئے دانائی کی ضرورت ہے اور یہ دانائی تھوڑی سی حیوانیت سے بڑے مزے میں
حاصل ہو جاتی ہے۔اس مقصد کے لئے انشائیہ بہت مفید ہے۔یہ لحہ بھر کے لئے ہمیں
حیوان بنا دیتا ہے،جس سے ہماری انسانیت میں چستی اور توانائی آجاتی ہے۔

مقالہ ہمیں سنجیدگی بخشتا ہے،اس سے ہم میں تہذیب ومتانت آتی ہے۔انشائیہ ہمیں
غیر سنجیدہ بناتا ہے۔اس سے ہم میں رندی اور آوارہ خیالی آتی ہے۔مقالوں کی سنجیدگی اور
نری سنجیدگی سے خشکی اور بے رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔اس بے کیفی یا انجماد کو انشائیہ کی آوارگی یا
بدمستی ہی دور کر سکتی ہے۔مقالوں میں معلومات کا دخل رہتا ہے اور انشائیہ میں تاثرات کا۔
مقالوں کا کام فکر بخشی یا فکر خیزی ہے اور انشائیوں کا کیف انگیزی۔

مقالہ نگار ایک معلم ادب ہوتا ہے۔اس کا کام درس وتدریس ہے۔اس کی باتیں
عالمانہ اور حکیمانہ ہوتی ہیں۔وہ سنجیدہ بات کہتا ہے اور بڑی سنجیدگی سے کہتا ہے۔اس میں
متانت کے ساتھ دیانت بھی ہوتی ہے۔اس کا شیوہ لفاظی نہیں۔وہ جو جانتا ہے کہتا ہے اور
جتنا جانتا ہے سناتا ہے۔وہ ہمیں گمراہ نہیں کرتا۔انشائیہ نگار گپ باز ہوتا ہے۔وہ غیر سنجیدہ
بات کہتا ہے اور غیر سنجیدہ طریقہ سے کہتا ہے۔وہ جتنا نہیں جانتا اس سے زیادہ سناتا ہے۔
لیکن اس کی باتیں عبث ولا حاصل بکواس نہیں۔یہ مفید اور کارآمد ہیں۔یہ ہماری فہم وادراک
کو منجمد اور سپاٹ ہونے سے بچاتی ہیں۔ان سے ہمارے طائر تخیل کو پر لگتے ہیں۔انشائیہ
نگار کی گپیں ہماری قوت تمیز کو ٹھوکریں لگاتی ہیں۔یہ ہم پر ان تازیانوں جیسا کام کرتی ہیں
جن کی نرم چوٹیں سہکر ہم زیادہ ہوشمند،زیادہ روشن خیال اور زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں۔

مقالہ اور انشائیہ دونوں نثری ادب کے اصناف ہیں۔مگر مقالوں کی روحانی تربیت

ادب سنجیدہ انجام دیتے ہیں اور جسمانی پرداخت ادب لطیف کے سپرد ہوتی ہے۔اس کے بر
خلاف انشائیوں کی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادب لطیف کے ذمہ رہتا
ہے۔ادب لطیف اور ادب سنجیدہ کا بیان ضروری ہے۔

ہر زبان وادب کے دو حصے ہوتے ہیں۔ادب لطیف اور ادب سنجیدہ،جنہیں انگریزی
میں Light Literature اور Serious Literature کہتے ہیں۔ادب لطیف میں شعری اور
نثری اصناف داخل ہیں اور ادب سنجیدہ میں علوم اور سائنس۔شاعری،داستان،ناول،ڈراما،
افسانہ،خاکہ،مقالہ،انشائیہ،رپورتاژ وغیرہ ادب لطیف کی مختلف صورتیں ہیں۔عمرانیات،
اخلاقیات،معاشیات،نفسیات،فلسفہ وتاریخ وغیرہ کا تعلق علوم سے ہے اور طبیعات،
کیمیات،فلکیات،نباتیات حیاتیات وغیرہ کا سائنس سے۔یہ سارے مضامین اپنی سنجیدگی
اور سنجیدہ بیانی کے بموجب ادب سنجیدہ میں شمار ہوتے ہیں۔ادب لطیف،ادب کا وہ حصہ
ہے جس میں علوم وسائنس کا گزر نہیں۔یہ انسان،مہذب ومتمدن انسان کی وہ حسی وذہنی
تحریری کاوشیں ہیں جو تاثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔جن میں نہ علوم وسائنس جیسی سنجیدگی ہوتی
ہے اور نہ ان کی جیسی خشک بیانی۔یہ باتیں لطیف ونازک ہوتی ہیں اور یہ ہمارے دل ودماغ
سے سنجیدگی کی طالب نہیں ہوتیں۔یہ براہ راست ہمارے احساس کو چھوتی ہیں اور ہمیں نت
نئے کوائف سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔

ادب

ادب لطیف		ادب سنجیدہ	
شعری اصناف مثلاً	نثری اصناف مثلاً	علوم مثلاً:	سائنس مثلاً:
غزل	داستان	عمرانیات	طبیعیات
قصیدہ	ڈراما	معاشیات	کیمیات
مثنوی	ناول	اخلاقیات	نباتیات
رباعی	افسانہ	فلسفہ	حیاتیات
گیت وغیرہ	مقالہ	منطق	وغیرہ
	سوانح وغیرہ	تاریخ وغیرہ	

میں نے کہا ہے کہ ادب لطیف کسی ادب کا ایک حصہ ہے، یہ تحریر کی کوئی خاص صورت نہیں۔ لیکن عام طور پر اسے ایسا نہیں سمجھا جاتا۔ ادب لطیف سے مراد ایک خاص رنگ اور لب ولہجہ کی تحریر لی جاتی ہے جو "نیازیت" یا "ٹیگوریت" کے مثل ہوتی ہیں۔ یہ وہ شاعری ہے جو اپنی ساری جمالیاتی قدروں کے ساتھ نثر میں قلمبند کی جاتی ہے۔ یہ کسی شدید داخلی پر ازہیجان کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے۔ روح اور قالب یعنی موضوع اور اسلوب دونوں لحاظ سے یہ تحریریں بے حد رومانی ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ میں اس نوع کی تحریریں ہمارے ادب میں بڑی مقبول تھیں اور یہ انشائے لطیف یا ادب لطیف جیسے ناموں سے معروف تھیں۔

بلاشبہ یہ تحریریں اپنے مخصوص لب ولہجہ اور رنگ وآہنگ کے بموجب اپنی ایک خاص شکل یا صورت رکھتی ہیں۔ مگر یہ تحریریں اگر صنفی لحاظ سے ادب میں ان کو کوئی مقام دیا جاسکتا ہے، بے نام ونشان رہیں۔ دیگر اصناف ادب مختلف ناموں سے نامزد ہوئے پر ان کا کوئی نام نہ پڑسکا۔ اپنے نومشق قلم کاروں کے ہاتھوں یہ بدنام رہیں اور گمنام مریں۔ آسانی کے لئے ان تحریروں کو ہم کیفیہ کہہ سکتے ہیں۔ اکبر حیدری کی 'کیفستان'، حجاب اسماعیل کی 'نغمات موت' اور آصف علی کی ابر چھائیاں اور اس کا دوسرا رخ' ان تصنیفات میں ہیں جو کیفیہ کی مثال ہیں۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کیفیہ وہ خوش رنگ پھل تھا جو پکنے سے پہلے سڑ گیا۔

تو، کیفیہ کو ادب لطیف سے موسوم کرنا حماقت ہے۔ اس وقت یہ ایسی ہی مضحکہ خیز بات ہے، جس طرح نظموں یعنی Poetry کو Poems سے موسوم کرنا۔ شاعری کسی ادب کا ایک پہلو یا حصہ ہے اور اس حصہ میں کئی شعری صورتیں ہیں، جن میں نظم ایک مخصوص صورت ہے۔ اسی طرح ہر مہذب ومتمدن قوم جو اپنا ایک لسانی وجود رکھتی ہے، اس کا اپنا ایک قومی ادب ہوتا ہے۔ اس ادب کی دو شاخیں ہوتی ہیں، ادب لطیف اور ادب سنجیدہ۔

ادب لطیف میں وہ تمام شعری اور نثری تحریریں داخل ہیں جو تاثرات کا حاصل ہیں۔ جن میں احساسات، جذبات وتخیلات کی کارفرمائی ہے اور جو تجربہ ومشاہدہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ تحریریں اپنی مخصوص وضع وقطع یا صورت رکھتی ہیں اور ہم انہیں اصناف یعنی (Literary Forms) کے نام سے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔ ان ہی اصناف میں ایک صورت ان رومانی تحریروں کی ہے جنہیں میں نے کیفیہ کا نام دیا ہے اور جو نثر کی شاعری ہے۔ ادب

لطیف سے مراد صنف کیفیہ نہیں، بلکہ زبان ادب کا وہ حصہ جس کا دوسرا حصہ ادب سنجیدہ ہے۔ جس کی دو شاخیں نثر اور شاعری ہیں اور جس میں کئی نثری اور شعری اصناف داخل ہیں۔

تو، مقالہ اور انشائیہ کا موازنہ کرتے ہوئے میں نے کہا ہے کہ مقالوں کی تربیت ادب سنجیدہ انجام دیتے ہیں اور جسمانی پرداخت ادب لطیف کے سپرد ہوتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ مقالوں میں روح ادب سنجیدہ سے آتی ہے اور قالب کی مٹی ادب لطیف سے لائی جاتی ہے اس بات کو اس طرح سمجھئے۔

مقالہ میں کسی سنجیدہ بات یا خیال پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ یہ حکمت وفلسفہ یا علم ودانش اور سائنس کے کسی پہلو یا رخ پر سیر حاصل بحث کرتا ہے۔ اس کے دائرے میں ادب سنجیدہ کے عالمانہ، حکیمانہ امور کے لئے پوری گنجائش ہے۔ یہ باتیں یا اس نوع کی باتیں بڑی اہم ہیں۔ ان سے ہماری شناسائی ضروری ہے۔ ان کی بے کیفی، خشکی یا دشوار فہمی کا اندازہ کرتے ہوئے ہم ان سے گریز نہیں کرسکتے۔ آپ اس سے اتفاق نہیں کرسکتے۔ آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ علوم اور سائنس سے ہماری لاعلمی ہمارے عقل وادراک کو فنا کر ڈالے گی۔ ایک تعلیم یافتہ شخص ان سے بے تعلق ہو کر وقت اور زمانہ، زمانہ کی رفتار وترقی سے یقیناً بے تعلق ہوجائے گا۔ مقالے اچھے اور مفید مقالے اس اہم مقصد میں ہمارے بڑے کام آتے ہیں۔ یہ ہمیں وقت اور زمانہ، زمانہ کی رفتار وترقی کے ساتھ لے چلتے ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات اچھی طرح روشن ہوجائے گی۔

آج روس کا اسپوٹ نک انسان کی ذہنی کاوش کا ایک سب سے حیرت ناک اور جیتا جاگتا کرشمہ نظر آتا ہے۔ ہم سے سیکڑوں میل کی بلندی پر کرہ ارض اور قمر کے درمیان نیلگوں خلا کے درمیان انسان کا بنایا ہوا چند انچ کا یہ ننھا سا مصنوعی چاند قدرت کے ٹھہرائے ہوئے دیگر اجسام فلکی کی طرح اپنے مدار پر گردش کرتا رہا ہے۔ کتنی استعجاب انگیز اور عقل میں نہ سمانے والی بات ہے یہ!

لیکن یہ بات ایک ٹھوس حقیقت ہے اور عقل کو اسے سمجھنا ضروری ہے۔ ہم روس کے اسپٹنک کو ماہ نخشب یا جام جمشید جیسی تخیلی پیداوار قرار نہیں دے سکتے۔ ایسا خیال کرنا ہماری جہالت کی دلیل ہوگی۔ انسانی دماغ اس حیرت ناک ایجاد کو سوچ سوچ کر حیرت اور

استعجاب میں غوطے لگا رہا ہے۔ انسان کی پھٹی پھٹی نگاہیں خاص مصنوعی چاند کی ایک جھلک لینے کو نہ جانے کتنی بار آسمان پر بے تابانہ اٹھی ہیں۔ ہمارا ہوش مند دماغ اس عینی صداقت کو سمجھنے کے لئے پریشان اور بے کار رہا ہے۔

یہ کیسا چاند ہے؟ کس طرح یہ گردش کر رہا ہے؟ کون سی طاقت نے اسے سطح زمین سے سینکڑوں میل کی اونچائی پر پہونچا دیا؟ اس میں ایک ذی حیات مخلوق کیونکر زندہ رہی؟ بینائی سے روپوش ہو کر بھی کیونکر یہ انسانی قوتِ مشاہدہ سے روپوش نہ ہو سکا؟ کی قسم کے سوالات عقل میں نہ سمانے والے بے شمار سوالات ہمارے دماغ میں چکر لگا رہے ہیں۔

ایسے موقع پر ایک سادہ سا علمی مقالہ ہماری آسودگی کا سبب ہوتا ہے۔ طبعیات، فلکیات اور دیگر متعلقہ سنجیدہ اور سائنٹفک مضامین کے پس منظر میں اس موضوع پر ایک مختصر سی تحریر انسان کے بنائے ہوئے اس مصنوعی چاند کے تعارف کے لئے کافی ہوگی۔ اس تحریر کے مطالعہ سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب مل جانا یقینی ہے۔ اسپٹنک پر ایک اچھا سا معلوماتی مقالہ ہمارے دماغ کی ایک تہہ کھول دینے کی طاقت رکھتا ہے۔

آپ خود غور کریں، اس نوع کی تحریر ہمارے لئے کتنی مفید ثابت ہوگی۔ ایک نا قابل فہم اور دشوار بات، جو بے حد سنجیدہ ہے، سنجیدگی کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ یہی سنجیدگی مقالہ کی روح ہوتی ہے۔ مقالوں میں یہ روح ادب سنجیدہ سے آتی ہے ادب سنجیدہ ہی مقالوں کے نفس میں حرارت دیتے ہیں، ہاں، ان کے قالب کی مٹی ادب لطیف سے لائی جاتی ہے۔

مقالوں میں حکمت و فلسفہ، علم و دانش یا سائنس کی باتیں سپرد قلم کی جاتی ہیں۔ مگر اس میں عالم حکیم یا سائنٹسٹ کی روش نہیں اختیار کی جاتی۔ مقالوں کا انداز بیان دشوار اور نا قابل فہم نہیں ہوتا۔ یہاں باتیں علوم و سائنس کے عجیب در عجیب اشارات اور وضع و مصطلحات کے بل بوتے پر نہیں چلتیں، بلکہ یہ ادب لطیف کا سہارا لے کر قدم بڑھاتی ہیں۔ ان کی بے کیفی، خشکی اور سنجیدہ بیانی پر مجاز و تمثیل کا ہلکا سا چھڑکاؤ کر دیا جاتا ہے۔ ان چھینٹوں سے تحریر میں تر و تازگی، فرحت اور پذیرائی آ جاتی ہے۔ یہ مقالوں کی زبان اور اسلوب کا سبب ہے کہ ان دشوار و ادق باتوں کو بلا درد سر ہم ذہنی طور پر بڑے مزے میں قبول کر لیتے ہیں۔

یہ مثال ایک علمی مقالہ کی تھی جس کی روح سائنس کے چند اونچے نکات سے معمور تھی۔ اسی طرح دیگر سنجیدہ امور بھی مقالوں کا موضوع ہو سکتے ہیں۔ یہ ملک کا دوسرا پنجسالہ پلان ہو یا کالجوں میں جنسی تعلیم کی اہمیت، ڈی وی سی کے زرعی امکانات ہوں یا نظریۂ حیات بعد الموت، نالندہ کی ثقافتی زندگی کا ایک رخ ہو یا اشتراکیت میں انفرادی آزادی۔ یہ یا اس قسم کی کوئی بات مقالوں کا موضوع ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ادب، فن، شاعری اور تنقید جیسے ادبی امور بھی بہ خوبی مقالوں میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک ذی علم اہل قلم ان عنوانات پر سیر حاصل بحث کر سکتا ہے۔ ذی علم سے مراد خواندہ محض نہیں بلکہ ایسا شخص جس کی ان دشوار اور ادق باتوں پر اچھی خاصی نگاہ ہے اور جس کا اپنا مطالعہ ہے۔ اس کے مطالعہ میں جس قدر گہرائی اور وسعت ہوگی، اسی قدر مقالہ میں وزن اور پایداری ہوگی۔

اچھے مقالہ نگار کی لئے دو شرائط ضروری ہیں۔ اس کی عالمانہ شخصیت اور ادبی مزاج۔ اگر وہ کسی بات کو اچھی طرح جانتا ہے اور سمجھتا ہے اور اسے دوسروں کو بھی اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔ بڑے اور فاضل مقالہ نگار کی شخصیت کا پہلا رخ عالم کا ہوتا ہے اور دوسرا انشاء پرواز کا وہ صرف بلند و اعلیٰ اور اہم و ادق سنجیدہ بات ہی نہیں کہتا، بلکہ اسے عام فہم اور دل نشین انداز سے قابل قبول بنا کر کہتا ہے۔

انشائیہ نگار کا دماغ اور زبان دونوں شاعری کی ہوتی ہے۔ یہ عارف عرش نشین ہی نہیں ہوتا بلکہ ساقی محفل خاص ہوتا ہے اس کی شریعت اور طریقت دونوں کا حساب کتاب ادب لطیف کے ذمہ ہوتا ہے۔ وہ ادب لطیف کی خاک سے ہوتا ہے اور اسی کی خاک اڑاتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ ادب سنجیدہ کی سرحد اس کے لئے آؤٹ آف بونڈ ہوتی ہے۔ یا فلسفہ و حکمت اور سائنس کے پاس اس کا پھٹکنا بھی محال ہے۔ وہ زبان و ادب کے ہر حصہ میں داخل ہو سکتا ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں جا سکتا ہے۔ اس کے لئے روک ٹوک نہیں۔ وہ آزاد و خود مختار ہے۔ ہاں، ان مقامات میں اس کے لئے ٹھہرنا دشوار ہے۔ وہ صرف ان کی جھلکیاں لے سکتا ہے۔ اس کا ادب و سنجیدہ کے صدائق و حقائق سے ہمکنار ہونا

ناممکن ہے۔ انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی پابندی نہیں "He can catch hold of any thing and can make something out of nothing" چلتی پھرتی زندگی کی ہر بات، ہر ادا اور ہر کیفیت اس کی زد میں آسکتی ہے۔ اپنی افتادِ طبع اور ندرتِ بیانی سے وہ ہر بے بات کی بات میں ''کچھ بات'' پیدا کر دے سکتا ہے۔ آپ کہیں گے، کچھ بات پیدا کر دینا ایک اچھے صحیفہ نگار کے لئے بھی کوئی دشوار بات نہیں۔

مجھے آپ سے اتفاق ہے۔ بے بات کی بات پیدا کر دینا یا بات کا بتنگڑ بنا دینا، صحیفہ نگاری کا ایک وصف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ صحیفہ نگار بھی موضوع کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ بھی ہر عنوان پر قلم اٹھا سکتا ہے اور بڑے اطمینان واعتماد کے ساتھ کسی موضوع پر موثر انداز میں بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ نگار کی طرح وہ بھی یقیناً آزاد ہے۔

مگر دونوں میں فرق ہے اور بنیادی فرق ہے۔ انشائیہ نگار کا ضمیر پاک ہوتا ہے۔ صحیفہ نگار کے یہاں یہ طہارت نفس ممکن نہیں۔ اس کی تحریروں پر ایک چھاپ ہوتی ہے جو کسی مسلک یا پالیسی کی چھاپ ہے۔ یہ چھاپ ہلکی ہوتی ہے اور اثر بخش۔ اداریے اور شذرات میں دوسروں کو ہم خیال وہم مشرب بنانے کی اچھی صلاحیت ہوتی ہے۔ انشائیہ میں یہ وصف نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار کا اپنا کوئی سوچا سمجھا مسلک نہیں ہوتا۔ یہ کسی پالیسی کا اسیر نہیں یہ بالکل آزاد رہتا ہے اور خود مختار۔ اس کی قلم کاری پر کوئی سینسر نہیں۔ صحیفہ نگار کی باتوں میں سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی ہوتی ہے۔ مگر یہ باتیں عامیانہ اور سطحی ہوتی ہیں۔ ان میں مقالات جیسی گہرائی یا پائیداری نہیں ہوتی۔ اچھا صحیفہ نگار جیک آف آل ہوتا ہے، ماسٹر آف آل نہیں ہوتا۔ اچھا مقالہ نگار ماسٹر آف آل ہوتا ہے جیک آف آل نہیں ہوتا۔ یہ کنواں جیسا گہرا ہوتا ہے، پھیلا ہوا پانی نہیں ہوتا۔ انشائیہ نگار بھی جیک آف آل ہوتا ہے۔ یہ بھی ہر عنوان پر قلم اُٹھا سکتا ہے مگر اس کی باتوں میں نہ گہرائی ہوتی ہے اور نہ پر گوئی۔ اچھا انشائیہ نگار ایک بہتا ہوا دھارا ہے، رواں، دواں اور جولاں۔

صحیفہ نگار بھی مقالہ نگار کی طرح دعوتِ فکر دیتا ہے۔ مگر اس کی باتوں میں کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان میں دینے کے ساتھ لینے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ صحیفہ نگار بے

غرض و بے مطلب قلم نہیں اٹھاتا اور نہ دیانت کے ساتھ قلم چلاتا ہے۔ یہ اپنے کام کی بات لکھتا ہے۔ یہ باتوں میں کتر بیونت کو جائز اور خورد و برد کو روا قرار دیتا ہے۔ اس کے بر خلاف مقالہ نگار کو دیانت سے واسطہ رکھنا ہوتا ہے۔ اغماز اس کی عادت نہیں۔ انشائیہ نگار ہمیں دیتا ہے۔ ہم سے کچھ مانگتا نہیں اس کی باتوں میں سوال یا طلب کا لہجہ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیں آسودگی اور راحت بخشتا ہے۔

الغرض، انشائیہ نگار کے لئے موضوع کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ بالکل آزاد و خود مختار ہوتا ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں وہ ہر جگہ جا سکتا ہے اور سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ شرط کیف واثر ہے، کیونکہ بات کا بتنگڑ بنانا اس کا کام نہیں۔ اسے دل سے سروکار رکھنا پڑتا ہے۔ دماغ یا 'دماغ والوں' سے نہیں۔ وہ کوائف بخشتا ہے، افکار نہیں دیتا۔ وہ گپ کرتا ہے، درس نہیں دیتا ہے۔ وہ دل بہلاتا ہے مسلک وآئین کی تبلیغ نہیں کرتا۔ اس کا کام خوش گفتاری ہے۔ اس کا طائر آزاد و پرفشاں رہتا ہے۔

سنجیدہ بات کو غیر سنجیدہ کر دینا اور غیر سنجیدہ بنا دینا، معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا، انشائیہ نگار کی نیرنگئی نظر کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ پارلیمنٹ کو ارہر کا کھیت بنا سکتا ہے اور کتوں کی نواہائے سمع خراش کو طرحی غزلیں۔ وہ اسپتنک کو محبوبۂ تقویٰ شکن کی ڈولی بنا سکتا ہے اور خوش نصیب لائیکا کو جنرل ڈی گاؤلے۔

انشائیہ کی شریعت میں ''کہانی پن'' کفر ہے۔ ادب لطیف سے متعلق ہوتے ہوئے بھی یہ صنف فسانوی اصناف سے بے تعلق ہے۔ پلاٹ اور کردار جیسے اجزائے ترکیبی کا استعمال انشائیہ میں ممنوع ہے۔ داستان، ناول، ڈراما، افسانہ اور مثنوی کی تعمیر ماجرا نگاری اور سیرت نگاری کی حاجتمند ہے، مگر اس صنف میں ان کا استعمال ناجائز ہے۔

انشائیہ نگار قصہ گوئی نہیں کرتا۔ یہ کوئی دلچسپ یا غیر معمولی واقعہ نہیں سناتا، اس مقصد کے لئے ناول، داستان اور ڈراما جیسے اصناف موزوں ہیں۔ وہ واقعہ کے ٹکڑوں سے جنہیں محاضرات یعنی Anecdotes کہتے ہیں کام لے سکتا ہے۔ مگر ان کے استعمال سے وہ تعمیر قصہ نہیں کرتا، بلکہ باتوں کے انتشار میں اضافہ کر دیتا ہے۔ محاضرات کے پیچھے جو نوع درنوع ہلکے پھلکے اثرات ہوتے ہیں، ان کے مصرف سے انشائیہ کی رنگا رنگی میں تیزی پیدا کر دی جاتی

ہے۔لطیفوں اور چٹکلوں سے اس میں نکھار آ جاتا ہے۔انشائیہ بذات خود لطیفہ یا چٹکلہ نہیں۔

اسی طرح اس صنف میں سیرت نگاری کا بھی گزر نہیں۔ تخلیقی شخصیت یا مرقع نگاری انشائیہ نگار کا کام نہیں ۔ اس مقصد کے لئے ہمارے سامنے خاکہ نگاری کی ذات آتی ہے۔ انشائیہ میں شخصیت یا انفرادیت کے نقوش اور جلوؤں سے کام نکالا جاسکتا ہے، مگر انہیں مرکزی مقام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ یہ نقوش اور جلوے ذیلی رہتے ہیں۔ انشائیہ میں ان کا امتیازی وجود نہیں ہوتا۔

بات یہ ہے کہ افسانوی اصناف میں کوئی مادہ یا جنوبی خیال ہوتا ہے جسے Theme کہتے ہیں۔ ہر افسانہ، ناول، ڈراما یا مثنوی میں کسی نہ کسی بنیادی خیال، ان اصناف کے موضوع اور اسلوب کے بموجب ان کی صنفی صورت قایم کرتا ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ واقعہ نگاری یا سیرت نگاری ایک یکائی ہوتی ہے۔جن تحریروں میں کوئی واقعہ یا سیرت پیش کی جاتی ہے، ان میں ایک داخلی رشتہ ہوتا ہے۔لیکن انشائیہ میں یہ یکائی یا داخلی رشتہ یا بنیادی خیال نہیں ہوتا۔انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس کی کامیابی کا سبب تاثرات کی وحدت واتحاد نہیں، ان کی بوقلمونی ہے۔

باتوں کے ربط، ترتیب اور اتفاق سے افسانوی اصناف کو مجموعی طور پر ایک بھرپور، منظم اور مکمل صورت مل جاتی ہے، مگر صنف انشائیہ کی دلکشی کی اصل وجہ اس کی بے ربطی و بے ترتیبی ہے۔اچھا اور نفیس انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے، جس کی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے۔ہم اسے ادب کی پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔

انشائیہ میں داخلیت یعنی (Subjectivity) ہوتی ہے جو قلم کار کے اپنے تاثرات کو پیش کرتی ہے۔یہ داخلیت مگر مجرد نہیں ہوتی۔ یہ خارجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی ہے۔اس کی ادائی کے لئے وہ صرف اپنے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترتا، بلکہ پرائے دل دماغ کے پاس بھی جا پہنچتا ہے۔اس کی باتیں رنگارنگ ہوتی ہیں۔یہ ذاتی ہوتی ہوئی بھی ہمہ گیر ہوتی ہیں۔ان میں داخلی تاثرات اور خارجی بیانات کا بڑا خوشگوار امتزاج ہوتا ہے۔

داخلیت کیفیہ میں بھی ملتی ہے، مگر یہ تیز اور براق ہوتی ہے۔ یہ براہ راست قلب تک

اتر جاتی ہے اور روح میں ایک لذت آگیں اضطراب اور لطیف کسک پیدا کردیتی ہے۔ انشائیہ کی داخلیت صرف دل کو نہیں چھیڑتی بلکہ دماغ کو بھی قلابازیاں کھلاتی ہے۔انشائیہ اور کیفیہ دونوں اصناف اپنی نوعیت کے بموجب تاثراتی ہوتے ہیں۔لیکن اول الذکر میں دھوپ چھاؤں کی بہار رہتی ہے اور لیل ونہار کا لطف بھی۔ ثانی الذکر میں سپیدۂ سحر کا سماں رہتا ہے یا تاروں کی تنک تابی۔

کیفیہ میں ایک ہی ذائقہ ملتا ہے مگر انشائیہ سے وہ خمار میسر ہوتا ہے جس کی لہریں چڑھتی اور اترتی رہتی ہیں — کیفیہ نثر کی شاعری ہوتی ہے جس میں انگریزی صنف شاعری (Ballad) جیسی بات ہوتی ہے۔انشائیہ نثر کی غزل ہے، جس کا ہر جرعہ ایک نیا کیف وسرور بخشتا ہے۔

اس صنف کو مزاح نگاری سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔مگر انشائیہ نگاری کو مزاح نگاری قرار دینا بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔مزاح نگاری، ہجو نگاری، المیہ نگاری یا رومان نگاری قلم کار کی کاوش کے مختلف رنگ ہیں۔ یہ قلم کاری کی ادائیں ہیں، تحریر کی صورتیں نہیں۔ادبی نگارشات میں ان کا وجود توصیفی ہوتا ہے، صنفی نہیں۔

تحریروں کا اپنے موضوع اور اسلوب کے بموجب کوئی خاص صورت اختیار کرلینا ایک اور بات ہے اور ان میں کسی خاص رنگ کا پایا جانا اور بات ہے۔ادبی تحریروں کو ہمیں صنفی لحاظ سے دیکھنا چاہئے اور "ادب پارہ" اصناف ادب سمجھ کر جانچنا اور پرکھنا چاہئے۔تحریروں کی ادبی شناخت کی یہ پہلی منزل ہے، افسوس ہے اگر ہم اس بنیادی بات سے بھی لاعلم ہیں۔

مزاح نگاری ایک رنگ ہے، صنف نہیں۔یہ قلم کار کی کاوش کی ایک خصوصیت ہے، ادب پارہ نہیں۔ یہ رنگ وصف نثری اصناف میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے اور شعری اصناف میں بھی — صنف انشائیہ میں دو قسم کے رنگ استعمال کئے جاتے ہیں، ظرافت اور طنز، اس میں درد والم اور حزن ویاس کا استعمال جائز نہیں۔ یہ رنگ صنف کیفیہ کے لئے موزوں ہیں۔

انشائیہ نگاری کے لئے ظرافت نگاری لازمی ہے۔ ظرافت اس کا ایک شوخ اور چمکیلا رنگ ہے۔اس کی زعفران زار سرزمین میں ہنسنے اور ہنسانے کے خواب مواقع ملتے

ہیں۔ دوسروں پر ہنسنا بڑا عام ہے مگر اپنے پر دوسروں کو ہنسانا آسان نہیں۔ اس کے لئے ہمت اور تھوڑی سی قربانی کی ضرورت ہے۔ انشائیہ کی نیرنگی دوسروں کی حماقت اور اپنی خفت دونوں کا مظاہرہ کرتی ہے۔ بیک نگاہ یہاں آنکھوں کے تنکوں کے ساتھ بڑی بڑی شہتیریں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ اچھے انشائیہ سے اصلی ہنسی اور کھسیانی ہنسی دونوں میسر ہوتی ہیں۔

ظرافت اور طنز سے انشائیہ کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ یہ انشائیہ کے وہ رنگ ہیں جن سے اس کی فضا میں دھول کھیلی برپا ہوجاتی ہے۔ یہ دھول خیالات سے اڑائی جاتی ہے۔ یہ دھول دھپا کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ظرافت کے لئے بالغ ذہن، نفیس طبیعت اور شائستہ مزاج کا ہونا شرط ہے ورنہ ظرافت میں بھانڈپن اور سوقیت پیدا ہوجائے گی۔ نفیس ظرافت نامطابق خیالات سے پیدا کی جاتی ہے، نامطابق واقعات سے نہیں پیدا کی جاتی۔ انشائیہ لمحہ بھر کے لئے ہمیں حیوان بنادیتا ہے، یہ بالکل صحیح ہے مگر سینگ لگا کر لاتیں چلانی قابل تعریف نہیں بلکہ سینگوں کے بغیر بیل بن جانا یا بنا دینا قابل تعریف ہے۔ اچھے انشائیوں میں ظرافت کے رنگ پختہ اور دوررس ہوتے ہیں۔ یہ بلند پایہ ہوتے ہیں اور ایسے اعلیٰ اور لطیف کہ ہنستے ہنستے ہم کھسیانی ہنسی ہنسنے لگتے ہیں۔

ایک جملے میں انشائیہ کی تعریف مشکل ہے۔ صنفی اور فنی لحاظ سے ہمارے یہاں یہ ''ادب پارہ'' نیا ہے اور قابل تعارف۔ انگریزی ادب میں یہ معروف عام ہے۔ انگریزی تعریفوں میں جانسن کا فقرہ بہت موزوں ہے۔ وہ کہتا ہے "it is a loose sally of mind" یعنی انشائیہ دماغ کی ایک ترنگ ہے، آزاد و خوشگوار ــــ لفظ ''ترنگ'' انشائیہ کی روح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ روح جس میں جولانی ہے مگر گرمی نہیں۔ جس میں انتشار ہے مگر پراگندگی نہیں۔ وہ روح جو دماغ سے زیادہ دل کو چھیڑتی ہے۔

انشائیہ کسی عنوان پر قلم کار کی گپ ہے۔ یہ گپ سنی سنائی نہیں ہوتی، یہ ذاتی ہوتی ہے۔ اس میں آپ بیتی اور پرائی بیتی دونوں کا لطف ہوتا ہے۔ یہ ذہنی لہروں کی پیداوار ہے۔ اچھا اور کامیاب انشائیہ ذہن کا ایک شرارہ ہوتا ہے جس کی ہر چنگاری آزاد و منتشر ہوتی ہے۔ ہم اسے ادب کی ایک پھلجھڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔

□□□

سلام سندیلوی

انشائیہ کا مطالعہ

انشائیہ کی اہمیت

دنیائے ادب میں انشائیہ کی بہت اہمیت ہے۔ موجودہ دور میں جس طرح افسانہ کی مقبولیت اس کے اختصار کی بنیا پر ناول اور ڈراما سے زیادہ ہے، اسی طرح انشائیہ کی مقبولیت بھی مضمون اور مقالہ کی بہ نسبت زیادہ ہے، اس کی وجہ بھی انشائیہ کا اختصار ہے۔ موجودہ عہد میں زندگی کی پیچیدگیاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں اور ہمارے سامنے نئے نئے مسائل سنگ وکوہ بن کر حائل ہورہے ہیں۔ ایسی صورت میں انشائیہ اظہار جذبات کا بہترین آلہ ہے۔ اول تو انشائیہ کو کم وقت میں ہم مکمل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ مختصر ہوتا ہے اس کے علاوہ اس میں زیادہ عرق فشانی کی بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ انشائیہ ایک ہلکی پھلکی صنف ہے۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انشائیہ ایک ہلکی پھلکی صنف ہے۔ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انشائیہ ہم کو چند لمحات کے لئے دنیاوی تفکر سے نجات دیتا ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کی جمالیاتی موجوں میں کھو کر اپنے غم کو بھلادیتے ہیں۔

انشائیہ اس قدر مفید ہوتے ہوئے بھی ابھی تک اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ اول تو موجودہ دور میں انفرادیت کی وقعت کم ہوگئی ہے اور اجتماعیت کا زور بڑھ گیا ہے اور انشائیہ انفردیت کے اظہار کا ایک آلہ ہے۔ اس کے علاوہ صحافت کی ترقی نے بھی انشائیہ کی مقبولیت کو صدمہ پہنچایا ہے۔ پھر بھی یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر انشائیہ نگاری سے صحیح طور پر کام لیا گیا تو وہ ترقی بھی کرسکتی ہے اور ہمارے لئے مفید بھی ثابت ہوسکتی ہے۔

انشائیہ کی تعریف

انشائیہ کا مفہوم اُردو ادب میں تقریباً وہی ہے جو انگریزی میں Essay کا ہے لغوی اعتبار سے Essay کا مفہوم ہے کسی موضوع کے لئے کوشش کرنا۔ اس کا مقصد مکمل اور جامع تفتیش نہیں ہے بلکہ زندگی کے کسی پہلو کے چند نقوش کو ابھارنا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لوگ انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید میں فرق نہیں کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر اور اصولی اعتبار سے یہ سخت غلطی ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کے مقاصد الگ الگ ہیں اور ہر ایک کے حدود جدا جدا ہیں لہٰذا ان کو آپس میں خلط ملط کرنا مناسب نہیں ہے۔ ذیل کے سطور میں انشائیہ، مضمون، مقالہ اور تنقید کے فرق کو سرسری طور پر واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

انشائیہ اور مضمون میں فرق

مضمون ایک وسیع لفظ ہے۔ مضمون میں ہم زندگی کے ہر شعبہ کو پیش کر سکتے ہیں لیکن خاص طور سے علمی، معلوماتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریات کو مضمون میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے سرسید احمد خاں نے ''تہذیب الاخلاق'' میں جو مضامین لکھے ہیں ان میں سے بہتوں کو انشائیہ نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ ان میں بحث اور سیاسی مسائل ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''مضامین چکبست'' کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس میں علمی اور ادبی بحث ہے۔ مہدی افادی کی ''افادات مہدی'' میں بھی ٹھوس فلسفیانہ اور علمی وادبی مضامین ہیں اس لئے ان مضامین کو بھی انشائیہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس کے برخلاف انشائیہ، مضمون نگاری کا وہ جزو ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی اور انفرادی تجربات کو پیش کرتا ہے۔ اس پیش کش میں اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک قسم کا داخلی رنگ پایا جاتا ہے مگر مضمون میں خارجی رنگ غالب رہتا ہے۔

انشائیہ اور مقالہ میں فرق

انشائیہ اور مقالہ میں بھی کافی فرق ہے۔ انشائیہ مختصر ہوتا ہے اور مقالہ کافی طویل ہوتا ہے۔ مقالہ کی تکمیل کے لئے کافی چھان بین اور تحقیق وتدقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔

اس میں کسی موضوع کے مختلف پہلوؤں سے باتفصیل بحث کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا انداز بیان بھی کافی سنجیدہ ہوتا ہے۔

عربی میں ''مقالہ'' سے ملتی جلتی چیز ''مقامہ'' ہے۔ یہ بھی تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مثال کے لئے ''مقامات حریری' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے فارسی میں نظامی عروضی سمر قندی کا ''چہار مقالہ'' بہت مشہور ہے۔ اس میں چار مقالات ہیں جن میں کافی کاوش اور عرق ریزی پائی جاتی ہے۔ ان مقالات کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اُردو میں ''مقالات شبلی'' ''مقالات حالی'' ''مقالات آزاد'' (ابوالکلام آزاد) موجود ہیں۔ ان کو مقالات ہی کہنا چاہئے۔ انشائیہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

انشائیہ اور مقالہ میں اسلوب کا بھی فرق ہوتا ہے۔ انشائیہ کا اسلوب بہت سلیس شگفتہ اور نرم ونازک ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف مقالہ میں ٹھوس اور بھاری بھرکم انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انشائیہ کا مقصد صرف انبساطی ہوتا ہے۔ مگر مقالہ کا مقصد افادی ہوتا ہے۔

انشائیہ اور تنقید میں فرق

کچھ لوگ غلط فہمی کی بنا پر تنقیدی مضامین کو بھی انشائیہ سمجھتے ہیں۔ مگر ان دونوں اصناف میں کافی فرق ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ عام طور سے انشائیہ کا مفہوم لوگوں کے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ اس لئے وہ ان دونوں اصناف کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اس لئے پہلے انشائیہ کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

انشائیہ ایک قسم کا تخلیقی ادب ہے جس طرح نظم، غزل، قطعہ اور رباعی وغیرہ کے لئے تخئیل کی ضرورت ہے اسی طرح انشائیہ کے لئے بھی تخئیل کا بلند اور لطیف ہونا ضروری ہے۔ انشائیہ کو علمی وفنی اعتبار سے نہیں جانچا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس پر وہی اصول منطبق کیے جاتے ہیں جو شاعری کو پرکھنے کے لئے عام طور سے منطبق کیے جاتے ہیں۔ شاعری ہی کی طرح انشائیہ کا لب ولہجہ بھی نرم ونازک ہوتا ہے۔ جس طرح نظم میں روانی اور سلاست نظم کی حسن کاری میں چار چاند لگاتی ہے اسی طرح انشائیہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پانی کے ایک شیریں چشمہ کی طرح رواں دواں رہے۔

انشائیہ میں اخلاقی عنصر بھی شامل ہوسکتا ہے یہ اخلاقی عنصر بالواسطہ ہمارے دل و دماغ پر اثر کرتا ہے۔ جس طرح شاعر کو بلاواسطہ مبلغ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اسی طرح انشائیہ نگار کو بھی تبلیغ سے دور رہنا چاہئے بلکہ بالواسطہ اس کو اپنے ادب پارہ میں اخلاقی عناصر کو شامل کرنا چاہئے۔ یہ اخلاقی عناصر طنز و مزاح کے ذریعہ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ جس طرح نظم و غزل میں طنز و مزاح سے کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ میں بھی یہ تیر و نشتر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

انشائیہ میں منظر نگاری بھی کی جاسکتی ہے۔ فطرت کی منظر کشی انشائیہ کا ایک خاص موضوع ہے۔ جس طرح اکثر نظموں میں منظر نگاری کے حسین نمونے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح انشائیہ میں بھی منظر نگار مناظر فطرت کو پس منظر کے طور پر یا تضاد یا ہمدردی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ کا تعلق تخلیقی ادب سے ہے اس لئے اس کو تنقیدی ادب سے الگ سمجھنا چاہئے اور الگ رکھنا چاہئے۔

انشائیہ کے مقابلہ میں تنقید ایک فلسفیانہ اور منطقیانہ صنف ہے۔ اس میں کسی ادب پارہ کے محاسن و معائب پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ اس لئے تنقید کے لئے قوتِ تخیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قوتِ استدلال کی ضرورت ہے۔ تنقید کو شاعر کے دماغ کی حاجت نہیں ہے بلکہ اس کو ایک فلسفی کی نظر درکار ہے۔ تنقید میں علمی و فنی اصطلاحات کا جابجا استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر انشائیہ ان سنگ ریزوں کے بار کو برداشت نہیں کرسکتا ہے۔

تنقید کا اسلوب بھی انشائیہ کے اسلوب سے جدا ہوتا ہے۔ تنقید میں ایک سنجیدہ اور گمبھیر اسلوب اختیار کیا جاتا ہے مگر انشائیہ کا اسلوب ہلکا پھلکا ہوتا ہے۔ تنقید میں طنز و مزاح کو بھی دخل ہوتا ہے مگر یہاں طنز و مزاح کے ذریعہ کسی تنقیدی اصول کو واضح کیا جاتا ہے یعنی طنز و مزاح بالذات یہاں اہم نہیں ہے لیکن انشائیہ میں طنز مزاح بالذات اہم ہوتا ہے۔ تنقید اور انشائیہ کے اصولوں کی تفریق کی بنا پر نقاد اور انشائیہ نگار کے زاویہ نظر میں بھی فرق ہو جاتا ہے۔ نقاد کی رفتار ایک فوجی سپاہی کی طرح ہوتی ہے جو پریڈ کے میدان میں نپے تلے قدم رکھتا ہے اور بہت مستعد اور سرگرم نظر آتا ہے۔ اس کے برخلاف انشائیہ نگار کی رفتار اس شخص کی طرح ہوتی ہے جو

شام کو کسی سبزہ زار میں اٹھلاتا ہوا چلتا ہے اور مست اور خنک ہوا کا لطف اٹھاتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انشائیہ اور تنقید میں فرق ہے۔ لہٰذا ہم تنقیدی مضامین کو انشائیہ کا درجہ نہیں دے سکتے ہیں۔ تنقیدی مضامین کو تنقید ہی کے تحت میں رکھنا چاہئے۔ اس طرح آل احمد سرور کے ''تنقیدی اشارے'' کو مضامین کا مجموعہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر ان پر انشائیہ کا لیبل نہیں لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ''اُردو ناول کا ارتقا''۔ ''اُردو نثر میں مزاحیہ نگاری'' اور ''اُردو میں افسانہ نگاری'' وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ جو خالص تنقیدی مضامین ہیں۔ اس طرح اثر لکھنوی کی ''چھان بین'' کے مضامین کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ''اقبال کا انداز بیان'' ''لکھنوی اور غیر لکھنوی شاعری'' اور ''روپ میری نظر میں'' وغیرہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ اسی طرح سے ڈاکٹر زور، ڈاکٹر اعجاز حسین، سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی وغیرہ کے تنقیدی مضامین کو بھی ہم انشائیہ نہیں کہہ سکتے ہیں۔

انشائیہ کی خصوصیات

انشائیہ کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے اس کی خصوصیات کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ ان خصوصیات کی روشنی میں ہم انشائیہ کی خوبی اور خامی کو بھی معلوم کرسکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں انشائیہ کی خصوصیات مختصر بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) اختصار:۔ انشائیہ کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت اختصار ہے۔ اور یہی چیز اس کو خاص طور سے مقالہ سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ اختصار موضوع کے اعتبار سے بھی ہوسکتا ہے اور اسلوب کے لحاظ سے بھی۔ موضوع کے اختصار سے یہ مطلب ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ نہ بیان کیا جائے اور نہ علمی بحث و مباحثہ چھیڑا جائے۔ صرف ان نکات یا واقعات کو بیان کیا جائے جو مصنف کے تجربات کے اندر ہوں۔ اسلوب کے اختصار سے یہ مراد ہے کہ انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات کو مختصر الفاظ میں پیش کردے اور اپنے نظریہ کی وضاحت کے لئے وہ طویل بیانات سے گریز کرے۔ اس بنا پر (Murray) نے اپنی لغت میں انشائیہ کے معنی اس ادبی تخلیق کے لکھے ہیں جو کسی موضوع پر بہت مختصر ہو اور ساتھ ہی اس

میں عدم تکمیل موجود ہو۔اس کا اسلوب واضح ہو اگرچہ اس کی وسعت محدود ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ مختصر نویسی بھی ایک فن ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اس کے لئے ذہانت اور فراست کی ضرورت ہے۔ اختصار سے بات بھی پر لطف ہو جاتی ہے اور مطلب بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سے واضح کیا جاتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ملتان کے باشندوں نے دوبار حسن میمندی وزیر کو خراج کی معافی کے لئے درخواست دی۔ وزیر کو یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لوگ بہانہ کرتے ہیں اور خراج کی ادائیگی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ اس لئے اب کی اس نے درخواست کی پشت پر حسب ذیل عبارت لکھ دی۔

''الخراج خراج ادادہ دوادہ''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ خراج ایک زخم کی طرح ہے جس طرح زخم کا علاج پیپ کے بہہ جانے سے ہوتا ہے۔ اسی طرح خراج کا علاج خراج کی ادائیگی سے ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وزیر میمندی نے مختصر الفاظ میں کس قدر جامع مفہوم کو پنہاں کر دیا ہے۔ انشائیہ نگاری کے لئے ایسے ہی اختصار کی ضرورت ہے۔

یہاں ایک بات کا واضح کر دینا ضروری ہے۔ اختصار کا مطلب سطحیت نہیں ہے بلکہ Sainte Beuye کی نظر میں اختصار سے مراد جامعیت ہے اور یہ خوبی مضمون نگار تب پیدا کر سکتا ہے جب اس کو اپنے موضوع پر عبور حاصل ہو۔ اگر مصنف اپنے موضوع کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتا ہے تو وہ مضمون مختصر تو ہوگا مگر ساتھ ہی سطحی بھی ہوگا۔ انشائیہ کو مختصر ہونے کے ساتھ ہی نہایت پر مغز اور بصیرت افروز ہونا چاہیے۔

انشائیہ میں اختصار کو برقرار رکھنے کے لئے انشا پرداز اپنی زندگی کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے اور قارئین باقی پہلوؤں کو خود سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح سے ایک انشائیہ نامکمل ہوتے ہوئے بھی مکمل ہوتا ہے۔

(۲) بے ربطی:۔ مرّے (Murray) کے نقطۂ نظر سے انشائیہ کی دوسری خصوصیت اس کی بے ربطی ہے۔ اس میں خیالات غیر منظم طریقہ پر پیش کیے جاتے ہیں اور اسلوب

غیر منطقی ہوتا ہے۔ جانسن بھی انشائیہ کو دماغ کی ایک غیر منظم تخلیق سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک اس میں نظم وضبط ضروری نہیں ہے۔ مونٹین، بیکن، گولڈ اسمتھ اور چارلس لیمب کے انشائیہ میں یہ غیر سنجیدگی اور بے ترتیبی کافی نمایاں ہے اور خاص طور سے مونٹین کے بعض انشائیہ تو محض اچھل کود معلوم ہوتے ہیں۔

انشائیہ میں بے ترتیبی اور غیر سنجیدگی کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں لوگوں نے سوچا کہ کوئی ایسا طرز تحریر ایجاد کیا جائے جس میں ادیب آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کر سکے اور جس میں اصول وضوابط کی زیادہ پابندی نہ کی جائے۔ ابتدائی دور میں اس اصول کی پابندی کی گئی مگر بعد کے ادیبوں نے اس خصوصیت کو قائم نہیں رکھا۔ اس تبدیلی سے ایک طرف فائدہ تو یہ ہوا کہ انشائیہ کو سنجیدگی، توازن اور تنظیم کی دولت مل گئی مگر دوسری طرف اس سے نقصان یہ ہوا کہ اسلوب کی آزادی اور طرز تحریر کی دلکشی چھن گئی۔

اگرچہ نظریات کی یہ تبدیلی ایک خوشگوار فال ہے تاہم انشائیہ کی اصل روح وہی غیر رسمی انداز بیان ہے۔ اس بنا پر Crabbe اس کو ایک آسان فن تصور کرتا ہے مگر Sainte Beuve کی نظر میں یہ ایک مشکل فن ہے۔ انشائیہ میں غیر رسمی انداز بیان اس طرح بھی داخل ہو جاتا ہے کہ انشا پرداز اصل موضوع سے ہٹ کر اپنے دیگر تجربات بھی بیان کرنے لگتا ہے۔ یہ تجربات وہ دوسری جگہ بیان کرنے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ ہر صنف ادب اتنی لچیلی اور ڈھیلی نہیں ہوتی ہے جو اس کو موضوع سے ہٹی ہوئی باتوں کے ذکر کی اجازت دے۔ اس قسم کی اجازت صرف انشائیہ دے سکتا ہے۔

(۳) اظہار شخصیت:۔ انشائیہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کی شخصیت کا عکس ہو۔ اس لحاظ سے بھی انشائیہ شاعری سے بہت قریب ہے۔ شاعری پر بھی مصنف کی شخصیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ اسی طرح انشائیہ کو بھی ہم مصنف کی شخصیت سے جدا نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے انشائیہ بالکل ذاتی اور داخلی صنف ہے۔ انشائیہ کی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ اس کے مواد اور ہیئت میں انشائیہ نگار کی روح جلوہ گر ہو۔ اسی بنا پر مونٹین Montaigne نے انشائیہ کو ذاتی تصویر Self Portrait کا خطاب دیا ہے۔

ایک کامیاب انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات سے قارئین کو آگاہ کرتا ہے اس لئے وہ کھل کر اپنے تجربات ان سے بیان کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان کو اپنے تجربات میں شریک کرلیتا ہے۔ اس لئے انشائیہ کا موضوع ذاتی تجربات کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے خودنوشت انشائیہ کا بہترین جزو ہے۔ انشائیہ میں ٹھوس، دقیق، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور سائنسی بحث نہ ہونا چاہئے کیونکہ ان چیزوں کا تعلق اصل ادب سے نہیں ہے۔ اسی لئے ان موضوعات سے مصنف کی شخصیت کا اظہار نہیں ہوتا ہے۔ انشائیہ میں مصنف کی شخصیت کا اظہار ہونا ضروری ہے۔ مونٹین، بیکن، براؤن، ڈرائیڈن، اڈیسن جانسن، گولڈ اسمتھ، چارلس لیمب، کارلائل، میکالے، ، رسکن، چسٹرٹن اور گارڈنر وغیرہ کے انشائیہ سے ان کی شخصیت کا بڑی حد تک اظہار ہوتا ہے۔ اُردو میں سرسید، آزاد، حالی، شرر، مہدی افادی، سجاد انصاری اور حسن نظامی وغیرہ کے بعض انشائیہ میں بھی ان کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ دراصل انشائیہ کو شخصیت سے ہم جدا نہیں کر سکتے۔

(۴) انبساطی مقصد:۔ Sainte beuve انشائیہ کو فرحت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ کا مقصد انبساطی اور نشاطی ہے۔ جس طرح کسی نظم اور غزل کو پڑھ کر مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے اسی طرح کسی اچھے انشائیہ کو پڑھنے کے بعد بھی ایک سرور اور وجدان کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

یہ نشاط اور انبساط دو طریقوں سے حاصل ہوتا ہے اول تو انشائیہ کا موضوع اس قدر تازہ اور جدید ہو جو عوام کی نظروں سے اوجھل رہا ہو۔ اور جب عوام اس نئے نظریہ سے آشنا ہوں تو وہ مسرت وحیرت کے جذبات میں کھو جائیں۔ دوسرا طریقہ حصول انبساط کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انشاپرداز نے شگفتگی اور رنگین بیانی سے کام لیا ہو یعنی اس کا طرز بیان بہت انوکھا اور دلکش ہو۔

انشائیہ میں شاعری کی طرح سے اشاریت اور رمزیت بھی ہوتی ہے۔ جس سے دل و دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور اس کا اسلوب دل پر گہرے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ انشائیہ کا ایک رمزیہ انداز یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں پانی پت کی تیسری جنگ

1761ء میں نادر شاہ اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی۔ مرہٹوں کے بڑے بڑے سردار قتل ہوگئے۔ اس جنگ میں وسواس راؤ اور سداشیو راؤ بھی مارے گئے۔ جب بالا جی باجی راؤ نے اس تباہی کی خبر سنی تو وہ شمال کی طرف بڑھا۔ جب وہ دریائے نربدا کے کنارے پہنچا تو اس کو ایک خط ملا جس کے الفاظ یہ تھے۔

"دو موتی ٹوٹ گئے۔ ستائیس اشرفیاں کھوگئیں اور چاندی اور تانبے کے سکوں کا کوئی شمار نہیں ہوسکتا۔"

دو موتی ٹوٹنے سے اشارہ وسواس راؤ اور سداشیو راؤ کے قتل کی طرف ہے۔ ستائیس اشرفیوں کے کھوجانے کا مطلب بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں کا گھائل ہونا یا فرار ہونا ہے۔ اور چاندی اور تانبے کے بے شمار سکوں سے مراد مرہٹہ فوج سے ہے۔

انشائیہ کے مطالعہ کے اصول

انشائیہ کی خصوصیات معلوم ہوجانے کے بعد انشائیہ کا مطالعہ آسان ہوجاتا ہے۔ ایک انشائیہ میں ہم کو پہلی بات یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں اختصار سے کس حد تک کام لیا گیا ہے۔ اگر انشائیہ طویل ہے تو یہ اس میں خامی کی علامت ہے۔ دوسری حدت کام لیا گیا ہے۔ اگر انشائیہ طویل ہے تو یہ اس میں خامی کی علامت ہے۔ دوسری بات ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ کسی مخصوص انشائیہ کی تنظیمی صورت کیا ہے۔ کیونکہ غیر منظم انداز انشائیہ کی بنیادی چیز ہے۔ تیسری بات یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں ٹھوس علمی مسائل سے بحث کی گئی ہے یا ذاتی تجربات پر روشنی ڈالی گئی ہے اگر انشائیہ میں انفرادی رنگ ہے تو اس سے مصنف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اور انشائیہ میں شخصیت کا اظہار از حد ضروری ہے۔ انشائیہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں چوتھی چیز ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہم اس ادب پارہ سے کہاں تک لذت یاب ہوتے ہیں کیونکہ انشائیہ کی تخلیق کا مقصد حصول انبساط ہے۔ اگر یہ عناصر کسی انشائیہ میں موجود ہوں تو اس کو کامیاب ادب کے زمرہ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

انشائیہ کے مطالعہ کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی اہم ہے۔ اس کا تاریخی مطالعہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح شاعری، ناول نگاری، ڈراما نگاری، افسانہ نگاری اور تنقید نگاری کو

بخوبی سمجھنے کے لئے ان کا تاریخی مطالعہ ضروری ہے۔ اس طرح انشائیہ کے کما حقہ، آگاہی حاصل کرنے کے لئے اس کے مختلف ادوار پر نظر رکھنا مفید ثابت ہوگا تاکہ انشائیہ کی ابتدا اور ارتقا کی واضح تصویریں ہمارے سامنے آجائیں۔

انشائیہ کے تاریخی مطالعہ کے سلسلہ میں ہم کو دو باتوں پر غور کرنا ہے۔ پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ انشائیہ کے ابتدائی دور میں اس کے موضوعات کیا رہے ہیں۔ اس کے بعد دور متوسط میں موضوعات میں کیا تبدیلی ہوئی اور دور آخر میں ان موضوعات میں کیا اضافہ ہوا۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ انشائیہ کا اسلوب ابتدا میں کیا تھا اس کے بعد دور متوسط میں اس کا رنگ کس طرح بدلا اور دور آخر میں انشائیہ کے اسلوب نے کیا کیا صورتیں اختیار کیں۔

انشائیہ کی حد بندی

انشائیہ کی سرحد مقرر کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ موضوع، مقصد اور اسلوب کے اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ اس میں مختلف قسم کے موضوعات داخل ہو گئے ہیں۔ انشائیہ نگار کسی بھی موضوع کو منتخب کر سکتا ہے۔ پھر وہ اس مرکز سے مکاں ولا مکاں تک پرواز کر سکتا ہے۔ اس تنوع کی بنا پر انشائیہ کی حد بندی اور بھی دشوار ہوگئی ہے۔ انشائیہ کی رنگا رنگی اور بوقلمونی نے نقادوں کے سامنے یہ مسئلہ اٹھا دیا ہے کہ آخر انشائیہ کا خاص موضوع کیا ہے؟ انشائیہ نگاری اپنے ابتدائی دور میں کہاوت اور ضرب المثل کی صورت میں ملتی ہے۔ چینی کہاوتیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ کنفوشش نے اپنی اخلاقی تعلیم اور فلسفیانہ نظریات کو کہاوتوں کی شکل میں چینی عوام کے سامنے پیش کیا۔ چینی زبان کے علاوہ عبرانی زبان میں بھی کہاوتیں ملتی ہیں۔ اگر چہ ہم ان کہاوتوں کو انشائیہ کا درجہ نہیں دے سکتے ہیں۔ مگر ان میں انشائیہ کے جراثیم ضرور موجود ہیں۔ اس طرح انشائیہ کے موضوعات میں کہاوتیں اور ضرب الامثال بھی شامل ہوسکتی ہیں۔

انشائیہ میں فلسفہ بھی داخل ہوگیا ہے۔ مونٹین جو فرانسیسی مصنف ہے اور ایک مشہور انشائیہ نگار ہے، اپنے انشائیہ میں کبھی کبھی فکری تاثرات بھی شامل کر دیتا ہے۔ وہ اپنے انشائیہ میں جا بجا حوالے بھی دیتا ہے اور مختلف لطیفے بھی بیان کرتا ہے۔ اگر چہ اس کا خاص

اسلوب بہت ہلکا پھلکا ہے اور وہ بہت ڈھیلے ڈھالے انداز میں اپنے تجربات کا اظہار کرتا ہے مگر بعض اوقات وہ اپنے اصل اسلوب سے ہٹ جاتا ہے۔

بیکن کے انشائیہ بھی فلسفیانہ خیالات سے خالی نہیں ہیں۔ اس کے انشائیہ میں خاص بات یہ ہے کہ وہ افادی پہلو کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ وہ ہر مسئلہ کو دنیاوی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کے محاسن و معائب پر نظر ڈالتا ہے۔

اسی طرح سے لاک کے انشائیہ پر بھی فلسفہ کی گہری چھاپ ہے۔ وہ مختلف مسائل کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور ان کا حل تلاش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے انشائیہ Concerning Human Understanding کو پیش کیا جاسکتا ہے جس میں ان کے فلسفیانہ نظریات واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔

براؤن بھی فلسفہ سے متاثر ہے وہ بھی اپنے انشائیہ میں فلسفیانہ نظریات پیش کرتا ہے۔ خاص طور سے وہ دنیا کی بے ثباتی اور موت سے بحث کرتا ہے اور اس طرح اپنے انشائیہ میں فلسفہ کی آمیزش کرتا ہے۔

انشائیہ میں صرف فلسفہ ہی داخل نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں اخلاقی قدریں بھی شامل ہوگئی ہیں۔ مختلف انشائیہ نگاروں نے اپنے انشائیہ کے ذریعہ انسان کے اخلاق کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح سے انھوں نے انشائیہ میں افادی اور مقصدی رنگ شامل کر دیا ہے۔ ایسے انشائیہ نگاروں میں ڈرائیڈن، اڈیسن اور اسٹیل کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اڈیسن اور اسٹیل نے The Spectator مشترکہ طور پر نکال کر عوام کے اخلاقی معیار کو بلند کیا۔

گولڈ اسمتھ کے انشائیہ کسی حد تک ان انشائیہ نگاروں سے جدا ہیں۔ اس کے انشائیہ میں زندگی کے عام مشاہدات پائے جاتے ہیں۔ ان میں گہرے فلسفیانہ خیالات نہیں ہیں اور ان کا اسلوب بھی آزادانہ ہے۔ اس لحاظ سے گولڈ اسمتھ کے انشائیہ دیگر انشائیہ نگاروں کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہیں۔

انشائیہ میں طنز و مزاح بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ انشائیہ میں طنز و مزاح کی ایک خاص جگہ ہے۔ کیونکہ طنز و مزاح کے ذریعہ انشائیہ نگار ایک ذاتی اور انفرادی اسلوب اختیار کر سکتا

ہے۔سوفٹ کے انشائیے طنز ومزاح کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

چارلس لیمب کے انشائیہ کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس میں المیہ عناصر بھی شامل کیے جاسکتے ہیں۔ چارلس لیمب کے انشائیہ میں ہم کو اس کے ذاتی تجربات ملتے ہیں جن میں حزن وملال کی ہلکی جھلک پائی جاتی ہے۔ اگر چہ اس کے انشائیہ میں مزاح کا بھی عنصر شامل ہوتا ہے مگر اس مزاح کے فانوس میں غم کی لو جھلکتی رہتی ہے۔

ہیزلٹ کے انشائیے علمی وادبی نقطۂ نظر سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیہ کو قدیم وجدید ادب کے حوالوں سے گراں بار بنادیتا ہے۔ اس کے یہاں ایک طرف گہرے اور عمیق خیالات ملتے ہیں دوسری طرف زندگی کے تجربات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کا مشہور انشائیہ On the ignorance of the learned اس کے اسلوب کو ظاہر کرتا ہے۔

کارلائل کے انشائیے بھی دیگر انشائیہ نگاروں سے بہت کچھ جدا ہیں۔ وہ ماضی پرست ہے اس کو ہر قدیم بات پسند ہے اور ہر جدید بات سے نفرت ہے۔ اس لئے سائنسی ترقی کو اہم نہیں سمجھتا ہے۔ وہ سائنس کے تخریبی پہلو سے واقف ہے اسی لئے وہ ماضی کے سایہ میں پناہ لیتا ہے۔

کارلائل کے برخلاف میکالے سائنس کا پرستار ہے۔ وہ سائنس کے حیرت انگیز کرشموں کا قائل ہے۔ وہ روحانیت کی فضا میں سانس نہیں لیتا ہے بلکہ وہ مادیت کا گرویدہ ہے۔ اسی لئے اس کے انشائیہ کا تعلق دنیا کی مادی ترقی سے ہے۔

رسکن کے انشائیے ایک اور نئے پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ اپنے انشائیہ میں جمالیاتی نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ وہ ہر جگہ حسن کی تلاش کرتا ہے۔ وہ زندگی کو بھی حسین بنانا چاہتا ہے اور اخلاق میں بھی حسن کی موجوں کو بھر دینا چاہتا ہے۔ وہ پاکیزہ زندگی کا قائل ہے اور روحانیت کی ترقی اس کا نصب العین ہے۔ اس کے انشائیہ میں ان سب باتوں کی جھلک نمایاں ہے۔

جدید دور میں چسٹرٹن ایک مشہور انشائیہ نگار ہے۔ مگر چسٹرٹن جدید دور کا ہوتے ہوئے بھی جدید دور کا نہیں ہے یعنی وہ قدامت پرست ہے۔ اس لحاظ سے وہ بڑی حد تک کارلائل سے ملتا جلتا ہے۔ اس کو جدید دور کی تہذیب میں خامیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان کو دور کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔

کارڈز کے انشائیے حیات وکائنات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی مختلف اشیاء ہر قلم اٹھتا ہے اور اپنے مختلف تجربات بیان کرتا ہے۔ اس کے موضوعات معمولی بھی ہوتے ہیں اور اہم بھی ہوتے ہیں مگر اس کے ہر مضمون میں دانائی اور بینائی کی جلوہ گری موجود ہوتی ہے۔

مندرجۂ بالا سطور میں انگریزی انشائیہ کے مشہور مصنفین کے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بحث ومباحثہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انشائیہ کا کوئی ایک موضوع نہیں ہے۔ انشائیہ میں فلسفہ بھی داخل ہوسکتا ہے اور اخلاق بھی۔ اس میں قہقہے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں اور آنسو بھی۔ اس میں حیات کا بھی تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور کائنات کا بھی۔ اس میں ماضی کی بھی سیر کی جاسکتی ہے اور حال کی بھی۔ اس میں مادی اثرات کا بھی غلبہ ہوسکتا ہے اور روحانی جذبات کا بھی۔ الغرض انشائیہ میں رنگارنگ موضوعات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ان انشائیہ نگاروں کے سلسلہ میں ایک اور ضروری بات قابل عرض ہے۔ اگر انشائیہ کے اصلی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ان مصنفین انشائیہ کا بغور تجزیہ کریں تو ان میں سے بہتوں کے مضامین انشائیہ کے معیار پر پورے نہیں اتریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ انشائیہ کو نہ تو فلسفہ سے کوئی تعلق ہے نہ اس کو اخلاق سے کوئی واسطہ ہے نہ اس کو ماضی پرستی اور رجعت پسندی سے کوئی لگاؤ ہے۔ دراصل انشائیہ میں تو ذاتی تجربات بیان کیے جاتے ہیں اور اس میں ایک سلیس اور شگفتہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ انشائیہ عمیق خیالات اور علمی مباحث کو برداشت نہیں کرسکتا ہے اور نہ وہاں سنجیدہ طرز بیان اور ثقیل الفاظ کی گنجائش ہے۔

جس طرح انگریزی ادب میں خالص انشائیہ بہت کم ملتے ہیں، اسی طرح اُردو ادب میں بھی اصلی انشائیہ کی مثالیں نظر سے بہت کم گزرتی ہیں۔ اگر چہ مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری کی اصل بنیاد سرسید نے ڈالی ہے مگر سرسید سے قبل انشائیہ کے خام نمونے ہم کو مل سکتے ہیں۔ ملاوجہی کی ''سب رس'' میں تصوف، حسن اور عقل کے متعلق کچھ باتیں ملتی ہیں ان باتوں کا ذکر تمثیلی انداز میں ہے اس میں وجہی نے رمز وکنایہ سے بھی کام لیا ہے۔ یہاں تک تو انشائیہ کا انداز ''سب رس'' میں پایا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ 'سب رس' کے موضوعات کا ذکر

فلسفیانہ انداز میں ہے، اس لئے ہم ان موضوعات کو انشائیہ کے زمرہ میں نہیں رکھ سکتے ہیں۔

عطا حسین خاں تحسین کی کتاب ''نوطرز مرصع'' کی عبارت کو بھی ہم انشائیہ کا درجہ نہیں دے سکتے ہیں۔ اگر چہ مصنف نے اس میں بعض مقامات پر خود لوشت کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں مگر اس کا انداز بیان تصنع اور آورد سے پر ہے جو انشائیہ کے اسلوب کے منافی ہے۔

یہی اعتراض رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ''فسانہ عجائب'' پر کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں جو طرز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ وہ انشائیہ کا طرز بیان نہیں ہے تصنع اور آورد اس میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ مصنف نے اپنا زورِ قلم صنائع و بدائع پر صرف کر دیا ہے۔

انشائیہ کا اسلوب کچھ حد تک ہم کو غالب کے خطوط میں ملتا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ غالب کے خطوط کا انداز بیان بہت سادہ ہے اور آورد سے پاک ہے۔ غالب نے نہایت بے تکلفی کے انداز میں ان خطوط کو اپنے ہم عصروں کے نام لکھا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ان سے غالب کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان خطوط میں ہم کو غالب کی زندگی کے رنگا رنگ نقوش ملتے ہیں ان سے ان کی حیات کے بہت سے تاریک گوشے روشن ہو جاتے ہیں۔

غالب کے بعد اُردو انشائیہ کے کچھ نمونے ''تہذیب الاخلاق'' رسالے میں موجود ہیں۔ مگر ''تہذیب الاخلاق'' کے اکثر مضامین میں زور استدلال پایا جاتا ہے کیونکہ سرسید اپنی اصلاحی تحریک کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ یہ طرز بیان انشائیہ کے اصول کے منافی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے مضامین میں مصنف کی شخصیت بھی نمایاں نہیں ہو سکتی ہے۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے لکھنے والوں میں حالی، ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک تھے۔ یہ سب مذہبی سماجی، سیاسی، تہذیبی، اخلاقی اور تعلیمی مضامین لکھتے تھے۔ لہٰذا ان مضامین کو انشائیہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ لیکن سرسید کے کچھ مضامین کو انشائیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ جیسے ہمدردی، خوشامد، بحث و تکرار اور امید کی خوشی، ان مضامین میں مصنف کی ذات کا عکس ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا انداز بیان بھی انفرادی ہے۔

مولانا آزاد کو بھی انشائیہ نگاروں کے زمرہ میں کسی حد تک شامل کیا جاسکتا ہے۔ ان کی

مشہور تصنیف ''نیرنگ خیال'' میں انشائیہ کا انداز تھوڑا بہت ملتا ہے مگر ان کے تخیلی رنگ میں کچھ فلسفیانہ جھلک بھی پائی جاتی ہے اور انشائیہ کو فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان مضامین سے نہ تو مصنف کی شخصیت جھلکتی ہے اور نہ اس کے ذاتی تجربات ظاہر ہوتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم نے بھی انشائیہ کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کے انشائیہ میں دیگر انشاء پردازوں کی بہ نسبت انشائیہ نگاری کی زیادہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ ''مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ'' کو ایک کامیاب انشائیہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ''کراچی سے بصرہ تک'' میں بھی انشائیہ کی جھلک موجود ہے۔

خواجہ حسن نظامی بھی بڑی حد تک انشائیہ نگاری میں کامیاب ہیں۔ ان کے مضامین ''دیا سلائی''، ''آسمان کی آوازیں''، ''سیم لا'' اور ''گلاب تمہارا، کیکڑ اہمارا'' کو ہم انشائیہ کے صف میں رکھ سکتے ہیں۔ ان مضامین میں خواجہ حسن نظامی کی شخصیت بھرپور طریقہ سے نمایاں ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کو بھی انشائیہ نگاروں کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ دراصل انہوں نے اپنی مزاح نگاری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ انشائیہ میں مزاح نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس لئے مرزا فرحت اللہ بیگ انشائیہ نگاری میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ان کے انشائیہ ''نذیر احمد کا حلیہ'' اور ''ایک وصیت کی تعمیل'' انشائیہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی بعض مضامین انشائیہ سے قریب ہیں کیونکہ ان میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربات کو نہایت ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے مضامین ''کرشمۂ قدرت''۔ ''چڑیا چڑے کی کہانی''۔ ''فطرت کی بزم نشاط'' اور ''حکایات بادۂ و تریاک'' کو ہم انشائیہ کے زمرہ میں رکھ سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے بھی بعض مضامین انشائیہ کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان کے انشائیہ میں ظرافت کا رنگ غالب رہتا ہے اور یہی رنگ ان کو انشائیہ نگاروں کی محفل میں جگہ دیتا ہے۔ ''بجرڈ'' اور ''امتحانات'' میں انشائیہ کی رنگین جھلک موجود ہے۔

انشائیہ نگاروں کی بزم میں پطرس کو بھی جگہ دی جاسکتی ہے۔ ان کا طرز بیان بھی بہت سبک ہوتا ہے۔ ان کے انشائیہ میں ظرافت کی چاشنی بھی شامل رہتی ہے اور طنز کی تلخی بھی۔

پطرس کے موضوعات بھی ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔ پطرس کا مضمون "لاہور کا جغرافیہ" انشائیہ کے حدود میں آسکتا ہے۔

مندرجہ بالاسطور میں جن انشائیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے ان کے انشائیہ میں مکمل طور سے انشائیہ نگاری کی خصوصیات نہیں پائی جاتی ہیں۔ اگر سختی سے جانچا جائے تو ان میں سے بہتوں کو انشائیہ کے دربار میں کرسی نہیں ملے گی۔ مگر اس محاسبہ میں خدشہ یہ ہے کہ کہیں انشائیہ کا دربار ہی خالی نہ ہو جائے۔ اس لئے مصلحتاً انشائیہ کی سختی میں لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے تا کہ اُردو انشائیہ تہی دامن اور بے بضاعت نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیش نظر انشائیہ کے اصولوں میں تھوڑی بہت ترمیم بیجا نہیں ہے۔ تاہم انشائیہ کو کم از کم مقالہ اور تنقیدی مضامین سے الگ ہی رکھنا چاہئے تا کہ انشائیہ اپنی شان امتیاز کو قائم رکھ سکے۔

□□□

سلیم اختر

انشائیہ — مبادیات

انشائیہ پر مختلف نقادوں کی تحریروں سے اس کی تکنیک کے بارے میں بہت کچھ پڑھ کر مندرجہ ذیل امور ذہن میں ابھرتے ہیں:

۱۔ اختصار ۲۔ غیر رسمی طریق کار

۳۔ اسلوب کی شگفتگی ۴۔ عدم تکمیل کا احساس

۵۔ شخصی نقطہ نظر ۶۔ عنوانات کا موضوع یا نقطہ نظر سے ہم آہنگ نہ ہونا

گویا ان تمام اجزا کے حسین اور فنکارانہ امتزاج سے جنم لینے والا فن پارہ انشائیہ ہوگا۔

انشائیہ تحلیل نفسی سے پہلے کی چیز ہے، لیکن انشائیہ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں اکثر اس نفسی مریض کا خیال بھی آتا ہے جو تحلیل نفسی کے معالج کے سامنے ایک آرام دہ کوچ یا "دیوان" پر لیٹا ہوا اپنے الٹے سیدھے خیالات کا ربط یا بے ربطی کے ساتھ بے تکلف اظہار کئے جا رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انشائیہ نگار کوئی ذہنی مریض ہوتا ہے یا انشائیہ ذہن کے مریضانہ رجحانات کی پیداوار ہوتا ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ انشائیہ قاری کے ذہن میں مریضانہ رجحانات کی تقویت کا باعث بنتا ہو۔

تحلیل نفسی کا کلاسیکی انداز یہ ہے: مریض آرام اور سکون سے معالج کے سامنے کوچ یا گدے، ورنہ کسی آرام دہ بستر پر لیٹا لیٹا معالج کے کہنے کے بموجب وہ سب کچھ ظاہر کرتا چلا جاتا ہے جو اس کے ذہن میں بے ساختہ آرہا ہے۔ آغاز بالعموم گزری ہوئی شب کے خواب سے ہوتا ہے، یا ایسے ہی کسی اور قصے یا واقعہ سے تلازمہ خیال کے باعث چراغ سے چراغ جلنا شروع ہوتا ہے، ایک بات سے دوسری بات نکلتی ہے، دوسری سے تیسری بات کی طرف

رجوع ہوتا ہے۔ اس کی تمام باتیں بے ربط اور بے مقصد معلوم ہوتی ہیں، لیکن ان غیر مربوط غیر منطقی بلکہ لایعنی باتوں اور ظاہری طور پر احمقانہ باتوں سے بھی بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا کیونکہ پس پردہ لاشعور کا طوطی بولتا ہے کوئی پنہاں مقصد، کوئی نا آسودہ خواہش سامنے آجاتی ہے اسے ہڈسن نے ''داخلیت'' سے تعبیر کیا ہے اور لارڈ برکن ہیڈ ''افشائے ذات'' کہتے ہیں۔ یوں نفسیات میں علیحدہ سے اس کی کوئی واضح اصطلاح نہیں ملتی، لیکن مریض اور معالج کی 50 منٹ کی ایسی ملاقات کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مریض کی شخصیت میں جھانکا جائے، مریض کی اکھڑی اکھڑی باتوں اور عام انداز گفتگو سے ہٹا ہوا طریقہ گفتار بہت سے گوشوں پر سے پردہ ہٹا دیتا ہے۔ انشائیہ کا بھی کچھ ایسا ہی مقصد نظر آتا ہے۔ لارڈ برکن ہیڈ کی طرف رجوع کیجئے:

> ''اس عنوان (ایسے) سے دراصل اس کی کیا مراد تھی؟ میرے
> خیال میں تو مونٹین اپنی ان تحریروں کو نثر نگاری کی سعی قرار دیتے ہوئے
> دراصل ذات کے انکشاف کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔''

واضح رہے کہ مونٹین نے خود اپنے ان انشائیوں کو بھی مصنف کے ساتھ ''ہم وجود'' قرار دیا تھا۔

بہر نوع اپنی دوسری خصوصیات کے لحاظ سے انشائیہ تحلیل نفسی کی اس تکنیک سے مشابہ ہے جو انکشاف ذات کے لئے کام میں لائی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اختصار کے وصف کو لیجئے پہلے فرانسیسی انشائیہ نگار مونٹین (92-1532) کی ایک تالیف سامنے آتی ہے جو 1580ء میں طبع ہوئی اور اسے ''ایسے'' کا عنوان دیا گیا۔ لفظی معنی ''سعی'' یعنی ادبی کاوش سمجھ لیجئے۔ اس کوشش سے لے کر انگلستان کے بیکن یا اپنے ہاں ڈاکٹر وزیر آغا اور نظیر صدیقی تک سب ہی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انشائیہ کی روح اختصار میں پوشیدہ ہے۔ بیکن نے دس انشائیوں پر مشتمل 1593ء میں ایک مجموعہ شائع کیا۔ یہ تحریریں اتنی مختصر ہیں کہ کسی طویل مقالے کے نکات معلوم ہوتے ہیں یوں بعد میں طویل انشائیے بھی لکھے گئے اور اب اختصار کا معاملہ ایک نزاعی مسئلہ بن چکا ہے، تاہم بیشتر اہل نظر اختصار پسندی کی طرف ہی مائل ہیں۔

انشائیہ نگار نے اپنی ذات کو ہی موضوع بنایا ہے مگر اسے یہ بھی احساس ہے کہ وہ اتنی عظیم شخصیت نہیں کہ قاری اس کی شخصیت پر ایک دم رجھ جائے، نہ اس کی عہد بہ عہد نشو و نما میں اسے دلچسپی ہوسکتی ہے، اسے یہ احساس بھی رہتا ہے کہ اس نے تکمیل ذات کے لئے (کم از کم مادی لحاظ سے) کوئی ایسا کارنمایاں انجام نہیں دیا کہ ساری دنیا اس کی مداح ہو جائے اور اس بات میں دلچسپی لے کر قطرہ کے گہر ہونے تک دیکھتے رہیں اور ان مراحل کو اپنے لیے بھی سبق آموز سمجھ لیں کہ اس نے کسی منزل تک پہنچنے کے لئے بہت سے پر پیچ مراحل طے کئے اور زمانے نے بڑی چھان پھٹک بھی کی تھی۔ اس تمام قصے سے قاری کو اتنا لگاؤ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انشائیہ خود نوشت سوانح عمری بھی نہیں۔ اور نہ انشائیہ نگار اپنے حالات زیست ہی قلمبند کرتا ہے مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ وہ ''عظیم'' نہ ہونے کے باوجود اپنے خیالات، احساسات اور میلانات سے دوسروں کو آگاہ ضرور کرنا چاہتا ہے۔ دوسرے اس کی ذات میں کس قدر دلچسپی لیتے ہیں، یہ انشائیہ نگار کی ہنرمندی ہے مگر سوال یہی ہے کہ انشائیہ نگار دوسروں تک اپنی ذات کو کیوں پہچانا چاہتا ہے؟

فرد میں بالعموم اور فنکار میں بالخصوص کچھ نہ کچھ ''نرگسیت'' ضرور ہوتی ہے۔ میں اس اصطلاح کو اس کے لغوی معنوں میں استعمال نہیں کر رہا کیونکہ وہ تو الفت ذات کے مریضانہ رجحان کے لئے مخصوص ہے یہاں جو کیفیت پیش نظر ہے وہ صرف الفت ذات ہی نہیں یا کم از کم اس کی مریضانہ کیفیت نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔ غرض کچھ بھی کہا جائے یہ تشہیر ذات کا پہلو ہے اور وہ ہر شخص کی انا کو بہت تسکین دیتی ہے۔ اس کا اظہار بالواسطہ یا بلاواسطہ دونوں طرح ہوسکتا ہے۔ بالواسطہ صورت میں انشائیہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی ذات کو موضوع بناتا ہے۔ اس ضمن میں چارلس لیمب کی مثال کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ جس نے ریشم کے کیڑے کی مانند خود کو اپنی ذات کے ''کوئے'' یا خول میں بند رکھا تھا وہ قاری کو ایک معتبر و غمخوار دوست سمجھتا تھا۔ بلکہ ''گوش ہمدرد'' کا حامل سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ ذاتی حالات اور نجی کوائف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ انشائیہ نگار کو یہ انداز گفتگو ''اعترافات'' کی قسم سے نہیں ہوتا، کیونکہ اعترافات کے ساتھ جرم و گناہ،

یا کم از کم ان کا احساس ضرور وابستہ ہوتا ہے، مگر ایسا نہ ہونے پر بھی وہ اپنی شخصیت کے ان گوشوں پر سے ضرور نقاب اٹھاتا ہے جو معاشرہ میں تحریمات (ٹیبوز) مانے جاتے ہیں۔ لیکن انشائیہ نگار کو کسی سنسنی یا چونکا دینے والی بات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذات کے بارے میں گفتگو کرنے کے باوجود اسے شخصیت کے کج رو رجحان کو منظر عام پر لانے کی ضرورت نہیں (روسو کے اعترافات کی مانند) یعنی یہ کہ وہ "تشہیر ذات" تو کرتا ہے مگر مبہمات کے تذکرہ میں لذتیت ابھارنے کی نہ ضرورت سمجھتا ہے نہ وہ اس کا موضوع ہی ہے (جیسا "کاسانووا" کے اعترافات میں ہم پاتے ہیں)۔

"انشائیہ جیسی شخصی صنفِ ادب "میں" کے مظاہرے ہی کے لئے عالم وجود میں آئی ہے۔"

انشائیہ میں یا اگر اسے پھیلایا جائے تو جملہ ادب و فن میں قلمکار کی "میں" کا ظہور بعض پیچیدہ نفسی عوامل کا مرہون منت ہوتا ہے۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ افراد میں بالعموم اور فنکاروں میں بالخصوص ایک خاص قسم کا احساس محرومی پایا جاتا ہے۔ یہ احساس متنوع عوامل کا پیدا کردہ ہوسکتا ہے اور مختلف افراد میں ردعمل بھی یکساں نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ کبھی اس ناتمامی کے احساس سے چھٹکارا پانے کی خاطر کسی آدرش کو اپنا لیتے ہیں جو مقصد حیات بھی ہوسکتا ہے اور نظریہ حیات بھی۔ یہ تعمیری بھی ہوسکتا ہے اور تخریبی بھی۔ اس احساس کے تحت ان کے خوابہائے بیداری اور ذہنی طلسم کاری مل کر ایک ایسے ذہنی ہیولی کو جنم دیتے ہیں، جسے وہ ارفع و برتر اور افضل سمجھتے ہیں اور پھر اس سے تطبیق کے خواہاں بھی رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے لئے برتر وجود کا تصور تخلیق کرتے ہوئے نفسی ارتقاء کے لئے اسے ایک راہنما ستارہ قرار دیتے ہیں۔ اس رجحان کے باعث وہ خود کو ایک خاص رنگ میں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسا فنکار اپنی شخصیت کے لئے شعوری یا لاشعوری طور پر ایسے خدوخال وضع کر لیتا ہے جو مستعار ہوتے ہیں مگر اس کے آئیڈیل ضرور ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی کسی ادب پارے یا فن پارے میں بلاواسطہ طور پر اظہار ذات در آئے تو وہ ذات اصل خدوخال کی نمائندہ نہ ہوگی بلکہ خوابہائے بیداری اور ذہنی طلسم کاریوں سے بنی ہوگی۔

اس سلسلے میں مصوروں کی "خود شبیہیں" بھی آتی ہیں۔ انشائیوں کے قلمی چہرے کی مانند ان میں بھی فنکار اپنی "موقلمی تصویر" ہی پیش کرتا ہے۔ تقریباً تمام عظیم مصوروں نے اپنی تصاویر بنائی ہیں اور ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو اپنے چہرے پر کچھ ایسا تاثر دے جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے ناقابل فہم بھی ہوسکتا ہے، مگر یہ فنی خامی نہ ہوگی کیونکہ مصور خود جیسا سمجھتا ہے ویسا ہی رنگوں اور خطوں کی ہم آہنگی سے پیش کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے نمایا مثال نقاش پال گاگین (فرانس) کی وہ تصویر ہے جس میں اس نے اپنے چہرے پر عجیب کربناک تاثر پیدا کرنے کے ساتھ پس منظر میں مسیح مصلوب سے اپنی دکھ بھری زندگی کا تلازمہ قائم کیا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ایڈورڈ لوشک کی سگریٹ والی تصویر کا ہے۔ سب لوگ اس نقاش کو خبطی سمجھتے تھے۔ مگر اس کے بنائے ہوئے اپنے چہرے سے کسی عظیم شخصیت کی انا کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

انشائیوں میں "تشہیر ذات" کرنے والے لوگ ایسے نظر آتے ہیں جیسے وہ کوئی مخصوص تاثر پیدا کرنا چاہتے ہوں۔ یہ تاثر محض اسلوب کا پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ ایک برتر وجود کے اس تصوراتی ہیولی سے روشنی اخذ کرتا ہے۔ جسے ہر انسان اپنے ذہن کے صنم کدہ میں سب سے اونچے استھان پر متمکن کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ پگملیون بنا ہوا اس کی پرستش کرتا رہتا ہے۔ اس نوع کے انشائیوں میں سب سے بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ ابلاغ ذات اگر غیر فنکارانہ انداز سے ہو تو قاری کچھ چڑ جاتا ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے برتر وجود کے ہمزاد سے کہے کہ کبھی کبھی وہ اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ ایسا سلوک کرتے ہوئے اسے چاہئے کہ وہ اپنی ذات کے صرف انہی پہلوؤں کو سامنے لائے جو انسانی دلچسپی کی بناء پر سدابہار ثابت ہوسکیں۔ ورنہ انشائیہ نگار کا یہ ہمزاد قاری کے لئے ایک پیر تسمہ پا بن جائے گا۔ یہ درست ہے کہ اولاد کی مانند ہر انسان کو اپنی شخصیت کے تمام (اچھے) برے پہلو بھی "آرٹ" ہی نظر آتے ہیں مگر بدتمیز بچوں کو پڑوسی کس طرح پسند کریں؟ اسی طرح کے غیر دلچسپ پہلوؤں کو انشائیہ کا قاری بھی پسند نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہر انشائیہ نگار لیمب تو ہونے سے رہا۔ لیکن خشک و تر سے احتراز کرنے پر بڑے خوبصورت انداز سے فشائے ذات

کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں میرا ذہن "نظیر صدیقی مرحوم" کی طرف جاتا ہے۔ اگر اس میں طنز کی خاطر بعض باتوں کا اضافہ نہ کیا جاتا تو یہ انشائیہ میرے خیال میں بہت خوب ہو جاتا ہے لیکن مصنف نے "میں" کی لے اتنی زیادہ بڑھا دی ہے کہ یہ انشائیہ اس فنکارانہ حسن توازن سے محروم ہو گیا ہے جو اس نوع کے انشائیوں کی اصل اساس و روح ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اس پر متفق ہیں کہ انشائیہ میں ایجاز و اختصار بہت ضروری ہے۔ وجہ یہی کہ قاری طول کلام سے اکتا نہ جائے اور لکھنے والے سے ہمدردی ضائع نہ ہو جائے۔ بعض اوقات طنز کی ترشی یا مزاح کی چاشنی سے ایک چیز دیگر پیش کی جاتی ہے یہ گویا قاری کو جیتنے کے لئے ایک رشوت یا چاٹ ہے اور یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اظہار ذات کے لئے انشائیہ نگار بالواسطہ طریق بھی اختیار کر سکتا ہے بلکہ بیشتر انشائیہ نگار اسی طریقے کو اپناتے ہیں۔ ایسے ادب پارے میں انشائیہ نگار اپنی "میں" کو یوں سامنے لاتا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہونے دیتا۔ اس مقصد کے لئے زندگی میں سے (بظاہر) غیر اہم پہلوؤں کو لیتے ہوئے اپنی باتوں کو فنی اہمیت بخشتا ہے جس کے لئے وہ منفرد اور بعض اوقات انوکھے یا چونکا دینے والے زوایہ ہائے نگاہ سامنے لاتا ہے۔ مسلم الثبوت اقدار اور معیاروں کا ایسے انداز سے تجزیہ کرتا ہے کہ ڈھول کا پول کھل جائے۔ الغرض وہ زندگی اور اس کے متنوع مظاہر کو نت نئے معانی بخشتا ہے۔ اس نوع کے انشائیوں میں مصنفین سے قارئین کی رائے کا اتفاق ضروری نہیں۔ ادھر یہ بھی ہے کہ انشائیہ نگار اپنے قاری کو قائل کرنے کا بھی کوشاں نہیں ہوتا کیوں کہ قائل کرنے کے لئے دلیل و استدلال ضروری ہے مگر انشائیہ کی لطافت و تازگی ٹھوس دلائل و براہین کی متحمل نہیں۔

انشائیہ نگار کی حالت تو اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کسی عمدہ و خوشگوار موڈ میں بیٹھا ہے اور اپنے کسی بے تکلف دوست سے ایسے ہی خوشگوار لہجہ میں باتیں کئے جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے ہم اسے کسی حد تک ڈرامائی خود کلامی سے بھی مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن انشائیہ نگار ڈرامہ نگار کی طرح پابند نہیں۔ خود کلامی صرف ایک کردار کے احساسات اور ردِ عمل کے لئے ہوتی ہے۔ مگر انشائیہ بظاہر غیر منطقی اور غیر عقلی بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ دوسروں کے

خیال میں ہوگا۔ خود انشائیہ نگار اس باب میں بالکل سنجیدہ ہوتا ہے وہ ان باتوں کو درست اور جائز سمجھتا ہے ویسے بھی یہ فرد واحد کے خیالات ہیں۔ ایسے خیالات جن سے وہ اپنی شخصیت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنے کی دھن میں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انشائیہ میں اصل چیز موضوع نہیں (کیونکہ ہر موضوع اپنایا جاسکتا ہے) بلکہ اصل چیز شخصیت کا حسن ہے۔ مصنف کے تاثرات ذاتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ ہونے چاہئیں اس کے اپنے ذہن کی تخلیق۔ انشائیہ کے حسن کا انحصار تو ان تاثرات اور خیالات کے حسن اظہار پر ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ انشائیہ ذہن کی ترنگ سہی مگر یہ مجذوب کی بڑ نہیں ہوتی۔ اسی لئے نقادوں کی اکثریت نے اس کے لئے ہلکے پھلکے انداز اور لطیف مزاج کو ناگزیر قرار دیا ہے۔ انشائیہ میں اس عنصر سے خوبی پیدا ہوتی ہے اور قاری کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ مصنف اپنی انفرادیت بھی منواتا جا رہا ہے ایک اور خصوصیت جس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہے یہ ہے کہ بعض اوقات انشائیہ کے عنوان نفس موضوع سے لاتعلق ہی نہیں ہوتے بلکہ سرے سے اس کی تکذیب کرتے نظر آتے ہیں اور ایسے عنوانات سے موضوع کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس طرح مصنف قاری کو ایک دلچسپ نفسیاتی مغالطہ میں مبتلا کر کے حیرت زدہ کر دیتا ہے، چونکا دیتا ہے اور ایسے خیالات سے اپنی شخصیت کا ایک اثر اس کے ذہن پر چھوڑتا ہے، اس ڈھب سے فنی حظ بھی حاصل ہوتا ہے کیونکہ عنوان کی پیدا کردہ توقعات کے برعکس قاری مضمون میں کچھ اور ہی پاتا ہے اگر وہ کوئی انوکھی بات ہو تو یقیناً اس سے ایک لطیف مسرت کا احساس ضرور جنم لے گا مگر یہ خصوصیت ہر انشائیہ میں نہیں ہوتی، لیکن اگر ہو تو قند مکرر کا لطف دیتی ہے۔ انگریزی میں اس کی کئی بڑی اچھی مثالیں ملتی ہیں: یہاں سوفٹ کے "اے موڈیسٹ پروپوزل" کا ذکر کیا جاسکتا ہے جس میں بچہ فروخت کرنے، ذبح کرنے اور اسے پکا کر دعوتوں میں کھانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔

تکنیکی اعتبار سے ہم اسے افسانہ کے اچانک اختتام جیسا بھی قرار دے سکتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہاں افسانہ میں ایک خاص فضا سے توقعات ابھارنے کے بعد ان کے برعکس اختتام لایا جاتا ہے، لیکن اس نوع کے انشائیوں میں عنوان سے موضوع کے بارے

میں پیدا ہونے والی توقعات فنی رعنائی سے باطل کردی جاتی ہیں۔ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ ہے کہ موضوع کی مذمت کے لئے ''موضوع'' جیسا عنوان دیا جس کے تلازمہ سے قاری کے ذہن میں عنوان سے وابستہ تمام خیالات ونظریات اور احساسات ابھر آئے اور یوں ان سب کی فرداً فرداً خامیاں اجاگر کئے بغیر ہی ہلکے پھلکے انداز سے موضوع سے وابستہ تصور کے بارے میں قاری کے ذہن میں ایک ہل چل ڈال دی۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوگیا اور یہی انشائیہ کا مقصد ہونا چاہئے۔

نیاز فتح پوری نے اپنے ایک مقالہ ''اُردو کا پہلا اور آخری انشائیہ نگار'' میں انشائیہ کے فن پر جو بحیثیت مجموعی تبصرہ کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے ان کے بقول:

''اس فن لطیف کا تعلق صرف سلامت زبان سے نہیں بلکہ تخیل شاعرانہ اور شعور ناقدانہ سے بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی سے بھی، اس کے لئے نہ صرف اعلیٰ درجہ ژرف درکار ہے جو صرف وسیع مطالعے اور دقیق مشاہدے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ بلکہ فلسفیانہ انداز تفکر، جدت واختراع یعنی Original Thinking بھی ضروری ہے جو ایک فطین وذہین دماغ، متوازن سلیم طبیعت اور ایک کشادہ پاکیزہ قلب ہی کو میسر آتی ہے ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ سادہ زبان اور شگفتہ ودل نشین انداز بیان''(۱)

وہ اس ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

''یہ صنف دراصل تنقید ہی کی ایک صورت ہے لیکن نہایت لطف وخوشگوار اس کا انداز بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہم اگر تبادلہ خیال کریں اور لطف وتفریح کا عنصر ہاتھ سے نہ جانے دیں ظاہر ہے کہ اس نوع کی صحبتوں میں گفتگو کی جاتی ہے وہ کسی علمی تقریری کی حیثیت نہیں رکھتی اور نہ محض خشک ودقیق مسائل ہی سے کام لیا جاتا ہے لیکن ہوتی ہے وہ

---

۱ ''مقاماتِ ناصری'' ص ۲۹

بہر حال تنقید ہی، اس لئے کسی مقصود سے خالی نہیں ہوتی اور اس کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ بڑی شیریں، بے ساختہ اور بے تکلف ہوتی اور اس کے ساتھ ظرافت اور مزاح سے بھی خالی نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ایک اچھا انشائیہ نگار دراصل ماہر نفسیات بھی ہوتا ہے اور حقائق کا بیان وہ شاعرانہ فکر وتخیل اور ادیبانہ لب ولہجہ میں کرتا ہے اور اس لئے سننے والا جلد متاثر ہو جاتا ہے اور اس کی عملی مسائل سے متعلقہ اکثر الجھنیں بھی دور ہو جاتی ہیں۔''(۱)

گو ہمارے ہاں انگریزی نصاب کی کتابیں زیادہ تر انشائیوں پر مشتمل ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں بھی یہ صنف ایسی ہی مقبول ہے جیسی مثلاً افسانوی ادب کی صنف ہے ہمارے ہاں ابھی تک اتنے انشائیے لکھے بھی نہیں گئے کہ ہم ان سے کوئی شائستہ اعتنا نصابی مجموعہ مرتب کرسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انشائیہ ہر مزاج کے مصنف یا قاری کے بس کا روگ بھی نہیں۔ اچھا، برا افسانہ یا غزل تو کسی نہ کسی طرح لکھ لی اور اس کے ''قدر دان'' بھی میسر آ گئے مگر انشائیہ ''اچھا برا انشائیہ'' نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ یا کوئی کامیاب نمونہ فن ہوگا ورنہ ایک بے تکی تحریر۔ دراصل انشائیہ ایک مہذب ذہن کی پیداوار ہے اور مہذب قاری ہی اس کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ یہ انفرادیت کا اظہار تو ہے، ابلاغ ذات بھی ہے نرگسی میلانات کا حامل بھی۔ مگر یہ سب چیزیں جس لطف سے انشائیہ کی شکل میں جلوہ پیرا ہوتی ہیں وہ بڑا ریاض چاہتی ہے اگر اس انداز سے انشائیہ کا جائزہ لیں تو غالب کے خطوں میں سے بعض خطوط یقیناً انشائیہ قرار پاتے ہیں۔ ان خطوط میں ابلاغ ذات کی فنکارانہ سعی کارفرما ملتی ہے اس پر مستزاد غالب کا زیر لب تبسم بھی ہے۔ اگر بعد میں یہی انداز شعوری طور پر اپنایا جاتا تو آج یقیناً انشائیہ ہمارے ہاں بھی ایک مقبول ومعتبر صنف ادب بن جاتا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزادی کی ''غبار خاطر'' میں بھی ہمیں انشائیہ کی جھلک ملتی ہے۔ خاص طور پر چائے کہ سلسلے کی چیزیں یا چڑے چڑیوں والا خط۔

انشائیہ کی جھلک دیکھنے کے لئے تلاش جستجو کی یہ سعی ہے۔ اتنی دور تک جانے کا مقصد

---

۱ ''مقاماتِ ناصری'' ص ۳۳

اس کی ''قدامت'' ثابت کرنا تھا بلکہ یہ عرض کرنا تھا کہ میرے نزدیک مہذب ذہن قرار دینے کے لئے مزید بحث کی بھی ضرورت نہیں مگر انہیں انشائیہ نگار بھی نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط محض خطوط ہی تھے، بلکہ ''غبار خاطر'' کے خطوط تو خطوط کے طور پر لکھے بھی نہیں گئے تھے۔

انشائیہ کے ضمن میں بہت سی الجھنیں اصطلاحات کی پیدا کردہ ہیں۔ اگر انشائیہ کے حدود متعین کر کے اسے طنزیہ یا مزاحیہ مضامین سے ممیز کرنے کی کوشش کی جاتی تو بات اتنی نہ الجھتی۔ انشائیہ میں مضامین کے برعکس دیگر تکنیکی خصوصیات کے علاوہ اصل چیز ذات کا ابلاغ ہے، جو ''تشہیر'' تک بن سکتا ہے اور صرف ایسے ہی نثر پارے کو انشائیہ قرار دینا چاہئے۔ اگر اس میں یہ اساسی صفت نہ ہو تو اسے عام مضمون کہنا چاہئے۔ انشائیہ کی تکنیک سے وابستہ تمام خصوصیات مضمون میں بھی مل سکتی ہیں اور مضمون کیا بعض اوقات تو ''تاثراتی افسانہ'' میں بھی نظر آتی ہیں، تو کیا ان فن پاروں کو بھی انشائیہ سمجھا جائے؟ مگر ہم انہیں افسانہ ہی شمار کرتے ہیں جب ایسا ہے تو پھر ''مضمون'' اور ''انشائیہ'' کو بھی غلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔

سب سے بڑی الجھن طنز و مزاح سے پیدا ہوئی۔ بالعموم طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کو بھی انشائیہ سمجھ لیا گیا۔ اس ضمن میں ایک بڑے کام کی بات یہ کہی گئی ہے کہ ''طنز اور مزاح ادب کی صنف نہیں، اسلوب کی صفت ہیں اور اسلوب کی یہ صفات ادب کی ہر صنف میں دیکھی اور برتی جا سکتی ہے۔'' (نظیر صدیقی)

یہ تجزیہ بڑی حد تک درست ہے۔ مگر اس رائے میں مقصد اور نقطہ نظر کی اہمیت فراموش ہو گئی۔ ہمیں تمام اصناف ادب میں ہلکا یا گہرا طنز یا مزاح مل سکتا ہے مگر ہم ان کے مصنفوں کو طنز نگار یا مزاح نگار نہیں کہتے کیونکہ جب کسی افسانہ یا ڈرامے میں کسی کردار کی شخصیت کی ناہمواریوں سے مزاح کا رنگ لایا جاتا ہے، یا کسی واقعہ پر طنزیہ انداز سے چھینٹا پھینکا جاتا ہے تو اس کا بنیادی مقصد مزاح یا طنز نہیں ہوتا بلکہ مقصد تخلیق اور نقطہ نظر کی صراحت کے لئے ثانوی مواد ہوتا ہے جبکہ مزاح نگار معاشرہ، انسان اور انسانی زندگی کی ناہمواریوں، خامیوں اور پیچیدگیوں کو بدلنے کی خاطر قلم میں زہرناکی، تلخی یا آتش بھر لی جائے تو یہ طنز ہے۔ اول الذکر

میں طنز و مزاح سے نقطہ نظر کی وضاحت کا کام لیا جاتا ہے اور موخر الذکر میں طنز و مزاح ہی کو اولیت یا تقدم حاصل ہے۔ یہ بے مقصد بھی ہو سکتے ہیں اور با مقصد بھی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ انشائیہ کا یہ عالم نہیں۔ یہاں مصنف اپنی ذات کا کوئی پہلو قاری کے سامنے لانا چاہتا ہے یا تو وہ بلاواسطہ طریقے سے ایسا کرے گا یعنی سوانحی مواد سے کام لیتے ہوئے اپنی سائیکی کی گہرائیوں میں جھانکنے کا موقع دیا ہے۔ ورنہ بالعموم وہ بالواسطہ طور سے ہی ''ذاتی'' اور ''نجی'' خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ایسے خیالات جن کا منطقی ہونا تو ضروری نہیں مگر ہم انہیں لایعنی، بیہودہ اور غلط بھی نہیں کہہ سکتے۔ انشائیہ نگار اس مقصد کے لئے طنز و مزاح سے بھی کام لے سکتا ہے، لیکن صرف اسلوب میں شگفتگی اور اظہار میں تازگی پیدا کرنے کے لئے۔ اس طرح قاری کو اکتاہٹ سے محفوظ رکھا جاتا ہے کبھی یہ ایک نوع کا ''سیفٹی والو'' بن جاتا ہے۔ پطرس، شفیق الرحمٰن یا شوکت تھانوی کے ناموں سے ہمارے ذہن میں مزاح کا خیال ہی آتا ہے۔ کنھیا لال کپور، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس سے طنز کی طرف دھیان جاتا ہے لیکن مثلاً، وزیر آغا کے نام سے طنز یا مزاح کا تصور ذہن میں نہیں ابھرتا، حالانکہ انہوں نے تو اس موضوع پر پی ایچ ڈی بھی کر رکھی ہے اور یہ اس لئے کہ وہ خالص انشائیہ نگار ہیں۔ میری دانست میں اس تقسیم سے اصطلاحات کا مفہوم معین کرنے میں مدد مل سکتی ہے اور اگر ہم طنزیہ مضمون، مزاحیہ مضمون و اصلاحی مضمون کے موضوع اور مقصد کو الگ الگ سمجھ لیں تو دیگر اقسام کو انشائیہ کے ساتھ خلط ملط کرنے کی بحث پیدا نہیں ہوگی، بہر نوع انشائیہ کے لئے ہمیں انکشاف ذات اور ابلاغ ذات کے وصف کو بنیادی شرط ماننا پڑے گا۔ اور آخر میں ایک ہدایات نامہ انشائیہ نگار کے لئے:

۱۔ غیر ضروری طوالت سے بچو!

۲۔ کہنے کو نئی بات نہیں تو انشائیہ سے دور رہو۔

۳۔ اسلوب انشائیہ کی جان ہے۔

۴۔ مشاہدہ کے لئے رنگین نہیں بلکہ سفید شیشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

۵۔ انشائیہ کا سنگھار۔ ذاتی سوچ

۶۔ انشائیہ میں خوش طبعی کا جوہر شخصیت سے عیاں ہوتا ہے۔

۷۔ افراط و تفریط سے بچو!

۸۔ بور مت کرو۔

۹۔ ذات کے بغیر انکشاف ذات کیسے ممکن؟

۱۰۔ خود سوچو اور دوسروں کو سوچنے کا موقع دو۔

۱۱۔ انشائیہ آزاد بندوں کی دنیا ہے۔

۱۲۔ کبھی یہ بھی سوچا کہ تم انشائیہ کی صنف کے لئے باعث خطرہ ثابت ہو سکتے ہو۔

۱۳۔ ناکام ادیب کامیاب انشائیہ نگار نہیں ہو سکتا!

□□□

سلیم آغا قزلباش

انشائیہ ایک ہمہ جہت صنف نثر

گزشتہ دس بارہ برسوں میں انشائیہ نگاری کے فن پر مختلف حوالوں سے لاتعداد مضامین لکھے جا چکے ہیں، جن سے انشائیہ کے خدوخال اور اس کے مزاج کو متعین کرنے میں بڑی مدد ملی ہے اور اب یہ پھبتی قریب قریب اپنی موت آپ مر چکی ہے کہ ''چونکہ انشائیہ ایک نزاعی صنف نثر ہے لہٰذا اس کو پڑھنا اور سمجھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہاں میں ایک دلچسپ حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ کہ پچھلے دس سالوں میں جو نام انشائیہ نگاری کے افق پر طلوع ہوئے، اُن میں زیادہ تعداد نوجوان قلم کاروں کی ہے۔ اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ نوجوان بڑی حد تک لبرل انداز فکر رکھتے ہیں۔ نیز انہیں خود پر پہلے سے چڑھے ہوئے کسی روایتی خول کو بھی توڑنا نہیں پڑتا۔ اس کے مقابلے میں اکثر پرانے قلم کار چونکہ ''مبتلائے خمار رسوم و قیود'' ہیں' اس لئے شعوری طور پر اس صنف نثر کی مخالفت کرتے ہیں تاکہ ان کی ''وضعداری'' کا بھرم قائم رہے۔ بہر حال بزرگ اہل قلم کے اس سخت گیر رویئے سے جہاں انشائیہ کو اُردو ادب میں قدم جمانے میں کافی زور آزمائی کرنا پڑی وہاں نوجوان نسل نے اسے بطور چیلنج قبول کیا اور مختصر مدت میں مضامین نو کے انبار لگا دیئے۔ اب اُردو انشائیہ ایک ایسے مرکزی نقطے پر کھڑا ہے، جس کے ایک طرف منجھے ہوئے انشائیہ نگاروں کا تجربہ ہے تو دوسری طرف نوجوان انشائیہ نگاروں کا جوش و خروش اور جب عقل اور جذبہ ایک دوسرے سے مصافحہ کر لیں تو پھر برسوں کا فاصلہ دنوں میں طے ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اب تک انشائیہ نگاری کے ضمن میں جو مباحث ہو چکے ہیں ان کو سامنے رکھ کر انشائیہ نگاری کے فن کا اجمالی جائزہ پیش کروں تاکہ ادب کا ایک عام قاری انشائیہ کے بارے میں زیادہ وثوق سے غور و فکر کر سکے

اور اس قسم کی ''بالک ہٹ'' کا مظاہرہ نہ کرے جو بعض ادبی حلقوں میں اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ کڑے سے کڑے اندازے کے مطابق بھی انشائیہ کو اردو ادب میں داخل ہوئے پچیس برس ہونے کو آئے ہیں۔ گویا اُردو انشائیہ ''سلور جوبلی'' منانے کی حدود میں داخل ہو گیا ہے۔ لہٰذا میں یہ مضمون اسی موقع کے حوالے سے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

انشائیے کی تعریف کے سلسلے میں "Great Essays" کے مرتب ہاوسٹن پیٹرسن رقمطراز ہیں:

''ایسے کا مطلب تحریر کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا ہو گا جس میں کسی بھی موضوع سے بحث کی گئی ہو مگر شخصی، غیر رسمی اور غیر مصنوعی انداز میں ''ایسے'' مفکرانہ ہو گا لیکن سنجیدہ نہیں۔ وہ فلسفے سے قریب ہو گا لیکن فلسفے کی طرح باقاعدہ نہیں۔ اس میں ایک قسم کی ڈھیلی ڈھالی وحدت ہو گی لیکن اس میں اصل موضوع سے مسرت بخش انحراف بھی ہو گا۔ وہ ہمیں مصنف کی رائے سے اتفاق کی ترغیب دے سکتا ہے لیکن وہ ہمیں اتفاق رائے پر مجبور نہ کرے گا۔ ''ایسے اسٹ'' چاہے اور جو کچھ بھی ہو، وہ ہمارا دوست اور لفظوں کا فنکار ہوتا ہے۔۔۔۔''

اپنی اس رائے میں پیٹرسن نے نہایت خوش اسلوبی سے صنف انشائیہ کے اجزائے ترکیبی کو بیان کیا ہے، پھر یہ کہ اس تعریف میں انشائیہ نگاری کے وہ تمام بنیادی پہلو یکجا ہو گئے ہیں جن کا ہر اچھے انشائیے میں موجود ہونا ضروری ہے جن میں سے کسی ایک کی عدم موجودگی سے انشائیہ کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ خاص طور پر یہ تعریف ان حضرات کے لئے سوچ کا وافر سامان مہیا کرتی ہے جو انشائیہ کے عناصر ترکیبی میں سے کسی ایک کو ہی تمام تر اہمیت تفویض کرتے ہیں اور یوں انشائیہ کی ہمہ گیری کو ختم کرنے کی سعی فرماتے ہیں۔

آلڈس ہکسلے کے نزدیک:

''سب سے تسلی بخش Essay وہ ہیں جن میں قلم کار اپنی ذات سے لے کر کائنات تک، مجرد سے لے کر محسوس تک اور خارجی سے لے

کر باطنی دنیاؤں تک کے مراحل طے کر جائے۔۔۔''

آلڈس ہکسلے کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ انشائیہ وحدت الوجودی یا وحدت الشہودی مزاج رکھنے والی کوئی شے ہے بالکل ناسمجھی والی بات ہو گی۔ اس بیان میں انشائیہ نگار کی وسیع المشربی اور اس کے غور و فکر کے پھیلاؤ کو واضح کیا گیا ہے نیز یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر انشائیہ نگار کی شخصیت میں عالمگیر موجزن ہو تو زمان و مکان کے فاصلے خود بخود طے ہونے لگتے ہیں۔

آر۔ ڈبلیو جیپسن Essays By Modern Writers میں لکھتا ہے:

''انشائیہ کسی بھی واقعہ کی تشریح تفسیر یا بیان ہو سکتا ہے۔ اس میں استدلالی، تنقیدی، مباحثی یا سوانحی تحریریں شامل کی جاسکتی ہیں۔''

اور "Modern Essay" میں سی۔ ڈی پنچور قمطراز ہے:

''انشائیہ ایک تجربہ ہے۔ انشائیہ کا لب و لہجہ سبک بھی ہو سکتا ہے اور سنجیدہ بھی، اس میں کوئی کہانی، کسی واقعہ کی منظر کشی یا کسی نظریہ کی تشریح ہو سکتی ہے۔ بنیادی طور پر انشائیہ کا مقصد اور مطمح نظر تفریح و انبساط ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی قسم کی تعلیم یا تبلیغ نہیں ہونا چاہئے۔''

ان دونوں تعریفوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ بات سامنے آئے گی کہ دونوں حضرات نے کسی واقعہ یا نظریہ کی تشریح کو انشائیہ کی بنت میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بقول مشتاق قمر یہ کہنا ہے کہ ''ہر اچھے فنکار میں توضیحی رویہ کم اور تشریحی انداز زیادہ ملتا ہے۔''(۱) لیکن اگر تشریحی سے مراد ٹھوس خیالات کی استدلالی و منطقیانہ تشریح مراد لی جائے تو مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کیونکہ یہ کام تو مقالے کا ہے نہ کہ انشائیے کا۔ اس طرح سوانحی تحریروں کے لئے جب Autobiography کی الگ صنف موجود ہے تو پھر انشائیہ پر یہ عتاب کیوں کر نازل کیا جائے۔ ہاں البتہ اتنی بات ضرور کہی جاسکتی ہے کہ کسی انشائیہ نگار کے انشائیوں کے مطالعہ سے اگر اس کی سوانح عمری کا خاکہ ابھر آئے تو یہ ایک دلچسپ چیز ہو گی اور ریسرچ اسکالر کے کام آئے گی اور بس! نہ کہ اسے انشائیہ کے جزو لاینفک قرار دیا

جائے۔ سی۔ ڈی۔ چٹو کی یہ بات خیال افروز ہے کہ انشائیہ کسی قسم کی تعلیم یا تبلیغ کا انداز اختیار نہیں کرتا کیونکہ انشائیہ Sermon نہیں ہے کہ پند و نصائح کا بوجھ سہار سکے، یہ کام کٹھ ملاؤں، مصلحین یا پادریوں کا ہے۔ انشائیہ کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ نیاز فتح پوری صاحب فرماتے ہیں:

''یہ ہے ایک قسم کی Soliloquy زیادہ تر Subjective قسم کی
جسے ہم Self Communication بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم
کے فکر و تصور کا نتیجہ ہے۔ جس میں تجزیہ جذبات، نفسیاتی مطالعہ، منطقی
استدلال، فلسفیانہ تفکر، متصوفانہ استقراء اور انشاء عالیہ کا جمالیاتی
اسلوب سب کچھ پایا جاتا ہے۔'' (اعتراف وتعارف اُردو لیسیز)

اگرچہ نیاز فتح پوری صاحب کے زمانہ میں انشائیہ نگاری کے خطوط پوری طرح اجاگر نہیں ہوئے تھے تاہم انہوں نے انشائیہ فہمی کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ خاص طور پر متصوفانہ استقراء اور فلسفیانہ تفکر کے پہلوان قلم کاروں کے لئے لمحہ فکریہ ہیں جو انشائیے کو گڈی گڈے کا کھیل سمجھتے ہیں اور لفظی اچھل کود اور چہل کو انشائیہ کا امتیازنشان قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ فلسفیانہ تفکر کا مطلب افلاطون یا ارسطو کے اقوال زریں نہیں ہیں اور متصوفانہ استقراء کے معنی علمی بحث کا سا انداز نظر اختیار کر کے خود کو منفرد کرنا بھی نہیں ہے بلکہ ان دونوں اصطلاحوں کا مطب اگر Pure Wisdom لیا جائے تو مجھے نیاز فتح پوری صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق ہے۔ البتہ منطقی استدلال کا عنصر انشائیے کے مزاج کے منافی ہے، گو نفسیاتی مطالعہ والی بات انشائیہ کے دائرہ کار میں شامل ہے۔

احتشام حسین صاحب کا فرمایا ہے کہ:

''انشائیہ کو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہئے جو پڑھنے
والوں کے ذہن میں استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب
اور بے ترتیب انداز بیان کے ذریعے اپنا تاثر قائم کرے۔''

''اُردو انشائیہ'' (مرتبہ: سید صفی مرتضیٰ)

احتشام صاحب کی یہ رائے بڑی دلچسپ ہے، اس میں انہوں نے استدلالی کو رد کر کے ''فلسفیانہ شگفتگی'' کے حوالے سے اپنی بات کو واضح کیا ہے۔ ایک اچھے انشائیے میں فلسفیانہ شگفتگی ضروری ہے جو خوشگوار استعجاب کو تحریک دے کر قاری کو غور و فکر پر مائل کر سکے۔ جہاں تک ''بے ترتیب انداز بیان'' کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ بے ترتیبی یعنی Disoroder کی اصطلاح کا جو بے محابا استعمال انشائیہ کی تکنیک کے سلسلے میں کیا گیا ہے اس نے اکثر قارئین اور بشتر ناقدین کی سوچ کو بے ترتیب کر دیا ہے۔ وہ نجانے کیوں اس بات کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ بے ترتیبی میں بھی ایک اندرونی ترتیب مضمر ہوتی ہے جسے انشائیہ نگار اپنی تیسری آنکھ سے ڈھونڈ نکالتا ہے اور پھر اپنے طرز تحریر کے ذریعے Delight in Disorder والی کیفیت پیدا کر لیتا ہے، جس سے تحریر کی معنویت نکھر آتی ہے۔ وہ لوگ جو Disorder کی اصطلاح کو بالکل ڈھیلی ڈھالی اور غیر مربوط کے معنوں میں لیتے ہیں وہ انشائیے کے مزاج سے بخوبی آشنا نہیں ہیں۔ محمد ارشاد صاحب اپنے مضمون ''موٹین انشائیہ اور انشائیہ نگار'' میں لکھتے ہیں:

''انشائیہ وہ صنف نثر ہے، جس میں کسی بھی علمی اور سماجی اہمیت
کے حامل موضوع پر استقرائی طور پر حاصل کردہ معلومات اور ان پر مبنی
آرا کو شخصی نقطہ نظر کے طور پر گھریلو پیرائیہ بیان میں اس طرح پیش کیا
جائے کہ موجودہ ترتیب میں نظم وضبط اور معلومات میں اضافے کی
صورت میں آرا پر نظر ثانی کی گنجائش موجود ہو۔''

یہ رائے اس لئے محل نظر ہے کہ اس کے مطابق علمی اور سماجی اہمیت کے حامل موضوعات اور معلومات کو شخصی پیرائے میں بیان کرنے کو انشائیہ نگاری متصور کیا گیا ہے حالانکہ انشائیہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ موضوعات اور ان سے متعلق معلومات کی قلب ماہیت ہو جو ظاہر ہے کہ انشائیہ نگار کی تخلیقی اپج کے بغیر ممکن نہیں۔ محمد ارشاد صاحب کی رائے کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر انشائیہ ایک میکانکی انداز میں لکھی گئی ایسی تحریر قرار پائے گا جس میں معلومات کو واحد متکلم کے انداز میں بیان کر دیا گیا ہے یا موضوع کو اس کے علمی بلندی

سے نیچے اتار کر محض گھریلو زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسی تحریر انشائیہ کی پروڈی تو کہلا سکتی ہے مگر اسے انشائیہ کہنا ممکن نہیں ہے۔ عبدالماجد دریابادی کے بقول:

> ''انشائیہ کی امتیازی خصوصیت حسن انشا ہے۔ یہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ انشائیہ وہ ہے جس میں مغز و مضمون کی اصل توجہ حسن عبارت پر ہو۔'' (''ادیب'' علی گڑھ۔ ''انشائیہ نمبر'')

اس تعریف میں انشائیہ کی زبان و بیان کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ عبدالماجد دریابادی کی یہ رائے فنی اعتبار سے بالکل درست ہے کہ انشائیہ میں زبان کا بڑا اہتمام کرنا پڑتا ہے کیونکہ کھلتی ہوئی تحریر ہی انشائیے کے حسن کو نکھارتی ہے۔ غیر مانوس الفاظ اور غیر تخلیقی اور آزمائشی زبان سے انشائیہ کی روانی میں رکاوٹ آجاتی ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ کے خیال میں:

> ''خود ساختہ رسوم و قوانین میں جکڑا ہوا انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر آزادی کی ایک ایک سانس کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ انشائیوں میں ایک انسان یا فنکار کے اسی جذبہ حریت کی تسکین ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار ہمیشہ ایک حقیقت کی طرف لوٹنا چاہتا ہے۔ وہ بت پرست نہیں بلکہ بت شکن ہے۔''

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> ''وہ (یعنی انشائیہ نگار) تو اپنے پڑھنے والے کو دوستانہ انداز میں زندگی کے ان انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں سے روشناس کراتا ہے جو عام نظروں سے پوشیدہ رہے ہوں۔'' (''انشائیہ'' بمبئی 1965ء)

ڈاکٹر آدم شیخ انشائیوں کو جذبہ حریت کی تسکین کا وسیلہ قرار دے کر ان حضرات کو لاجواب کر دیا ہے جو کہتے ہیں کہ انشائیہ ایک غیر مقصدی صنف ادب ہے اور کسی چیز کے حصول کا وسیلہ نہیں بنتی۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر آدم شیخ نے انشائیہ نگار کو بت پرست نہیں بت شکن قرار دیا ہے اور یہ بات واقعی درست ہے کہ انشائیہ نگار رسوم و قیود میں جکڑے ہوئے انسان کی اس انفعالی حالت کے خلاف ایک کھلا احتجاج ہے جو اسے بت پرستی پر مجبور کر دیتی ہے۔ آرنلڈ ٹائن بی کا کہنا ہے کہ تہذیب جو روبہ زوال ہوتی ہے تو وہ کئی طرح کے بت گھڑ

لیتی ہے، جن میں پرانی رسوم و روایات کا بت بھی شامل ہوتا ہے۔ لہٰذا انشائیہ نگار کا بت کو توڑنا اس زوال آمادہ ذہنیت کے خلاف واضح اعلان جنگ ہے جو کسی نئے تجربے یا خیال کو اپنے اردگرد پھٹکنے نہیں دیتی اور پیش پا افتادہ ڈگر پر آنکھیں بند کر کے چلنا چاہتی ہے۔ یہ چیز انشائیہ کی فعالیت کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ ڈاکٹر آدم شیخ کی دوسری بات بھی سو فی صد درست ہے کہ انشائیہ زندگی کے انوکھے اور دلچسپ پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتا ہے اور یوں ان مخفی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے جو عام قاری کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ پہلو انشائیہ کی سب سے بڑی پہچان ہے اور ڈاکٹر آدم شیخ نے ایک اچھے نباض کا ثبوت مہیا کیا ہے۔

انشائیہ میں ایجاز و اختصار کو ملحوظ خاطر رکھنا بہت ضروری ہے مگر شرط یہ ہے کہ اس سے انقباض کی صورت پیدا نہ ہو بلکہ اس کے اختصار کا دامن وسیع نظر آئے چنانچہ بعض ناقدین نے اسی بات کے پیش نظر انشائیہ کو غزل کے مماثل قرار دیا ہے۔ مثلاً ''خیال پارے'' کے دیباچے کے مطابق:

> ''انشائیہ اور غزل کے ایک شعر میں گہری مماثلت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ غزل کے شعر کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی ایک نکتہ کو اجاگر تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے تمام پہلوؤں کو ناظر کے فکر و ادراک کے لئے ناممکن صورت میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہی حال انشائیہ کا ہے اس میں موضوع کے صرف چند ایک انوکھے پہلوؤں کو پیش کر دیا جاتا ہے اور اس کے بہت سے دوسرے پہلو تشنہ اور ناممکن حالت میں رہ جاتے ہیں۔''

بنجمن اے ہیڈرک "Types of Essays" میں رقمطراز ہے:

> ''عام طور پر یہ (انشائیہ) مصنف کی شخصیت کا کسی نہ کسی حد تک انکشاف کرتا ہے اور اس لحاظ سے یہ شاعری میں لیرک Lyric سے مشابہ ہے۔''

اسی طرح ڈاکٹر محمد حسنین کا ارشاد ہے کہ:

"انشائیہ نثر کی غزل ہے۔ جس کا ہر جرعہ ایک نیا کیف و سرور بخشتا ہے۔"

نیز ڈاکٹر صاحب نے انشائیہ کو صنف کیفیہ سے بھی موسوم کیا ہے۔

(صنف انشائیہ اور انشائیے)

ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب کے نزدیک:

"معلومات کا فراہم کرنا اس کا مقصد نہیں۔ اس کی نوعیت ذاتی اور انفرادی ہے۔ ایک داخلی آہنگ بھی اس میں پایا جاتا ہے جس کی حدیں غنائیت سے جا ملتی ہیں۔" ("ادیب" علی گڑھ۔ "انشائیہ نمبر")

غلام جیلانی اصغر صاحب کے مطابق:

"مزاج کے لحاظ سے غزل اور انشائیہ میں کوئی فرق نہیں لیکن ہیئت کے لحاظ سے یہ دونوں اصناف جداگانہ خاصیتوں کی حامل ہیں۔"

("ادبی دنیا"۔ "بحث انشائیہ کیا ہے؟" خاص نمبر ۹)

جبکہ جمیل آذر صاحب کے خیال میں:

"انشائیہ میں غزل کا سا ایجاز، افسانے کا تاثر، ناول کا سا فلسفہ حیات اور ڈرامے کے انتظار یہ لمحات اور اس کے پس منظر میں طنز و مزاح کی دھیمی دھیمی سمفنی ہوتی ہے اور ان سب پر مستزاد انکشاف ذات جو خاص انشائیے کے لئے مختص ہے۔"

("اوراق" 1966ء "انشائیہ ایک لطیف صنف نثر")

سجاد نقوی صاحب کا کہنا ہے کہ:

"انشائیہ پڑھتے ہوئے میں نے ایک بیٹھک میں افسانے کا سا لطف بھی حاصل کیا، فلسفہ اور حکومت کی باتوں سے بصیرت بھی پائی اور وہ حظ بھی اٹھایا جو اچھے شعر کو سن کر حاصل ہوتا ہے۔"

("اوراق" 1972ء "افسانہ انشائیہ نمبر"۔ "انشائیہ۔ ایک بحث")

مندرجہ بالا آراء میں ایک چیز قدر مشترک ہے اور وہ ہے انشائیہ میں شاعرانہ عناصر کی موجودگی۔ مگر میرے خیال میں انشائیہ غزل کے شعر سے نہیں بلکہ غزل مسلسل سے مشابہ ہے جس کا ہر شعر دوسرے شعر یعنی خیال کو کروٹ دیتا ہے، جس سے معنی کا پیکر قدم بہ قدم ایک داخلی آہنگ کے زور پر پھیلتا چلا جاتا ہے اور قاری Elevation کی سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ غزل کی طرح انشائیہ میں کئی پہلو تشنہ بھی رہ جاتے ہیں مگر اس تشنگی کو قاری اپنی سوچ بچار سے پورا کر لیتا ہے۔ جہاں تک "کیفیہ" کی اصطلاح کا معاملہ ہے تو اس ضمن میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیفیہ ایک قسم کا کیتھارسس ہے اور ہر معیاری انشائیہ ایک حد تک فرد کی ناآسودگی کا وجدانی Intuitive سطح پر تزکیہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک دوسرا پہلو بھی غور طلب ہے کہ انشائیے میں دیگر اصناف نثر کی خوبو پائی جاتی ہے مگر اس سے یہ قطعاً مراد نہیں ہے کہ انشائیہ محض دیگر اصناف کا مرکب ہے اور اس کی الگ پہچان نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کی یہ رائے بہت وزنی ہے کہ:

"افسانوی یا ڈرامائی عناصر انشائیے کی ترتیب میں قیمتی اجزا کا کام تو دے سکتے ہیں لیکن اس کا مجموعی مزاج نہیں بن سکتے۔"

ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے خیال میں:

انشائیے میں طنز اور فلسفیانہ مباحث خام صورت میں ہو سکتے ہیں بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی ادب پارے کی اوپر کی سطح پر تلخی اور منطق کی سنجیدگی ہو لیکن نیچے کی سطح میں انشائیے کی آزادہ روی کارفرما ہو۔"

("انشائیہ۔ ایک بحث" "افسانہ انشائیہ نمبر" 1972ء "اوراق")۔

اگر ڈاکٹر صاحب کی فلسفیانہ مباحث اور منطق سے مراد Wisdom کا استعمال ہے تو مجھے ان کی بات سے اتفاق ہے۔ اسی طرح اگر سنجیدگی سے مراد نپے تلے پیرائے میں کسی خیال، تجربے یا چیز میں مضمر کسی گہرے معنی کا اظہار مقصود ہے تو مجھے یہ بات بھی قبول ہے۔

غلام جیلانی اصغر صاحب کا کہنا ہے کہ:

"انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جو اتنی ہی بے ربط ہے جتنی

کہ زندگی خود اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت وجود
میں آجاتی ہے اسی طرح انشائیے کے منتشر اجزاء میں دیکھتے ہی
دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی خود کئی اجزاء سے
عبارت ہے۔ انشائیہ کی بھی یہی خوبی یا خصوصیت ہے، یہ اجزا فکری
بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے
اور محسوسات کے وسیع تر امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔ آپ جب
انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی ساز اور یہ
مل جاتا ہے۔"

("انشائیہ کیا؟" "افسانہ انشائیہ نمبر" 1972ء "اوراق")

اس تعریف میں لفظ "بے ربط" کو کوئی بندۂ خدا لغوی معنی میں لے تو اس سے فقط ہمدردی ہی کی جا سکتی ہے۔ دراصل "بے ربط" کی یہ اصطلاح Unity in Diversity کے معنوں میں ہے لہٰذا یہ کہنا کہ انشائیہ مجموعہ اضداد ہے بالکل غلط ہے۔ البتہ انشائیہ کی اکائی یا وحدت کو دیکھنے کے لئے تیسری آنکھ کی ضرورت پڑتی ہے۔ مشکور حسین یاد صاحب کے نزدیک:

"انشائیہ کے لئے نہ مزاح ضروری ہے اور نہ سنجیدگی۔ انشائیہ
نگار اپنے قاری کو خوش بھی کر سکتا ہے اور اداس بھی۔ البتہ جو چیز لازمی
ہے وہ جذبہ اور فکر کا اچھوتا پن ہے۔ اگر کسی لکھنے والے کے پاس اپنے
تجربہ اور احساس وخیال کی ندرت موجود نہیں ہے تو وہ کبھی بھی ایک
کامیاب انشائیہ نہیں لکھ سکتا۔"

("انشائیہ ایک بحث" "افسانہ انشائیہ نمبر" 1972 اوراق")

اس رائے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مجھے ان سے کلی اتفاق ہے لیکن ذرا غور سے اس رائے کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا اطلاق تقریباً تمام اصناف نثر پر کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب لکھتے ہیں:

"انشائیہ دراصل مہذب ذہن کی ترجمانی کا نام ہے۔ اس کو

مہذب معاشرے میں لکھا جا سکتا ہے اور اس سے مہذب قاری لطف
اندوز ہوتا ہے۔ لیکن انشائیہ ہر ذہن کے لئے نہیں ہے، یہ تو بالغ ذہن
کے حامل مرد کے لئے ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو تیار ہوں کہ صرف انشائیہ ہی
خالص نثری صنف ہے ورنہ کہانی اور ڈرامہ تک سبھی کچھ منظوم ہو سکتا
ہے۔ اچھی نثر کے بغیر انشائیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

("اوراق" "افسانہ انشائیہ نمبر" 1972ء "مضمون انشائیہ کیوں؟")

ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے اپنے اس بیان میں انشائیہ کو مہذب ذہن کی ترجمانی قرار دے کر اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ انشائیہ نگار کے لئے Polished ہونا ازبس ضروری ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے انشائیے کو خالص نثری صنف قرار دے کر اس کی توقیر اور اہمیت کا واشگاف اقرار کیا ہے اور یہ بیان انشائیہ کی اثر پذیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ البتہ ان کا یہ کہنا کہ انشائیہ صرف بالغ ذہن کے حامل مرد کے لئے ہے، محل نظر ہے۔ خود مرد کے ہاں Anima اور عورت کے ہاں Animus کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ نفسیات اور پھر ادب میں اس قسم کی صنفی برتری یا تخصیص کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس سلسلے میں توجہ طلب رائے مرزا حامد بیگ کی ہے وہ لکھتے ہیں:

"مجھے اعلیٰ انشائیہ میں جذباتی سطح پر مادر سری اصول کی کارفرمائی اور پدر
سری اصول کا ٹھہراؤ اور بردباری کا ایک توازن نظر آیا ہے۔"

("انشائیہ کی کونپل" جنوری فروری 1978ء "اوراق")

میرے خیال میں وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انشائیہ اور انفعالیت کا سنگم ہے، گویا یہ سونے جاگنے کی ایک ایسی درمیانی کیفیت ہے کہ جب آنکھ پوری طرح کھلی ہے تو آدمی حیرت زا مسرت سے دوچار ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور کہاں پہنچ گیا یا پھر دوسرے لفظوں میں یہ جان لیجئے کہ مادر سری اور پدر سری اصول کا مطلب افق عمودی دونوں زاویوں کا انشائیہ

میں شامل ہوتا ہے۔

اب آیئے ایک اور مسئلے کی طرف! مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم ایسے کے ساتھ Light کا سابقہ لگاتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے۔ کیا Light کا مطلب محض ہلکا پھلکا ہوتا ہے یا کچھ اور؟ اس ضمن میں پروفیسر محمد یاسین کی رائے ہے کہ:

"انشائیہ ادب لطیف کی وہ صنف ہے جسے ہم عام طور پر ہلکے پھلکے Light Literature سے منسوب کرتے ہیں یعنی جس میں انشاپردازی کا مقصد علمی و ادبی یا سیاسی و سماجی اصطلاح نہیں بلکہ محض نشاطی اور انبساطی ہے۔" ("ادیب" علی گڑھ۔ "انشائیہ نمبر")

اس سلسلے میں یہ بات غور طلب ہے کہ انشائیہ کو مضمون Essay یا جواب مضمون سے ممیز کرنے کے لئے جب Light Essay کی اصطلاح برتی جاتی ہے تو اس سے عموماً یہ بات اخذ کر لی جاتی ہے کہ Light کے معنی ہلکا پن، ہلکا پھلکا یا Happy یعنی خوش ہونے اور خوش کرنے کے ہیں۔ اس لئے انفرادی سوچ بچار، انکشاف ذات، نکتہ آفرینی اور پاسبان عقل کی موجودگی انشائیہ میں جائز نہیں ہے۔ جیسے نظیر صدیقی صاحب کا یہ ارشاد کہ:

"انشائیہ کسی نہ کسی اعتبار سے غیر سنجیدہ یعنی لائٹ ہوتا ہے"

("انشائیہ کیا"؟ بحث "ادبی دنیا" شمارہ نہم)

چنانچہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر اچھے بھلے قلم کار اپنی تحریروں میں لطیفے، چٹکلے اور ہنسی ٹھٹھے اور چہل ایسے اجزاء کو یکجا کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے انشائیہ لکھ لیا ہے حالانکہ Light کے معنی Knowledge-Aspect اور Thing to Ignite Something وغیرہ کے بھی ہیں اور یہ انشائیہ کی مروجہ صورت میں زیادہ قرین قیاس ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ تینوں عناصر باہم یکجا ہو کر انشائیے میں Enlightenment کا جوہر پیدا کرتے ہیں جو فی الحقیقت انشائیے کی جان ہے۔ یہاں اس بات کو جاننا ازبس ضروری ہے کہ "نالج" سے مراد منطقی استدلال ٹھوس فلسفیانہ مبحث یا تحقیقی مواد جمع کرنا یا ترتیب سے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ موضوع کے بارے میں عمیق مشاہدہ مراد ہے۔ Aspect کا مطلب کسی چیز، تجربہ یا خیال میں پنہاں ان مختلف

پہلوؤں کی تخلیقی پیرائے میں نقاب کشائی ہے جو بظاہر مخفی معلوم ہوتے ہیں۔ نیز انشائیے میں شگفتہ یا پرمسرت ہونے کا مطلب Intellectual Pleasure اور جمالیاتی حظ کا حصول ہے نہ کہ ہنسی مذاق سے پیدا ہونے والی وقتی قسم کی Happiness کی تحصیل!

اور اب ہم انشائیہ کی اس Defination کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے بارے میں خاصی بحث و تمحیص ہو چکی ہے۔ تعریف ڈاکٹر جانسن کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

A loose sally of the mind' An irregular indigested piece' not a regular and orderly composition.(The English Essays and Essayists)

میرے نزدیک جانسن نے جس طرح اس تعریف میں انشائیہ کو ایک بے قاعدہ اور غیر منظم کمپوزیشن قرار دیتے ہوئے ناہضم مواد کا بے ترتیب ٹکڑا اور دانش کی ڈھیلی ڈھالی اختراع کہا ہے، ساری گڑبڑ اس تعریف کو محدود معنوں میں لینے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جانسن کی اس تعریف میں Indigested کا مطلب غیر ہضم شدہ مواد ہرگز نہیں۔ در اصل جانسن Primordial Images کی بات کرنا چاہتا ہے جو اصلاً ایک طرح کا کچا یا خام مواد ہوتا ہے۔ اسی طرح Regular نہ ہونے سے اس کی مراد یہ ہے کہ انشائیہ پیش پا افتادہ اسالیب اور کلیشیز کی قید و بند سے آزاد ہو، گو یا وہ۔۔۔ Loose Talk کی سفارش ہرگز نہیں کر رہا۔ دوسری جانب ہمارے ہاں یہ صورت ہے کہ ہم مغرب والوں کی ہر بات من و عن قبول کر لیتے ہیں چنانچہ یہی رویہ ہم نے جانسن کی تعریف کے سلسلے میں بھی برتا اور کہا کہ انشائیہ بالکل آزاد ہے اور ہم اس صنف کے لئے کسی قسم کی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔ یعنی "آزاد صنف نثر" کی اصطلاح نے اردو کے متعدد ناقدین اور بیشتر قارئین کو غلط فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے اور انہوں نے اس کا مفہوم مکمل آزادی یا بالفاظ دیگر مادر پدر آزادی کے معنوں میں قبول کر لیا ہے جو ظاہر ہے ان کی سادہ لوحی کا ثبوت ہے۔ در آں حالیکہ آزاد صنف نثر کے معنی یہ بھی تو ہو سکتے ہیں کہ وہ کسی مخصوص قسم کے اصلاحی رنگ، نظریات، تصورات و تعصبات یا سسٹمز Systems کا پرچار کرنے کی مجبوریوں سے "آزاد" ہو نیز اسے اختیار حاصل ہو کہ وہ جملہ علوم و فنون سے حسب منشا اکتساب کرے اور پھر انہیں ایک نئے زاویے اور ذاتی حوالے سے موضوع کی بنت میں کچھ اس طور شامل کر دے کہ ایک ایسی نئی پرت

اجاگر ہو جائے جو مسرت اور فکری حظ کے حصول کا ذریعہ بھی بن سکے۔ آزاد صنف نثر کا مطلب آزادیٔ فکر بھی ہو سکتا ہے نہ کہ اس کا مفہوم منتشر خیالی یا غیر منضبط ہونا سمجھ لیا جائے۔ اسی طرح پابندی سے مراد اگر پلاٹ، تقسیم، کردار یا وحدت زمانی و مکانی یا ٹھوس منطقی رویے کی پابندی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ انشائیہ اس قسم کی پابندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب Loose sally of the mind کی اصطلاح کو اندھا دھند قبول کر کے انشائیہ پر بات کی جائے تو آخری نتیجہ ڈاکٹر سید محمد حسنین کی اس رائے کی صورت میں برآمد ہوتا ہے کہ:

''انشائیہ میں داخلیت یعنی Subjectivity ہوتی ہے جو قلم کار کے اپنے تاثرات کو پیش کرتی ہے۔ یہ داخلیت مگر مجرد نہیں ہوتی۔ یہ سماجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی ہے۔''

(صنفِ انشائیہ اور اردو انشائیے)

آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح انشائیہ کی آزادہ روی آخر میں منفی شکل اختیار کر گئی یعنی آزادہ روی کو آوارہ خیالی Stray thoughts میں بدل دیا گیا جو ظاہر ہے کہ ایک گمراہ کن بات ہے۔ ویسے جانسن کی مہیا کردہ انشائیہ کی تعریف نے مغرب میں بھی خاصا ردعمل پیدا کیا چنانچہ C.H.Lockitt رقمطراز ہے کہ:

"We have travelled a long way from Johnson's Loose sally of the mind" His undigested meal has become a light digestible repast and his disorderly composition a carefully constructed and elaborately designed work of art".

انشائیہ کی ایک اور توجہ طلب ''تعریف'' ڈاکٹر وزیر آغا کی ہے وہ رقمطراز ہیں:

''انشائیہ اس تحریر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔''

(پیش لفظ۔ ''دوسرا کنارا'')

پیش کردہ تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

''اس تعریف میں یہ بات مضمر ہے کہ انشائیہ ایک تو اسلوب یا انشاء کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے یعنی زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرے دوسرے شے یا مظہر کے اندر چھپے ہوئے ایک نئے معنی کو سطح پر لائے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی بت تراش پتھر کی سل پر سے فاضل بوجھ اتار کر یا ہٹا کر اس کے اندر سے وہ شبیہ برآمد کرے جو ظاہری آنکھ سے تو پوشیدہ تھی لیکن جسے بت تراش کی باطنی آنکھ نے گرفت میں لے لیا تھا تیسرے انشائیہ ذہن کو بیدار اور متحرک کرے یعنی شعور کی توسیع کا اہتمام کرے۔ جب تک یہ تینوں باتیں یکجا نہ ہوں انشائیہ وجود میں نہیں آ سکتا۔'' (پیش لفظ۔ ''دوسرا کنارا'')

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ''تعریف'' اردو انشائیہ کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

اس سارے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انشائیہ کے اجزائے ترکیبی کے تعین کی حد تک تقریباً سبھی نقاد ایک دوسرے سے کافی حد تک اتفاق کرتے ہیں تو پھر نزاع کس بات پر ہے! اس سلسلے میں ایک مثال سے بات واضح کرنا چاہوں گا مثلاً اگر آپ کسی سے کہیں کہ ہر انسان کے دو ہاتھ پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، ایک منہ اور ناک ہوتا ہے تو وہ فوراً کہے گا کہ مجھے اس سے اتفاق ہے مگر جب ان تمام اشیاء کا مجموعہ یعنی گوشت پوست کا جیتا جاگتا آدمی اس شخص کے سامنے آ جائے گا تو وہ کہے گا صاحب میں تو اسے نہیں پہچانتا بالکل یہی مسئلہ انشائیہ کے ساتھ درپیش ہے کہ اس کے Salient Features پر تو تقریباً سبھی نقادوں کا اتفاق ہے یعنی اسے شخصی ہونا چاہئے، اس کا اسلوب شگفتہ ہوتا ہے یہ غور و فکر ابھارتا ہے، اس میں عدم تکمیل کا احساس ہوتا ہے وغیرہ۔ مگر جب ان تمام اجزائے ترکیبی کا مرکب ''انشائیہ'' سامنے آتا ہے تو اکثر قارئین کرام اسے پہچاننے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں گویا سارا مسئلہ اس کی پہچان کا ہے نہ کہ اس کی تعریف اور دائرہ کار کا!

مختلف نقادوں کی آراء کا تجزیہ کرنے کے بعد اب میں مجموعی حوالے سے انشائیہ نگاری

کے فن کا محاکمہ پیش کرنا چاہوں گا تا کہ ایک متحرک تصویر نظروں کے سامنے آجائے اور ہم انشائیہ کے ہمہ جہت مزاج کا احاطہ کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔

انشائیہ ذہن کی آزاد ترنگ ان معنوں میں ہرگز نہیں ہے کہ اسے ''شعور کی رو'' سے ملتی جلتی تکنیک والی کوئی تحریک سمجھ کر جب چاہیں ماضی کے واقعات حال کے تجربات یا مستقبل کے سہانے سپنوں کو آپس میں گڈمڈ کر کے کاغذ پر منتقل کرنا شروع کر دیں اور پھر دعویٰ کریں کہ انشائیہ جس قسم کے آزاد تلازمہ خیال کا تقاضا کرتا ہے وہ ہم نے پورا کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انشائیہ ایک گتھی ہوئی تحریر ہے جس میں ایک نقطہ خیال دوسرے نقطہ خیال سے پھوٹتا ہے اور پھیل کر دوبارہ پہلے نقطے میں سمٹ آتا ہے مگر اس فرق کے ساتھ کہ جب یہ دوبارہ مرکزی نقطے کو چھوتا ہے تو معنی کی ایک نئی پرت، فکر کا ایک انوکھا زاویہ اور خیال کی ایک تازہ لہر نمودار ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ انشائیہ کا مرکزی خیال ''باؤلر'' کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گیند ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اسے زوردار چھکے کی صورت میں ابھری ہوئی وکٹوں کی طرف اچھالتا ہے مگر یہ گیند تھوڑی دیر بعد مختلف ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی دوبارہ باؤلر کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ یہی حال انشائیہ کے مرکزی نقطے کا ہے کہ وہ مختلف موضوعات کو چھونے کے بعد دوبارہ انشائیہ نگار کے ساتھ میں آجاتا ہے، بلکہ انشائیہ لکھتے ہوئے اگر کسی واقعہ یا منظر کا ذکر آجائے تو وہ بھی مرکزی نقطے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے، نہ کہ مرکزی نقطے سے پہلوتہی کرنے کے لئے برتا جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک بات کو بیان کرتے ہوئے اچانک بغیر کسی منطق کے غیر متعلقہ قصہ کہانی شروع کر دی جائے اور پورا کاغذ سیاہ کرنے کے بعد یہ لکھا جائے کہ ''یہ تو جملہ معترضہ تھا۔'' اسی روش نے موجودہ دور کے متعدد قلم کاروں کو غلط ڈگر پر ڈال رکھا ہے اور وہ انشائیہ کے مرکزی خیال سے منقطع ہو کر غیر متعلق باتیں کرنے لگتے ہیں یا لطائف کی آمیزش کے مرتکب ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مضحک صورت واقعہ کو نمایاں کرنے میں ہی انشائیہ کی کامیابی ہے۔ جبکہ انشائیہ کا بنیادی جوہر نکتہ آفرینی ہے۔ جب تک اس پہلو سے روگردانی کی جاتی رہے گی اس وقت تک انشائیہ لکھا نہیں جا سکے گا اور یہ ساری کارگزاری محض چیز، تجربہ یا خیال کی بالائی سطح تک کی

الٹ پلٹ یا موضوع کی ناہمواریوں پر استہزائی نظر ڈالنے اور پھر خندۂ دنداں نما کا مظاہر کرنے تک محدود رہے گی۔ سنگ تراش کی طرح انشائیہ نگار موضوع کے پتھر میں سے مخروطی صفات کو تراش خراش کر اجاگر کرتا ہے نہ کہ پتھر کی کھدری سل پر چاک سے الٹی سیدھی لکیریں کارٹون یا خاکہ نما چیزیں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جسے ملحوظ خاطر رکھ کر انشائیے اور طنزیہ، مزاحیہ مضامین کے فرق کو مزید سمجھا جا سکتا ہے۔ کچھ قلم کار کسی چیز، خیال یا تجربہ کے سطحی پہلو گنواتے چلے جانے کو بات میں سے بات نکالنے کے عمل کے مماثل جانتے ہیں مثلاً ''نمک'' کے موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے کچھ اس قسم کا طرز عمل اختیار کریں گے۔ ایک نمک حرام ہوتا ہے اور پھر نمک حراموں کے کرتوت بیان کر دیں گے، ایک نمک کی کان ہوتی ہے اور رعایت لفظی کا استعمال کر ڈالیں گے۔ پھر یوں رقمطراز ہوں گے ایک نمکدانی اور ایک نمک پارہ ہوتا ہے اور اس حوالے سے کوئی لطیفہ چٹکلا پیش کر دیں گے اور یوں لفظی بازیگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تحریر کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیں گے اور پھر کہیں گے کہ دیکھئے جناب ہم نے نمک کے حوالے سے کتنے نکات اور پرتیں آشکار کی ہیں۔ حالانکہ آشکار کچھ نہیں کیا محض چیزیں گنوائی ہیں اور وہ بھی نہایت سطحی طریقے سے۔ دوسری طرف اگر انشائیہ نگار نمک کو اپنا موضوع بنائے گا تو وہ انسان کی ذات میں مضمر نمکین پانی کے سمندر کا ذکر چھیڑے گا۔ نمک اور انسانی جسم کے ربط باہم پر ایک نظر ڈالے گا اور شاید نمکینی کو انسان کی فطرتِ ثانیہ قرار دینے کی بھی جسارت کرے گا۔ نمک سے انسان کے رشتے اور پل صراط کو ایسا نازک رشتہ قرار دے گا کہ ذرا سی کمی بیشی بھی اس کے توازن کو متزلزل کر سکتی ہے۔ اور شاید آخر میں وہ پانی اور نمک کے رشتے کو کسی صوفیانہ مسلک کی توضیح کے لئے بھی استعمال کر ڈالے۔ غرض یہ کہ انشائیہ نگار کے سامنے معانی کا ایک جہان ہوشربا ہے جو نمک کے موضوع کو محض ذرا سا چھو لینے پر متحرک ہو سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں کوئی کلیہ قاعدہ مرتب کر رہا ہوں کہ اتنے گرام شاعرانہ و متصوفانہ عناصر یا فلسفیانہ موشگافیاں یا معاشرتی و سیاسی اجزاء جب تک ایک دوسرے میں اچھی طرح حل نہ کیے جائیں انشائیہ کا محلول تیار نہیں ہو سکتا۔ دراصل یہ وہ تمام وسیلے ہیں جن کو بروئے کار لا کر انشائیہ نگار اپنے موضوع میں گہرائی اور وسعت پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے مگر ان تمام عوامل کا

غیر معتدل استعمال انشائیہ سے انشائیہ پن چھین لے گا اور اسے ایک جواب مضمون یا طنزیہ یا مزاحیہ میں مبدل کر دے گا۔ یہاں میں سعد اللہ کلیم صاحب کی اس بات کا ذکر ضرور کروں گا کہ ''خیال ایک پتنگ کی صورت کتنی ہی بلندیوں میں پرواز کرے مگر اس کی ڈور ہر حال میں انشائیہ نگار کے ہاتھ میں رہتی ہے۔'' (۳) ان کی اس بات میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب طنز نگار دوسروں کو پتنگ اڑاتے ہوئے دیکھتا ہے تو جملے کستا ہے اور طعن و تشنیع کا حربہ استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے برعکس انشائیہ نگار اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی ذات میں پنہاں ایک جہان معنی کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کی سعی کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ مجموعی خوبیوں اور خامیوں پر ہمدردانہ طریقے سے غور وخوض بھی کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ مجموعی خوبیوں اور خامیوں پر ہمدردانہ طریقے سے غور خوض بھی کرتا ہے۔ بقول مشتاق قمر صاحب ''انشائیہ کا ایک داخلی عنصری انشائیہ نگار کا وہ ہمدردانہ رویہ ہوتا ہے جو مثبت سوچ کا ثمر ہے۔'' (۴) میرے خیال میں صرف یہی نہیں بلکہ انشائیہ نگار زندگی کے منفی اور مثبت داخلی وخارجی پہلوؤں کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر انشائیہ بنے بنائے قاعدوں، اصولوں اور سانچوں کو جب توڑتا ہے تو پہلے داخلی طور پر تصادم Conflict سے دوچار ہوتا ہے جس سے منفی چیزیں مثبت اور مثبت چیزیں منفی دکھائی دینے لگتی ہیں اور یوں بقول ایک دانشور Chaos کی صورت نمایاں ہو جاتی ہے، مگر پھر انشائیہ نگار ایک تخلیقی جست بھرتا ہے اور یوں ''وژن میڈیم اور آہنگ کو بروئے کار لا کر بے ہیئتی کو ہیئت میں بدل دیتا ہے'' جس سے تحریر میں وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے۔ جمیل آذر صاحب نے اپنے مضمون ''ایک لطیف صنف نثر'' (۵) میں منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں جان کی یہ مثال دی ہے:

> ''خوش بختی ایک نٹ کھٹ دوشیزہ ہے، جس کے لئے کسی ایک جگہ رکنا ممکن ہی نہیں، وہ کرسی کی پشت پر سے تمہارے بالوں کو انگلیوں سے چھیڑتی تمہارے ہونٹوں پر ایک اڑتا ہوا بوسہ ثبت کرتی ہے اور پھر شرم محسوس کر کے کھلکھلاتی ہوئی بھاگ جاتی ہے لیکن بدبختی بڑے وقار

> کے ساتھ تمہاری جانب آتی ہے۔ تمہارے بستر پر اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے اور پھر اون کی سلائیوں سے تمہارے لئے ایک کبھی ختم نہ ہونے والا سویٹر بننے لگتی ہے۔''

اس مثال سے جمیل آذر صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ انشائیہ نگار کے لئے خوش بختی اور بدبختی یعنی مثبت اور منفی دونوں پہلو جاذب نظر ہیں اور وہ ان کو نئے زاوئے سے پرکھنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں یہاں اس بات کا اعادہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ انشائیہ نگار نہ تو اپنی انا EGO کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ پوری زندگی کو خود میں جذب کرے اور نہ ہی اپنی ذات کی اس حد تک نفی کرتا ہے کہ ہر شے اسے اپنے اندر مدغم کر لے بلکہ یہ دونوں صورتوں کو ملا جلا کر ایک امتزاجی صورت پیدا کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کے مقابلے میں مزاح نگار اپنی ذات کو ہدف بنا کر اس کا تمسخر اڑاتا ہے اور یوں دوسروں کے لئے سامان تفنن مہیا کرتا ہے ایسا کرنا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ یہ تو مزاح نگار کی تکنیک ہے۔ انشائیہ نگار کی حتی المقدور کوشش اس بات میں ہوتی ہے کہ جس چیز، خیال یا تجربے کو وہ بیان کر رہا ہو وہ خود بخود اپنی نقاب کشائی کرتا چلا جائے۔ اس سے قطع نظر ''انشائیہ غیر معمولی سنجیدگی'' کو صرف اس وقت ہی اپنے پیکر میں جگہ دے سکتا ہے جب یہ آشوب آگہی سے پیدا ہوئی ہو جس سے زیر لب تبسم وجود میں آجاتا ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ جب غیر معمولی سنجیدگی اپنی آخری رکاوٹ کو عبور کرتی ہے تو ایسی معنیٰ خیز غیر سنجیدگی وجود میں آتی ہے جس کا دوسرا نام خود شناسی ہے اور انشائیہ اسی کیفیت کو خود میں سمونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ ایک اچھے انشائیے کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سہ العبادی Three dimensional ہوتا ہے، یعنی وہ چیز، خیال اور تجربے کے مقررہ مفہوم میں مستور نئے معانی کو منکشف کرتا ہے جس سے وہ چیز، خیال اور تجربے کے مقررہ مفہوم کی دیوار پر فریم میں لگی تصویر کی محض ذوالعبادی نہیں رہتی بلکہ فاصلہ، گہرائی اور اونچ نیچ کا احساس اسے ایک سچ مچ کے منظر میں تبدیل کر دیتا ہے اور ناظر اس سارے منظر نامے میں چلتا پھرتا اور اس کی نزاکتوں اور لطافتوں سے براہ راست لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔ البتہ انشائیہ میں چوتھی Dimension پیدا کرنا سب سے مشکل کام

ہے اور جس تک فن کار اپنی چھٹی حس کی مدد ہی سے پہنچ سکتا ہے۔

کفایت لفظی انشائیہ کے اسلوب نگارش میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر اچھے انشائیے کا ایک لفظ چنیدہ ہونا چاہئے۔ اس کی عبارت میں مترادفات کا کم سے کم استعمال ہونا ضروری ہے تاکہ لفظوں کے ضیاع سے بچا جاسکے۔ انشائیہ کی انشاء کا ''خیال'' کی ندرت سے بھی بڑھ کر اہتمام کرنا پڑتا ہے کیونکہ خیال کی باریکیوں اور لطافتوں کو تخلیقی اور منجھی ہوئی انشاء ہی سنوار کر پیش کرسکتی ہے۔ چنانچہ ایک معیاری انشائیہ وہی شمار ہوگا جس میں اسلوب رواں دواں، مترنم اور کفایت لفظی کا حامل ہوگا۔ یہاں اس چیز کی صراحت بھی ضروری ہے کہ بعض قلم کار انشائیہ میں غیر معمولی سنجیدگی کو غلط طریقے سے در آنے کی اجازت دیتے ہیں اور اس پر مستزاد Instrumentalism کے انداز کو اختیار کرنے سے ان کی تحریروں میں تکرار بازی کے علاوہ خطیبانہ استدلالی انداز اور ناصحانہ انداز فکر کو دخل اندازی کی کھلی اجازت بھی مل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انشائیہ جیسی کومل صنف نثر اس قسم کی طرز نگارش کی قطعاً متحمل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اس نوع کا پیرایۂ اظہار اپنانے والوں کو انشائیہ نگار کہنا بہت مشکل ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ مضمون نگار یعنی ایسے ایسٹ Essayest ہی کہا جاسکتا ہے، چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ انشائیے کے Infra Structure میں انشاء اور اسلوب کو اساسی اہمیت حاصل ہے اور اس کے Super Structure میں احساس، مشاہدہ اور تجربہ کلیدی رول ادا کرتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انشائیہ میں تجربہ کی دونوں صورتوں کا امتزاج بھی مل جاتا ہے یعنی ایک وہ تجربہ جو اشیاء کے مشاہدے سے عبارت ہے اور دوسرا وہ تجربہ جو اشیاء کے مفہوم کو گرفت میں لیتا ہے۔ جہاں تک تشبیہاتی تلمیحاتی، استعاراتی اور تمثیلی انداز بیان کا تعلق ہے تو یہ چیز یقیناً زبان کی تر و تازگی اور نفاست میں گوناں گوں اضافہ کرتی ہے لیکن ان محاسن کا غیر معتدل استعمال خیال کی دھار کو کند کر کے اسلوب کی گل کاری اور مرصع سازی Euphistic Style کا موجب بن سکتا ہے اور قاری کا ذہن تشبیہ و استعارے کی ندرت اور طراوت کی داد دینے کی طرف زیادہ مائل ہوجاتا ہے۔ یہ چیز شاعری کا طرۂ امتیاز ہے مگر انشائیے کے سلسلے میں یہ محض اضافی خصوصیت ہے، جس کا بر

محل استعمال ہونا چاہئے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان انشائیہ نگاروں میں یہ پہلو نسبتاً نمایاں ہے، وجہ یہ کہ نوجوانوں کے ہاں جذباتیت کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے، چنانچہ وہ نت نئی تشبیہات کے ذریعے اپنی بات کو نئی نویلی شکلیں دیتے ہیں، جس سے شاعرانہ عناصر اور اضافتوں کا استعمال ان کی تحریروں میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہوجاتا ہے مگر درحقیقت یہ عمر کی مجبوری ہے۔ جیسے جیسے ان کی عمر علم اور تجربے کا دائرہ وسیع ہوگا یہ اجزا بھی بتدریج مدھم پڑنے لگیں گے تا آنکہ تحریر کی وہ صورت ابھر آئے گی جو ہر لحاظ سے پختہ اسلوب نگارش کا نمونہ ہوتی ہے۔ انشائیے کے اسلوب کے ضمن میں رشید امجد صاحب کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ:

> ''انشائیہ میں اسلوب کی دو باتیں خصوصی ہیں۔ اول یہ کہ اشیاء کو لفظوں اور لفظوں کو اشکال میں ڈھالنے کی وہ قدرت جس سے ان کی داخلی اور خارجی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ دوسرے وہ اعلیٰ درجہ کی روانی جو سلاست و بلاغت کے ساتھ ایک ادبی معراج اور حسن بھی رکھتی ہے۔''(۶)

اسی طرح اپنے مضمون "On some technical elements of style" میں رابرٹ لوئس سٹیونس ایک اچھے سٹائل کے بارے میں لکھتا ہے:۔

> "First that the phrases should be rythmical and pleasing to the ear, Secondly, that the phrases should be musical in the mouth, thirdly, that the writer should weave the argument into a paern,both beautiful and logical and lastly that he should master the art of choosing apt, explicit, and communicative words."

مزاحیہ طرز اظہار کا استعمال انشائیے میں ایک بڑی حد تک انشائیہ نگار کے خاص موڈ پر مبنی ہوتا ہے بلکہ انشائیہ نگار تو ناہمواریوں کے باطن میں کارفرما ابدی سچائیوں کو بیان کرتا ہے۔ یہاں ''مزاحیہ لب و لہجے'' اور ''مزاح نگاری'' کے مابین فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس نوع کے انشائیے جن میں مزاحیہ لب و لہجہ اختیار کیا جاتا ہے بعض دفعہ ایک عام قاری کو مزاحیہ تحریریں نظر آتے ہیں لیکن اگر وہ ان کا بغور مطالعہ کرے تو وہ دیکھے گا

کہ مزاحیہ لب و لہجے کے حامل جملوں میں کوئی دوسری نسبتاً گہری بات بیان کی گئی ہے، ایک نیا انکشاف ہوا ہے، یہی وہ نقطہ تقاطع Nodal point ہے جہاں سے طنزیہ مزاحیہ مضمون اور مزاحیہ لب ولہجہ رکھنے والے انشائیے کی حدود اور سمتیں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہو جاتی ہیں، مگر اس مقام پر اکثر قارئین ان کے باہمی فراق کو آپس میں غلط ملط کر دیتے ہیں اور یوں بات الجھ کر رہ جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید صاحب:

''انشائیے کی بحث میں عموماً شگفتگی کو طنز و مزاح کا مترادف تصور کر لیا جاتا ہے اور اس طرح انشائیہ اور ظرافت کی حدود کو آپس میں گڈ مڈ ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔'' (۷)

اس فرق کے ادراک کے لئے یہ چند مثالیں دیکھئے:

مزاحیہ انداز کی مثال:

''صاحب سائیکل کیا ہے یہ تو چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس پر بیٹھتے ہی انسان سرکس کا کوئی مسخرہ نظر آنے لگتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ عامل پر معمول سوار ہو کر جا رہا ہے۔''

طنزیہ انداز کی مثال:

''معاشی نظام کے سائیکل کی گدی بیٹھ گئی ہے اور اخلاقی روایات کا ایکسل ٹوٹ چکا ہے جبکہ باقی ماندہ روایات مڈگارڈوں کی طرح کھڑ کھڑ کر رہی ہیں اور معاشرے کے بریک کبھی کے فیل ہو چکے ہیں۔''

انشائیہ کا انداز:

''زندگی بھی ایک سال خوردہ سائیکل ہے، جس پر سوار ہو کر میں راستے کے نشیب فراز اور راہ میں آنے والے ہر گڑھے کو بصورت ایک حادثہ اپنے جسم و جاں پر براہ راست محسوس کرتا ہوں اور یوں گویا زندگی کے مختلف دھچکوں سے مسلسل روشناس ہوتا چلا جاتا ہوں۔''

انشائیہ میں ''انکشاف ذات'' کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں اس چیز، خیال یا تجربے کی

مکمل اکائی بھی شامل ہے جس پر وہ طبع آزمائی کرتا ہے اور یوں ان تمام صورتوں کو ان کے مقررہ اور مخصوص معانی سے الگ کر کے ان میں نئی معنویت اور نئے امکانات کو ذاتی وابستگی کے حوالے سے اجاگر کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے وہ صورت سامنے آتی ہے جسے ہم شخصی حوالہ Personal Touch کا نام دیتے ہیں، مگر یہ شخصی حوالہ کوئی ذاتی ڈائری نہیں جس میں انشائیہ نگار کی ذاتی دلچسپی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے مثلاً آئس کریم کھانا، اخبار پڑھنا، بچہ پالنا یا حقہ پینا وغیرہ یہ تمام موضوعات بالواسطہ انشائیہ نگار کی وابستگی کو نمایاں کرتے ہیں اور قاری کو ان کا مطالعہ کرنے کی تحریک دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اچھا انشائیہ فرد کی وجدانی ضرورتوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بھی بن سکتا ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ ''انشائیہ تو Meditation سے جنم لیتا ہے۔'' (۸) یعنی یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ جہاں انشائیے کا رخ بصارت سے بصیرت کی طرف ہے وہاں بصیرت سے بصارت کی طرف بھی ہے۔ گویا انشائیہ نگار Double Vision کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ نگار کسی ایکسپریشنٹ Expressionist کی طرح نہ تو دن میں خواب دیکھتا ہے اور نہ ہی علامت پسندوں کی طرح خارج کو فقط Inner Absolute کا عکس سمجھنے لگتا ہے بلکہ وہ تو جوہر اور وجود کو بیک وقت اہمیت دیتا ہے اور انہیں ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھتا ہے، چنانچہ انشائیہ نگار کے نزدیک خیال Idea اور ہیئت Form ایک نامیاتی وحدت رکھتے ہیں اور یوں خارج و باطن کا سنگم انشائیہ میں موضوعی اور معروضی انداز فکر کو بیک وقت شامل کر دیتا ہے جس سے اس کی زود اثری میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ موضوع سے انشائیہ نگار کی ذاتی وابستگی کے بغیر ممکن نہیں۔

بقول ڈاکٹر آدم شیخ:

''انشائیہ نگار فرد کو جماعت یا جزو کو کل پر ترجیح دیتا ہے۔'' (۹)

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ نگار کسی Ivory Tower کا باسی ہے اور اُردگرد کی زندگی اور اس کی اجتماعیت سے اسے کوئی علاقہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ فرد کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا شخصی پہلو اور دوسرا اجتماعی پہلو۔ اجتماعی پہلو اس کی ذات میں مضمر ہوتا ہے۔ چنانچہ انشائیہ نگار جب فرد کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کے اجتماعی پہلو کے حوالے سے زندگی

اور معاشرے کے کل کو بھی پیش کر دیتا ہے مگر لطف یہ ہے کہ وہ محض زمانہ حال کے معاشرے سے کہیں زیادہ اس معاشرے کو درخور اعتنا سمجھتا ہے جو اس کی ذات میں مستور ہوتا ہے اور اس معاشرے کو بھی اہمیت دیتا ہے جو اس کے خوابوں کی آماج گاہ ہے اور جس کے مستقبل میں طلوع ہونے کے واضح امکانات موجود ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ کسی محدود متصدیت کا نہیں بلکہ ایک وسیع تر انکشافی اور عرفانی رویے کا علمبردار ہوتا ہے ۔ اس سلسلے میں رشید نثار صاحب لکھتے ہیں:

''اسے (یعنی انشائیہ نگار کو) اصلاحی لگن کا بھی دکھ نہیں ہوتا اور یہ غم بھی نہیں ستاتا کہ اس کے فن پارے سے کسی سماجی پرتو کی بھی روشنی آ رہی ہے یا نہیں۔'' (۱۰)

حقیقت یہ ہے کہ سماجی پرتو تو اس میں موجود ہوتا ہے مگر وہ اس کی پبلسٹی نہیں کرتا۔ پھر یہ کہ کل سے مربوط ہونے کا زاویہ انشائیہ کی ہیئت میں بھی موجود دکھائی دیتا ہے، چنانچہ ہر اچھے انشائیے کی یہ خوبی ہے کہ اس کا آخری فقرہ یا پیراگراف موضوع کے سارے بکھرے ہوئے دھاگوں کو جوڑ کر ایک ایسی مکمل صورت تشکیل کر ڈالتا ہے جس کو دیکھتے ہوئے Loose sally of the mind والی بات محض انشائیہ کا ایک پہلو ہی دکھائی دیتی ہے۔ گویا فنی تکمیل انشائیہ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بصورت دیگر انشائیہ Thoughts Stray کی سطح سے اوپر ہی نہ اٹھ سکے۔ اس سلسلے میں چند انشائیوں کے اختتامی فقرے ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان کی مدد سے انشائیہ نگار نے کس طرح انشائیہ کی فنی تکمیل کی ہے:

مثال نمبر ۱:

''ویسے احباب و اقربا کی سہولت کے لئے بھی قبر پر نیم پلیٹ کا ہونا ضروری ہے، لیکن نیم پلیٹ وہی ہوگی جو مجھے پسند ہے۔ مجھے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ مرنے کے بعد عزیز و اقارب اپنی پسند کی نیم پلیٹ میری قبر پر لگائیں۔'' (''نیم پلیٹ'' از جمیل آذر)

مثال نمبر ۲:

''فنا و بقا کا سارا رنگ انگنی پر سکھا رکھئے کہ انگنی ہماری تہذیب کی علامت ہے جس کا ایک سرا ازل اور دوسرا سرا ابد سے بندھا ہے۔'' (''انگنی'' از کامل القادری)

مثال نمبر ۳:

''دور اندیشی دراصل ہوا سے لڑنے کا نام ہے۔ اس ہوا سے جس کا رخ ابھی متعین نہیں ہوا۔'' (''دور اندیشی'' از اکبر حمیدی)

مثال نمبر ۴:

''انسان ہونے کے ناتے میری خواہش بھی یہی ہے کہ فائل سے میری محبت کا رشتہ کبھی نہ ٹوٹے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی بیوی سے الجھنے اور کبھی کبھی اسے جھڑکنے کی جرأت تو کر لیتا ہوں لیکن فائل کو ناراض کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتا۔'' (''ذکر اس پری وش کا'' انور سدید)

مثال نمبر ۵:

''جب میرا مکان بالکل تیار ہو جائے گا تو میں اس کے سائے میں بیٹھ کر اپنے رشتہ ازدواج پر غور کروں گا اور سوچوں گا کہ کیا دھرتی یعنی مکان سے وابستہ رہنا بہتر ہے یا مکان کی ''مکانیت'' سے نکل کر غیر محدود فضا میں چہل قدمی کرنا؟'' (''مکان بنانا'' از غلام جیلانی اصغر)

مثال نمبر ۶:

''لیکن اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ شخصیت کی تکمیل آندھی کے بے رحم تھپیڑوں ہی کی رہین منت ہے اور جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی، اس کی حالت قابل رحم اور اس کی ذہنی پختگی محل نظر ہے۔'' (انشائیہ ''آندھی'' از وزیر آغا)

مشکور حسین یاد نے انشائیہ کو ''ام الاصناف'' کہا ہے۔ اس سے اگر ان کی یہ مراد ہے

کہ اصناف ادب میں سب سے پہلے انشائیہ نے جنم لیا تھا تو یہ بات قرین قیاس نہیں ہے۔ ان معنوں میں صرف شاعری ہی کو ام الاصناف کہنا واجب ہے۔ البتہ انشائیہ کو ایک حد تک امتزاجی صنف کہہ لیجئے کہ اس میں افسانہ کی عالمی گہرائی، ڈراما کا تحریک، ناول کی ہمہ گیری، فلسفہ کی زیرکی اور مشاہدہ پسندی، شاعری کی معنی آفرینی اور جدت خیالی اور نفسیات کی دروں بینی۔ یہ سب لکھنے والے کے ذاتی تجربہ اور شعور کا حصہ بن کر ایک نئے افق کو سامنے لانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ انشائیہ نگار کے اسی دائرہ کار کے ضمن میں آرتھر کرسٹوفر بنسن (The art of the essayist مرتبہ:۔ سی۔ ایچ۔ لاکٹ) رقمطراز ہے:

"He does not see life as the historian or as the philosopher or as the poet or as the novelist , and yet he has a touch of all these"

یوں بھی انشائیہ نگار اس سارے جہان کا ادراک The World as my idea کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس لئے یہ تمام گوشے بصورت واردات اس میں از خود شامل ہو جاتے ہیں اور اسے حسی ادراک سے آگے کی چیز بنا دیتے ہیں۔ آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ حضرات جو صنف انشائیہ کی مقبولیت اور اثر پذیری کو انشائیہ پڑھنے اور لکھنے والوں کے گراف کی کمی بیشی سے جانچنے کی سعی فرماتے ہیں، میرے خیال میں درست نہیں کرتے کیونکہ انشائیہ جس قسم کا مزاج رکھتا ہے اس کو سمجھنے اور اس سے لطف کشید کرنے کے لئے ذاتی تربیت اور ریاضت کی اشد ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ باطنی دنیا سے نشر ہونے والے پیغامات کو حاصل کرنے کے لئے انشائیہ لکھنے اور پڑھنے والے کے ذہنی چینل کا ذکی الحس ہونا بھی ضروری ہے۔ تبھی وہ ایک اچھا ریسونگ سیٹ (Receving set) بن سکتا ہے۔ لہٰذا گنتی کر کے کہنا کہ چونکہ انشائیہ نگاروں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے اس لئے یہ ہر دلعزیز صنف نثر کا درجہ نہیں رکھتی۔ فی الحقیقت زود اندیشی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ اُردو ادب میں انفرادی سوچ جس خون کی کمی کا شکار تھی انشائیے نے اس کو حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور میں اسے انشائیے کی ایک اہم دین متصور کرتا ہوں۔ باقی رہا انشائیے کی ترویج کا معاملہ تو اس ضمن میں انشائیہ کی خود کار نمو پذیری نے اس کے خدوخال کو واضح

کیا ہے اور اسے برتر مقام کی طرف دمادم لے جا رہی ہے۔ میں رشید امجد صاحب کے ان کلمات کے ساتھ ہی اس مضمون کا اختتام کرنا چاہتا ہے ہوں کہ:

''جدید انسان کبھی اپنے حوالے سے کائنات کو اور کبھی کائنات کے حوالہ سے اپنے آپ کو سمجھنے کی جستجو کر رہا ہے، یہ دوہرا سفر پیچیدہ بھی ہے اور قدم قدم پر نئے انکشافات اور اسرار سے بھی بھرا ہے۔ اس پیچیدگی، کشف اور اسرار کا بہترین اظہار انشائیہ ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس لئے میرے خیال میں انشائیہ ہی مستقبل کا سب سے اہم پیرایۂ اظہار ہو سکتا ہے۔ انشائیہ اب ایک رجحان نہیں، تحریک بن چکا ہے، ایک ایسی تحریک جو بتدریج مستقبل کے اظہار کا ذریعہ بنتی چلی جا رہی ہے۔''(۱۱)

۱ حرف اول۔ ''سرگوشیاں''

۲۔ ''فنون'' لاہور، جولائی۔ اگست 1982ء

۳۔ ''انشائیہ مقبولیت کی راہ پر''، ''اوراق'' ''افسانہ انشائیہ نمبر'' 1972ء

۴۔ ''انشائیہ نگاری''، ''اوراق'' سالنامہ 1975ء

۵۔ جمیل آذر بحوالہ ''ایک لطیف صنف نثر''، ''اوراق'' 1966ء

۶۔ ''اردو زبان''، ''انشائیہ نمبر'' 1983ء

۷۔ ''انشائیوں کی ایک نئی کتاب''

۸۔ ''انشائیہ کی کونپل''، ''اوراق'' 1978ء، انشائیہ جنوری فروری

۹۔ ڈاکٹر آدم شیخ ''انشائیہ''

۱۰۔ ''افسانہ انشائیہ نمبر''، اوراق'' 1972ء ''انشائیہ ایک بحث''

۱۱۔ ''انشائیوں کی نئی کتاب''، ''انشائیہ نمبر'' 1983ء ''اُردو زبان''

□□□

مشتاق قمر

انشائیہ نگاری

اُردو ادب میں انشا پردازی اور انشائیہ نگاری دو مختلف اصطلاحیں ہیں لیکن ان دونوں کو ایک دوسرے میں خلط ملط کر دینے کا عام رجحان پایا جاتا ہے جس کے باعث اس نئی صنف (انشائیہ) کے بارے میں بہت سے شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔

انشا پردازی ایک لسانی اور وسیع تر اصطلاح ہے جس کا اطلاق تقریباً ہر نثری تحریر پر کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی طور پر انشا پردازی ادب کی کوئی علاحدہ صنف نہیں بلکہ اس کا تعلق ایک خاص نوع کے نثری اسلوب سے ہے۔ جبکہ انشائیہ مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے ایک مکمل صنف ادب ہے اور اعلےٰ پائے کی انشا پردازی اس کا ایک اساسی اور لازمی عنصر ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے داستان گو سے لے کر مزاح نگار تک بھی اپنی اپنی طرز کی انشا پردازی سے کام لیتے ہیں مثلاً داستان گو شاعری منظر کشی اور قصے کی ضرورتیں تمثیلی اور مسجع مقفیٰ زبان سے پوری کرتا ہے۔ ڈرامہ نویس یا ناول نگار کی لسانیات کرداروں اور ماحول کی پابند ہے۔ طنز نگار غلو کی زبان استعمال کرتا ہے اور مزاح نگار لفظوں کے کھیل سے خیال کی شعبدہ بازی کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ جبکہ انشائیہ نگار شعور اور تحت الشعور کی ایک ایسی سرحدی تہذیب و ثقافت کی زبان استعمال کرتا ہے جو تمام بنی نوع انسان کا مشترکہ ورثہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے لفظِ انشاء کی یوں توضیح کی ہے۔ ''انشا کا لفظ ابتدا میں ایک دفتری اصطلاح تھا۔ اس کا اطلاق سرکاری فرامین اور مکتوبات کے رف ڈرافٹ پر ہوتا تھا اور صاف شدہ مسودے کو ''تحریر'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ جس محکمے کے سپرد ''مسودہ'' تیار کرنے کا کام ہوتا تھا اس نے ''دیوان الانشا'' کا نام پایا۔ رفتہ رفتہ مضامین اور مکتوبات کی تحریر و ترتیب کے لئے انشا کا لفظ مستعمل ہو گیا۔ در باروداری کے زیر اثر فارسی نثر میں نثر سادہ کے پہلو بہ پہلو نثر مصنوع (نثر رنگین)

سامانی دور ہی سے رائج ہو چکی تھی۔ یہی نثر احکام و فرامین و مکتوبات کی زبان قرار پائی۔ اس نثر میں خطابت کا عنصر جزوِ اعظم تھا۔ اس سے انشاء پردازی کی وہ خاص نہج وجود میں آ گئی جس کو ہم انشائیہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس سے ایک بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ لفظ ''انشا'' ابتدا میں ہر قسم کی نثری تحریر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ انشا انگریزی کے to Write اور انشاء پرداز انگریزی کے لفظ Writer کے ہم پلہ لسانی اصطلاحیں ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ لفظ سادہ نثر اور نثر رنگین یا مسجع و مقفیٰ نثر میں بٹ گیا اور مسجع۔ مقفیٰ اور رنگین نثر لکھنے والے انشا پرداز Writers کہلانے لگے۔ چنانچہ انشا پردازی (Prose Writing) ادب کی ایک ایسی لسانی اصطلاح ہے جس کا تعلق ایک خاص نوع کے نثری اسلوب سے ہے نہ کہ کسی صنف ادب سے۔ ادب کی یہ صنف مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے ایک مکمل اور دیگر اصناف سے علاحدہ اپنی ایک اکائی بنائی اور پہچان رکھتی ہے جب کہ انشا پردازی (Writing) کا مظاہرہ داستان، افسانے، ڈرامے، طنزیہ، مزاحیہ نگارشات، انشائیے اور ہر قسم کے ادبی اور تنقیدی مضامین میں کیا جاسکتا ہے۔ انشا پردازی (ہر اچھی نثری تحریر کی طرح) انشائیہ کا ایک بنیادی وصف ضرور ہے لیکن کسی ایک وصف کو ساری صفت سمجھ لینا درست نہیں اور نہ ہی ادبی دنیا میں کسی ایک صفت کی ایک یا ایک سے زیادہ خوبیوں کا کسی دوسری صفت میں پایا جانا کوئی نئی اور انوکھی بات ہے۔ مثال کے طور پر مکالمہ ڈرامے کا ایک بہت بڑا اساسی عنصر ہے لیکن افسانے، نظم، ناول اور دیگر سنجیدہ اور مزاحیہ اصناف میں اس کا استعمال نہ تو ممنوع ہے اور نہ ہی اس کی موجودگی کسی ادب پارے کو ڈرامے کا درجہ عطا کر سکتی ہے۔ ہر صنف کی خارجی پہچان کے علاوہ ایک داخلی پہچان بھی ہوتی ہے۔ لیکن کسی ادب پارہ میں ان دونوں پہلوؤں کی موجودگی بھی فی نفسہٖ کسی خاص صنف کی ضمانت نہیں۔ مثال کے طور پر ہر شعر اپنی تمام تر فنی خوبیوں کی تکمیل کے باوجود ''شعر'' نہیں ہوتا بقول کولرج کوئی نظم ساری کی ساری شاعری نہیں ہوتی بلکہ اس کے کچھ حصے ہی شاعری کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں اس سے ہرگز یہ مراد بھی نہیں کہ یہ سقم ہر شعری تخلیق میں پایا جانا لازمی امر ہے۔ عرض کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ داخلی اور خارجی ضرورتوں کے علاوہ ہر صنف سے مخصوص ایک خاص تخلیقی رویہ بھی ہوتا ہے جس کی موجودگی از حد ضروری ہے اور جہاں کہیں اور

جس سطح پر یہ تخلیقی رویہ مجروح ہوگا اس سے وابستہ صنف بھی مجروح ہو جائے گی۔ انگریزی کا مشہور شاعر پوپ جس کی شاعری کو فنی اعتبار سے مکمل ترین سمجھا جاتا ہے بنیادی طور پر شاعر ہی نہیں۔ پوپ کے بارے میں یہ محض نقادوں کی رائے نہیں بلکہ خود اسے بھی اس امر کا احساس تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بعض نظموں کو Essay کا عنوان ہی دیا۔ پوپ اپنے ہم عمر طنز نگار سوفٹ Swift سے صرف اتنا ہی مختلف تھا کہ اس نے نثر کی بجائے نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ جہاں تک انشا پردازی کا تعلق ہے اسے انشائیہ یا کسی دوسری صنف کا نام دینا اس لئے بھی درست نہیں کہ داخلی اوصاف اور تخلیقی رویہ کے علاوہ اس کی خارجی ہیئت کی یہاں بھی کوئی علیٰحدہ اور مکمل اکائی نہیں بنتی انشائیہ اور انشا پردازی کا رشتہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ دونوں کا مخزن ایک ہی لفظ "انشا" ہے اور عام طور پر انشائیہ نگار ایک ایسی نثر میں اظہار خیال کرتا ہے جس پر انشا پردازی کی اصطلاح کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ورنہ کیٹس کے تقریباً سبھی Odes اپنے رویے کے سبب بہترین شاعری ہونے کے باوجود انشائیے کہلا سکتے ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد اس صدی کے بہترین انشا پرداز تو ہیں لیکن ان کی نگارشات کو انشائیہ نگاری کا نام دینا درست نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انشائیہ ایک انتہائی دلچسپ اور دلکش صنف ادب ہے اور اس نے جتنے قلیل عرصے میں پڑھنے اور لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اس کی مثال ادب کی تاریخ میں ملنا ممکن نہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ بھی نہیں کہ انشائیہ کے علاوہ دیگر تمام اصناف ادب کو ذریعہ اظہار بنانے والے کسی قسم کی کوتاہی کے مرتکب ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ یوں مغرب میں علمی ادبی اور فنی تکمیل اور پختگی کے بعد تقریباً ہر اچھے لکھنے والے نے اپنی ذات کے گوشوں کو انشائی رویہ کے ساتھ ضرور کھنگالا ہے اس جملہ معترضہ کی ضرورت محض اس تنقیدی رویے کے باعث پیش آرہی ہے جس کے تحت بعض ناقدین ہر نئے، پرانے انشا پرداز کو انشائیہ نگار ثابت کرنے کے لئے تاریخ ادب کے حقائق مسخ کرنے کی کوشش میں ہیں۔ سرسید، حالی اور آزاد اپنے دور کی ضرورتوں کی پیداوار تھے اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور میں اپنے ہونے کا حق بڑے احسن طریقے سے ادا کر دیا۔ ان اکابرین کے ناموں کے ساتھ انشائیہ نگار کا لقب چسپاں کرنے سے نہ تو ان کی لازوال عظمت میں کوئی اضافہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ان کے دائم و قائم ادبی کارناموں میں انشائیہ نگاری کی عدم موجودگی کسی نوع کے

تخلیقی سقم کی طرف اشارہ ہی کرتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیوں کے پہلے مجموعے "خیال پارے" کے دیباچے میں غیر رسمی طریق کار نے عدم تکمیل، اختصار، شگفتگی، اسلوب اور انکشاف ذات کو انشائیے کے خارجی اور ہیئتی عوامل قرار دیا ہے۔ اس سے قبل اُردو ادب میں انشائیے کی کوئی تعریف نہیں کی گئی تھی اور نہ ادب کی کسی دوسری صنف کے لئے ان صفات کا جزوی یا کلی طور پر حامل ہونا ضروری ہی سمجھا جاتا تھا۔ ڈرامے میں اسلوب کی شگفتگی تو برقرار رکھی جاسکتی ہے لیکن ڈرامے کے لئے شگفتگی کا عنصر لازمی نہیں بلکہ ارسطو تو المیہ کے مقابلے میں طربیہ کو کوئی اہمیت ہی دینے کو تیار نہیں۔ عدم تکمیل اور اختصار "مضمون" کی اصل روح کے منافی اوصاف ہیں۔ ناول میں شگفتگی اسلوب اور انکشاف ذات کا مظاہرہ تو کیا جاسکتا ہے لیکن ناول نہ تو انشائیے کے دیگر اوصاف (غیر رسمی طریق کار، عدم تکمیل اور اختصار) کا متحمل ہوسکتا ہے اور نہ ہی ان اوصاف کی عدم موجودگی کی تخلیق کو ناول کے درجے سے گرانے کا موجب ثابت ہوسکتی ہے اختصار، شگفتگی اسلوب اور انکشافِ ذات افسانے میں جگہ تو پاسکتے ہیں لیکن یہ افسانے کے لازمی عناصر نہیں۔ اسی طرح افسانے میں انشائیے کے دیگر اوصاف کی عدم موجودگی کسی نوع کا فنی یا تخلیقی سقم نہیں۔ طنزیہ، مزاحیہ نگارشات اور انشائیے کے مابین بہت کم فرق روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن غالباً یہی وہ اوصاف ہیں جو انشائیے سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد بھی ہیں حتیٰ کہ انشائیے اور طنزیہ مزاحیہ نگارشات میں اسلوب کی شگفتگی مشترک عنصر ہونے کے باوجود معنوی لحاظ سے بالکل متضاد احساس کو جنم دیتی ہے۔ طنز نگار اور مزاح لکھنے والے کے مقاصد بالعموم ایک سے ہوتے ہیں دونوں زخموں کو کریدنے اور قہقہہ لگانے میں لطف محسوس کرتے ہیں جبکہ انشائیہ نگار کی مسکراہٹ عمل معکوس کا درجہ رکھتی ہے وہ زخموں پر پھاہا رکھتا اور زخمی ہونٹوں پر سکون و طمانیت کے مشاہدہ سے مسکراتا ہے۔ انشائیہ نگار کا سارا عمل ایک ایسی قوس کے مماثل ہے جو خود انشائیہ نگار کی ذات سے طلوع ہو کر اس کی ذات میں غروب ہو جاتی ہے۔ اس کی ذات سے باہر ہر چیز اور قدر "لا" کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ پہلے سے قائم کردہ کسی اور مفہوم کو تسلیم نہیں کرتا۔ اور اپنی ذات سے باہر ساری چیزوں کو "لا" تصور کرتے ہوئے نئے سرے سے ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے انشائیہ

نگار کا رویہ ایک صوفی کی بجائے انقلابی کے رویے سے زیادہ مشابہ ہے کہ صوفی نئی دنیا کی
تشکیل کے لئے پرانی دنیا کی تخریب تمام کے عمل سے تو گزرتا ہے لیکن نئی دنیا کی عمارت کو
پرانے مفاہیم سے کچھ زیادہ دور نہیں لے جاتا۔ وہ نئی دنیا کو پرانے افقوں سے نجات
دلانے کی بجائے ان کی گرفت کچھ اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے جبکہ انقلابی نئی دنیا کی اساس نہ
صرف نئے مفاہیم پر رکھتا ہے بلکہ پرانے ''آفاق'' سے سنگاری دلانے کے بعد نظر و فکر کو
وسیع تر جولان گاہوں سے آشنا کرتا ہے اور یہی وہ انتہائی رویہ ہے جس کی عدم موجودگی
انشائیہ کے خارجی عوامل کے یکجا ہونے کے باوجود اسے انشائیہ کے بلند درجہ سے گرا سکتی ہے
کیٹس اپنے ایک Ode میں موسم خزاں کے بارے میں صدیوں سے تسلیم شدہ رویوں اور
مفاہیم سے روگردانی کرتے ہوئے اسے جو نئی معانی پہناتا اور اس کے حسن لازوال کی
انوکھی جھلکیاں دکھاتا ہے اس سے انشائی رویے کا ہی اظہار ہوتا ہے۔ انگریزی ادب کی
صنف (Ode) میں انشائیہ کے بعض خارجی عوامل بھی پائے جاتے ہیں لیکن ورڈزورتھ اور
شیلے وغیرہ کے ہاں (Odes) انشائیہ نہیں بن پاتے۔ چنانچہ کسی ادب پارے پر محض انشاپر
دازی کی بنیاد پر (جو لازماً ایک نثری اسلوب ہے) انشائیہ کا لیبل چسپاں کرنا سعی لاحاصل
کے سوا کچھ نہیں داخلی عناصر کے ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے ایک مضمون ''انشائیہ کی
پہچان'' میں بڑی دلچسپ مثال دی ہے۔ وہ اپنے مجموعے ''نئے مقالات'' کے صفحہ 226 پر
یوں قمطراز ہیں۔

''۔۔۔ لیکن ان کے علاوہ بھی ایک وصف ایسا ہے جو انشائیہ
کو دوسری اصناف سے جدا کرتا ہے۔ اور یہ ''وصف'' سمجھانے کی
نہیں پہچاننے کی شے ہے تاہم میں اس سلسلے میں ایک مثال سے اپنا
مدعا بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔

فرض کیجئے کہ آپ سے کبوتر بازی کے موضوع پر کوئی مضمون لکھنے
کی فرمائش کی گئی ہے۔ یا اگر آپ ادب برائے ادب کے قائل ہیں تو
فرض کیجئے کہ آپ کو اپنے اندر سے اس موضوع پر لکھنے کی تحریک ہوتی
ہے۔ اب یہ آپ کی مخصوص داخلی جہت پر منحصر ہے کہ آپ کس قسم کا

مضمون لکھیں گے اگر آپ محقق ہیں یا اس خاص لمحے میں آپ پر تحقیق کا
جذبہ غالب ہے تو آپ کبوتر بازی کی ساری تاریخ کا جائزہ لیں گے اور
بتائیں گے کہ کبوتر بازی کن سیاسی، سماجی یا معاشی تحریکات کے تحت پر
وان چڑھی۔ کس کس زمانے میں اس نے کیا کیا رنگ اختیار کئے۔ کون
کون سے مشہور کبوتر باز گزرے ہیں اور کس طرح کبوتر بازی کا یہ
رجحان آج کے زمانے تک بڑھا چلا آیا ہے۔ ایسی صورت میں آپ کا
یہ مضمون کبوتر بازی پر ایک تحقیقی مقالہ قرار پائے گا۔ لیکن اگر آپ
مضمون لکھنے سے پہلے تحقیق کے موڈ میں نہیں ہیں۔ بلکہ کبوتر بازی کے
رجحان کو قومی وقار کے منافی سمجھنے پر مائل ہیں تو آپ ایسا مضمون لکھیں
گے جن میں کبوتر بازی کے رجحان کو خندہ استہزا میں اڑانے کی کوشش
ہوگی، آپ گویا ایک بلند ٹیلے پر کھڑے ہو کر تمام کبوتر بازوں کو طنز کے
تیروں سے چھلنی کرتے جائیں گے۔ ایسی صورت میں آپ کا یہ مضمون
طنزیہ قرار پائے گا۔ اب فرض کیجئے کہ مضمون لکھنے سے پہلے آپ کے
اعصاب میں تشنج کی کوئی کیفیت موجود نہیں ہے اور آپ ہر معاملے میں
اغماض و درگزر سے کام لینے کے موڈ میں ہیں۔ تو آپ کبوتر بازی کے
موضوع کو یوں پیش کریں گے کہ کبوتر باز کی ہر حرکت آپ کے تفننِ طبع
کے لئے مہمیز کا کام دے گی۔ کبوتر باز کی طرف آپ کے ردِ عمل
میں درشتی یا حقارت نہیں ہوگی۔ بلکہ ایک نیم تبسم اندازِ نظر ہوگا جس کے
تحت آپ کبوتر باز کے غیر ضروری ''انہماک'' سے لطف اندوز ہوں گے
ایسی صورت میں آپ کی یہ تحریر ایک مزاحیہ مضمون متصور ہوگی۔ اب
فرض کیجئے کہ آپ اپنے مکان کی چھت پر سے ہمسائے کی کبوتر بازی کا
نظارہ تو کرتے رہے ہیں لیکن ایک صبح آپ یکایک محسوس کرتے ہیں
کہ کبوتر بازی کے تجربے سے گزرے بغیر آپ کا زندہ رہنا محال ہے
چنانچہ آپ کسی نہ کسی طرح ہمسائے کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ آپ کو

اپنے مکان کی چھت پر آنے اور کبوتر اڑانے کی دعوت دے۔ اس کے بعد آپ ایک چھتری کی مدد سے کبوتر کو ہوا میں اڑاتے ہیں اور وہ آن واحد میں ایک سفید سا نقطہ بن کر آسمان کی پنہائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی آپ محسوس کرتے ہیں جیسے آپ اپنی ذات کی سلاخوں کو توڑ کر ایک بے کراں نیلاہٹ میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ خود فراموشی کے چند لمحات گزرتے ہیں جن میں زمان و مکان کی جملہ حدیں معدوم ہو جاتی ہیں اور تب نیلاہٹ کے ناموجد سے وہی سفید نقطہ اس طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے کوئی خیال یا تشبیہ یا شبنم کا ایک لرزتا ہو اسفید براق قطرہ جو آپ کی بھیگی ہوئی پلکوں پر اُتر آتا ہے اور پھر ساری آنکھ میں پھیل جاتا ہے۔ تب ایک ہلکی سی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ وہی سفید کبوتر آپ کی چھتری پر آن بیٹھتا ہے اور آپ دوبارہ آسمان سے زمین پر آجاتے ہیں۔ اب اگر آپ اس تجربے اور تجربے سے پھوٹنے والے انکشافات کو مضمون میں سموئیں اور کبوتر اڑانے کے عمل سے آپ نے جو حظ کشید کیا تھا اسے قاری تک پہنچانے کا اہتمام کریں تو آپ کا یہ مضمون انشائیہ کے تحت شمار ہوگا بشرطیکہ آپ انشائیہ کے باقی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر ایسا کریں''۔

انشائیہ کا ایک اور داخلی عنصر انشائیہ نگار کا وہ ہمدردانہ رویہ ہوتا ہے جو مثبت سوچ کا ثمر ہے۔ انشائیہ نگار کی سب سے بڑی داخلی پہچان گہری مثبت سوچ کے ساتھ ''لمحہ'' کے الاؤ سے خط کشید کرنا اور زندگی کی جلی ہوئی راکھ سے سکون و طمانیت کے چند اجلے پھول ڈھونڈ نکالنا ہے۔ انشائیہ نگار ہمیشہ (اپنے انقلابی رویے کی بدولت) زندگی کے لئے نئے پہلو سامنے لاتا ہے۔ وہ صرف ایک ہی رویہ اختیار کرتا ہے اور اس ایک پہلو کے آئینے میں زمانے کی بیشتر قبائیں الٹ دیتا ہے۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے کہا ہے یہ بات سمجھنے کی ہے سمجھانے کی نہیں۔

انشائیے کے خارجی اور معروض اجزائے ترکیبی کی اصل روح تک نارسائی کی بدولت

بھی تنقیدی سطح پر انشائیہ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں۔ اسلوب کی شگفتگی انشائیے کا ایک لازمی جزو ہے لیکن شگفتگی اسلوب کو ''چہل''، ''ٹھٹھہ'' یا ''مزاح'' کے ہم پلہ گردانا درست نہیں کیونکہ یہ اصطلاحیں مزاح مقصود بالذات کے زمرے میں آتی ہیں جب کہ انشائیہ نگار کا مقصد مزاح پیدا کرنے کی جبری یا شعوری کوشش ہر گز نہیں ہوتا۔ مزاح نگار گرد و پیش میں پھیلی ہوئی گھٹن کو چند عارضی قہقہوں کا مقروض بنانے سے زیادہ کچھ نہیں کرتا اس کا سارا عمل عارضی اور لمحاتی ہوتا ہے۔ جبکہ انشائیہ نگار مستقل بنیادوں پر کام کرتا ہے۔ انشائی اسلوب میں شگفتگی کا سبب وہ نیاز اور نگاہ بھی ہے جس سے انشائیہ نگار اشیا کو دیکھنے کا عادی ہے وہ اشیا کو نئے زاویے سے دیکھتا ہے اور اس لئے قدرتی طور پر ان کا مشاہدہ نئے انکشافات و حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ انسان فطرتاً متجسس ہے اسے سدا نئے علوم اور انوکھے تجربات کی کھوج رہتی ہے۔ انشائیہ نگار قاری کی اس حس کی تشفی کرتے ہوئے اسے اچنبھے میں ڈالتا ہے اور نئے حقائق کی دریافت پر جنم لینے والی طمانیت اور مسرت سے روشناس کراتا ہے لیکن مزاح نگاری کی طرح یہ محض لفظوں کی بازی گری نہیں۔ بلکہ ایک طرح سے انسان کی مخفی تمناؤں کی دریافت ہے یہ تمنائیں وہ ہیں جن پر وقت کی گرد جمی رہتی ہے لیکن جوں ہی کوئی ہاتھ اس گرد کو صاف کرتے ہوئے ان کے اصل چہرے کو سامنے لاتا ہے تو چہروں پر نکھار آجاتا ہے۔ پھر یہ کوئی دور کی کوڑی لانے والی بات بھی نہیں۔ صرف اس نئی سمت کی جانب توجہ مبذول کراتا ہے۔ شگفتگی اسلوب کی بہترین مثال روس کے آنجہانی وزیر اعظم مسٹر خروشیف کا وہ بیان ہے جو انہوں نے پہلے امریکی راکٹ کے چاند پر اترنے کے بارے میں دیا تھا غالباً اس راکٹ کا وزن اسّی پونڈ تھا۔ اس کامیابی پر مختلف زعمانے اپنے اپنے اندازِ فکر کے مطابق اپنی آراء کا اظہار کیا تھا۔ کسی نے اسے انسان کی بہت بڑی فتح قرار دیا۔ کسی کے نزدیک یہ ایک تاریخ ساز واقعہ ٹھہرا اور بعض نے اس پر مداخلت فی الدین کا الزام بھی لگایا لیکن آنجہانی خروشیف نے محض اتنا کہا'' پہلی بار زمین کا وزن اسی پونڈ کم ہوا ہے'' یہ بات بہت سے فکری، نظریاتی، مشاہداتی، سائنسی اور فلسفیانہ حقائق کی طرف اشارہ کرتی اور ہمارے حسی ادراک میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ جس کا ردعمل مسرت اور طمانیت کی ایک انمٹ رو کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن اسلوب کی یہ شگفتگی انشائیے کے اس وصف کی مرہون منت ہے جسے اصطلاح میں انکشاف ذات کا نام دیا گیا ہے۔ انکشاف ذات کو غلطی سے موضوع کے بارے میں انشائیہ نگار کے ذاتی تاثرات سمجھ لیا گیا ہے جبکہ حقیقت میں انکشاف ذات خاص نوع کے تخلیقی احساس کا نام ہے۔ تخلیقی عمل (Creative Activity) کے دوران میں انشائیہ نگار داخل کی ایک ایسی گہرائی سے گزرتا ہے جہاں وہ خارجی اور زبردستی طاری کیے ہوئے نظر یات کی دستبرد سے مکمل طور پر محفوظ و مامون رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک اور مضمون میں باطن کی اس گہرائی کو خون کی جھیل (Pool of Blood) کا نام دیا ہے۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں سے انسانی محسوسات، جذبات اور افکار کی اجتماعی رو بلا لحاظ رنگ و مذہب، ایک سے رویے زاویے اور شدت کے ساتھ گزرتی ہے۔ جہاں ہمیر شولڈ اور لومبا رزار اور لینن۔ یعقوب گودمان اور کرنل اُجو کو۔ سب ایک سے ہی ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں تو ہر فنکار کسی نہ کسی سطح پر انکشاف ذات سے ہی تعلق رکھتا ہے کہ غیر ذاتی ہونا صرف کیمرے کی آنکھ کا خاصا ہے لیکن انشائیہ نگار انکشاف ذات کے دوران میں جب ''خون کی جھیل'' پر کھڑے ہو کر بات کرتا ہے تو وہ از خود اجتماعی تجربے میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ اشیا کے بارے میں ایک نیا اور انوکھا زاویہ نگاہ رکھنے کے باوجود قاری کے ساتھ انشائیہ نگار کا رابطہ اور رشتہ پوری شدت کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ گویا انشائیہ نگار کی حد تک ''ذاتی'' ہونا ''اجتماعیت'' اور ''اجتماعی تجربے'' کے حصول کا قابل اعتماد ذریعہ ہے اس ضمن میں جدید نظم اور افسانے کی مثال دی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں اصناف اپنی دروں بینی کے باوصف اس اصول کے تابع دکھائی دیتی ہیں لیکن اپنی مخصوص تکنیکی اور فنی ضرورتوں کے باعث نظم اور افسانے کی دروں بینی کو خارجی اور داخلی عوامل اور دباؤ کے دیگر عناصر سے کلی طور پر آزاد رکھنا بڑی فنی مہارت کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں الجھاؤ اور ابہام کی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس انشائیہ نگار کے ہاں انکشاف ذات اور داخلی، خارجی ہر قسم کے غیر تخلیقی اور غیر شخصی دباؤ سے آزاد رہتا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ ترسیل کی تکمیل ہو جاتی ہے بلکہ احساس کا اجتماعی رنگ بھی ابھر آتا ہے۔ اصل بات موضوع کی ظاہری شکل وصورت نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اسے کس گہرائی پر محسوس کیا گیا ہے۔ غالباً یہی باعث ہے کہ مضمون نگار

کے برعکس انشائیہ نگار کے ہاں موضوع یا عنوان محض خیالات وافکار کی کھونٹی کا درجہ رکھتا ہے۔

کفایت یا اختصار انشائیے کا ایک لازمی وصف ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ دریا میں کوزے کو بند کرنے کی سعی تو مزاح کہلائے گی جبکہ کوزے میں دریا بند کرنا خالص انشائی عمل ہے۔ اس لحاظ سے انشائیے کا مقصد اعلیٰ محدود تر کینوس میں زیادہ افکار کی ترویج و اشاعت ہے۔ یہی باعث ہے کہ اسے مرکز گریز (Centrifugural) ہونے کا اجازت نامہ حاصل ہے۔ اس کے ذہن میں ایک مرکزی نقطہ تو ہوتا ہے مگر اس مرکزی نقطے کے ارد گرد گھومتے ہوئے وہ ''دنیا جہان کی باتیں کہہ جاتا ہے۔'' وہ عنوان کی کھونٹی پر قسم قسم کے اُجلے، دھلے، دھلائے کپڑے لٹکاتا جاتا ہے۔ انشائیہ ایک مہذب، شائستہ اور علمی صنف ادب ہے اور انشائیہ نگار اور قاری دونوں سے تہذیب شائستگی اور علم دوستی کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سے ہرگز یہ مراد بھی نہیں کہ انشائیہ نگار محض کفایت کے حصول کی خاطر قاری کے ذہن کو اپنی علمیت کے کسی قدر فاضل بوجھ کا زیر بار کر دیتا ہے اور اس طرح ایک نوع کا ابہام پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔ انشائیہ نگار کے پیش نظر کفایت تو ہوتی ہے مگر اسے ابہام کی قیمت پر حاصل نہیں کیا جاتا۔ پھر یہ کفایت الفاظ اور ڈکشن کی کفایت ہوتی ہے، نہ کہ خیالات اور افکار کی۔

اس طرح غیر رسمی طریق کار واعظ، مقرر اور شیخ جی کے انداز گفتگو سے الگ تھلگ اپنی پہچان رکھتا ہے۔ انشائیہ نگار غیر رسمیت کے باوجود ادبی اصولوں اور اقدار سے انحراف نہیں کرتا وہ افسانہ، کہانی لکھنے والے کی طرح نہ تو فرضی قصوں کا جال بنتا ہے اور نہ طنز اور مزاح نگاروں کا رویہ اختیار کرتے ہوئے بالائی یا نچلی سطح سے بات کرتا ہے۔ انشائیہ نگار کی زبان اور قاری کی نگاہ ایک ہی خط مستقیم پر واقع ہیں۔ وہ قاری کی آنکھوں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بظاہر ایک تفریحی سفر پر روانہ ہوتا ہے لیکن اس سفر کا راستہ معانی وافکار کی وسیع وبسیط مرغزاروں کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ وہ ہر قدم پر نہ صرف قاری کو اپنے تجربے میں شریک کرتا جاتا ہے بلکہ خود بھی قاری کے تجربے میں پورے طور پر شریک رہتا ہے۔

انشائی رویے اور انشائیے کی اصل روح کے بارے میں چند آراء درج ہیں:۔

''انشائیہ کو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو

پڑھنے والوں کے ذہن پر استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب مفکرنہ انداز بیان کے ذریعے اپناتا۔ اثر قائم کرے"۔ (سید احتشام حسین)

"انشائیے میں طنز اور فلسفیانہ مباحث خام صورت میں ہو سکتے ہیں بلکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی ادب پارے کی اوپر کی سطح پر تختی اور منطق کی سنجیدگی ہو لیکن نیچے کی سطح میں انشائیہ کی "آزادہ روی" کار فرما ہو۔ اوپر کی سطح پر طنز کی تلخی اور نیچے کی سطح پر ایک غیر سنجیدگی اور بے فکری قائم رہے"۔ (ڈاکٹر وحید قریشی)

"ادب کی اس صنف کی تخلیق و تحسین ۔۔۔۔۔ دونوں کے لئے شگفتگی طبع کی شدید ضرورت ہے۔" (نظیر صدیقی)

"اگر سارا انشائیہ آپ کی گرفت میں آجائے تو یہ اس کی ناکامی کی دلیل ہے۔ انشائیہ میں گریز کی کیفیت ہوتی ہے۔ آپ جب ایک سرے سے اسے پکڑنا چاہتے ہیں تو دوسرا سرا آپ کی انگلیوں سے پھسل جاتا ہے۔۔۔۔ انشائیہ ایک ایسی نثری تحریر ہے جو اتنی ہی بے ربط ہوتی ہے جتنی کہ زندگی خود۔ اور جس طرح زندگی کے آخر میں حیاتیاتی وحدت وجود میں آجاتی ہے اسی طرح انشائیے کے منتشر اجزا میں دیکھتے ہی دیکھتے ایک وحدت تاثر پیدا ہو جاتی ہے، زندگی، خود کئی اجزا سے عبارت ہے۔ انشائیہ کی بھی یہی خوبی یا خصوصیت ہے۔ یہ اجزا فکری بھی ہوتے ہیں اور جذباتی بھی۔ یعنی انشائیہ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے اور محسوسات کے وسیع تر امکانات بھی چھوڑ جاتا ہے۔ آپ جب انشائیہ ختم کر لیتے ہیں تو آپ کی سوچ کو ایک نیا اور غیر رسمی ساز اویہ مل جاتا ہے۔" (غلام جیلانی اصغر)

"۔۔۔ انشائیہ نگار اس انبوہ میں شریک ہے جو پگڈنڈی پر چلتے چلتے کیچڑ میں لتھڑ گیا ہے۔ لیکن زہر خند یا ہنسی کو جنم دینے کی بجائے انشائیہ نگار اس کیچڑ سے اکتساب سرور کر رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو ایسی شگفتہ باتیں بتا رہا ہے جو اسے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سونگھنے، زمین کے لمس سے آشنا ہونے اور کیچڑ کا ذائقہ چکھنے سے پہلے معلوم نہیں تھیں۔" (انور سدید)

"انشائیہ کے لئے نہ مزاح ضروری ہے اور نہ سنجیدگی، انشائیہ نگار اپنے قاری کو خوش بھی کر سکتا ہے اور اداس بھی۔ البتہ جو چیز لازمی ہے وہ جذبہ اور فکر کا اچھوتا پن ہے۔ اگر کسی لکھنے والے کے پاس اپنے تجربے اور احساس وخیال کی ندرت موجود نہیں ہے تو وہ کبھی ایک کامیاب انشائیہ نہیں لکھ سکتا۔" (مشکور حسین یاد)

"(انشائیہ میں) اصل چیز شخصیت کا حسن ہے، مصنف کے تاثرات ذاتی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں مگر وہ ہونے چاہیں اس کے اپنے ذہن کی تخلیق۔ انشائیہ کے حسن کا انحصار تو ان تاثرات اور خیالات کے حسن اظہار پر ہے۔" (سلیم اختر)

"انشائیہ نگار 'لمحاتی سلسلے' پر وقت صَرف نہیں کرتا بلکہ واقعات کے تاثر اور تجربے کے انوکھے پن کو وہ افادیت قرار دیتا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی اور وقت کو کسی خاص Pattern کے وسیلے دیکھتا ہے۔ مثلاً وہ یہ نہیں سوچتا کہ سماج میں کیا تبدیلی واقع ہوگی یا اس کی افادیت کیا ہوگی۔ یہ سب باتیں اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی اسے کسی 'اصلاح' کلّن کا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ اور یہ غم بھی نہیں ستاتا کہ اس کے

فن پارے سے کسی سماجی پرتو کی بھی روشنی آرہی ہے یا نہیں، بلکہ وہ تو سماجی واقعات وعوامل سے بے نیاز یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ زندگی کو جیتا جاگتا رکھنے میں کامیاب ہوا ہوں کہ نہیں۔ کیا میں نے خوشگواریت میں اضافہ کیا ہے کہ نہیں۔ بظاہر یہ تخلیقی عمل یا فنکاری بے نیازانہ ہوتی ہے۔ لیکن انشائیے میں اتنی وسعت ضرور ہوتی ہے کہ وہ طنز اور مزاح کے بین بین رہ کر اپنے موضوع کو پھیلا سکے۔ کسی مسئلے کو جذب کر کے سمیٹ سکے اور ایک نئے نکھار کے ساتھ اسے دنیا کے سامنے لا سکے"۔ (رشید نثار)

"انشائیے کے مطالعے کے دوران مجھے اس برقی رو کا احساس ہوتا ہے جو ایک لحظہ اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے اور دوسرے لحظہ عدم میں چھپ جاتی ہے اور پھر عدم وجود کا چکر چل نکلتا ہے یا یوں کہا جائے کہ آنکھ مچولی کا کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ انشائیہ نگار اپنے موضوع کو جہاں بار بار چھوتا ہے وہاں اتنی ہی بار اس سے دور بھی ہو جاتا ہے۔ مرکز سے ہٹ کر جب دوبارہ اس سے ملتا ہے تو مجھے وہ بچہ نظر آتا ہے جو لپک کر ماں کی گود میں پہنچ کر پھر بھی بے قرار ہے کہ اس حصار سے الگ ہو، ماں کے بازوؤں میں لپک کر بار بار جھولنا اور بار بار الگ ہونا انشائیہ کی تکنیک ہے۔" (سجاد نقوی)

انشائیے کے معروضی اور موضوعی عوامل اور انشائی رویے کی مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدیم اُردو ادب میں انشا پردازی کے ذخیرے تو موجود ہیں لیکن ایسی نگارشات کا مکمل فقدان پایا جاتا ہے جن میں انشائیے کے تمام خارجی اور داخلی عوامل اس صنف کے مخصوص رویے کے ساتھ یکجا ہو گئے ہوں۔ پھر انشا پردازی کے یہ نمونے مختلف اصناف ادب، داستان، ناول، ڈرامے، افسانے، طنز و مزاح وغیرہ۔۔۔ کے

آئینے میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ نہ کہ ایک علٰیحدہ صنف ادب کے روپ میں!۔ میر امن دہلوی، للولال جی، کاظم علی جوان، حیدر بخش حیدری، خلیل خان اشک، نہال چند لاہوری۔ حتی کہ رجب علی بیگ سرور تک انشا پردازی ابھی انشائیے کے خارجی عناصر سے بھی روشناس نہیں ہوئی تھی۔ مجموعی اعتبار سے نثر کا فریم اور رویہ داستان کا تھا۔ اس دور کے نثر نگار اپنی اپنی طرز کے عمدہ انشا پرداز تھے۔ ان کی بعض نگارشات میں انشائی اسلوب کے بھی اکا دکا چھینٹے نظر آ جاتے ہیں لیکن انشائیے کے دیگر داخلی، خارجی محاسن اور انشائی رویہ کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

البتہ رجب علی بیگ سرور سے اُردو نثر نے داستان کی افسانوی فضا سے کسی قدر ہٹ کر مضمون نگاری کی جانب واضح طور پر پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ حتی کہ طلسم ہوشربا میں بھی جا بجا مضمون نگاری جیسی تفصیلات کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اُردو ادب میں صحیح مضمون نگاری کا آغاز سر سید احمد خان سے ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ جن انشا پردازوں نے مضمون نگاری کی طرف توجہ دی ان میں مولوی ذکاء اللہ دہلوی، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی نذیر احمد دہلوی، خواجہ الطاف حسین حالی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سید احمد دہلوی، باقر علی داستان گو، علامہ شبلی نعمانی، نواب سلطان جہاں بیگم، احسن لکھنوی، عبدالحلیم شرر، مولوی عزیز مرزا، ناصر نذیر فراق، وحید الدین سلیم، راشد الخیری، سر عبدالقادر، آغا شاعر قزلباش دہلوی، عبدالرشید چشتی، منشی پریم چند، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، میاں بشیر احمد اختر جونا گڑھی اور کوثر چاند پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے اپنی تالیف "اُردو ایسز" میں مقالہ نگاری کا آغاز 1845ء کے لگ بھگ بتایا ہے لیکن انہوں نے نمونے کے جو چند عنوانات رقم کئے ہیں وہ مقالہ نگاری کی بجائے "جواب مضمون" کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس وقت تک اُردو انشا پرداز مضمون نگاری کی طرف پوری طرح متوجہ تو ہو چکے تھے مگر ابھی تک مضمون (ایسے) کی مختلف صورتوں کو علٰیحدہ علٰیحدہ نام نہیں دیئے گئے تھے۔ البتہ انیسویں صدی کے نصفِ اوّل کے آخری برسوں سے تذکرہ، جواب مضمون، مقالہ، مضمون کی دیگر اقسام اور انشائیے لطیف۔۔۔ سبھی کچھ لکھا جانے لگا۔ اور مضمون نگاری

مختلف صورتوں میں ظاہر ہونے لگی۔ بعض انشاپردازوں کے ہاں مقالے اور مضمون کی سنگلاخ صورتیں مجرد احساس میں بھی ڈھلتی دکھائی دیتی ہیں جو انہیں انشایئے کے قریب لے آتا ہے۔ تجربہ انشایئے کا ایک بہت بڑا داخلی وصف ہے لیکن جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں محض ایک آدھ وصف پوری صنف کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ پھر اس دور کی نثر میں موضوع کی گمبھیرتا پوری شدت کے ساتھ موجود ہے جو انشائی رویے کے سراسر منافی ہے۔ انشائیہ نگار موضوع کا پابند نہیں ہوتا ہے۔ اس کے ہاں موضوع تو محض شوکیس کا کام دیتا ہے۔ درحقیقت یہ سارا دور انشایئے کے لئے سازگار تھا ہی نہیں۔ انشائیہ ایک خاص نوع کے قومی مزاج اور ترقی یافتہ زبان میں ہی پنپ سکتا ہے۔ اس دور میں زبان ابھی تجرباتی مراحل سے گزر رہی تھی۔ زبان سادہ، سلیس اور حقیقت پسندانہ تو ہوگئی تھی مگر ابھی اس میں داستان گوئی کی مقفٰی، مسجع اور مصنوعی پن کی تلچھٹ باقی تھی۔ سرسید احمد خان کی قومی تحریک اور برصغیر کی آزادی کے لئے دیگر سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکوں کی بدولت ابھی تک وہ ڈھیلا ڈھالا (Relaxed) مزاج تخلیق نہیں ہوا تھا جو انشایئے کی پیدائش کے لئے سازگار ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات سرسید احمد خان کے بارے میں حالی سے منسوب ہے کہ اگر کسی کے گھر کو آگ لگ جائے تو وہ مدد کے لئے سُر میں پکارا نہیں کرتا۔ کچھ یہی صورت حال انشایئے کی پیدائش میں بھی مانع رہی ورنہ انشایئے کی پیدائش کے سارے عناصر معرضِ وجود میں آچکے تھے۔ صرف انہیں یکجا کرنے کے لئے مناسب ماحول اور وقت کے کٹیلک ایجنٹ (Catalyc agent) کی ضرورت تھی۔ خصوصاً غالب اپنے خطوط میں ایک مکمل انشائیہ نگار کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ ادب میں غالب کا سارا رویہ اپنی آزاد ذہنی ترنگ کے باعث بنیادی طور پر انشائیہ نگار کا ہی بنتا ہے۔ کچھ یہی صورت حال سرسید احمد خاں کے ہاں نظر آتی ہے۔ اگر ان کے کندھوں پر قومی فرائض واحساسات کا بوجھ نہ ہوتا تو یقیناً وہ اردو ادب میں کامیاب انشائیہ نگاری کا آغاز کر سکتے تھے۔ بالخصوص ان کی ہمہ گیر شخصیت اور نئی اور آزاد سوچ انشائیہ نگاری کے لئے انتہائی موزوں ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن میں مرزا غالب اور سرسید احمد خان پر انشائیہ نگار کا لیبل چسپاں کر کے نادان دوست کا کردار ادا کرنا نہیں چاہتا۔ اردو ادب میں وہ اپنی اپنی نوع کی مسلمہ حیثیتوں کے مالک ہیں۔ انہیں کسی دوسری حیثیت سے دیکھنا ان کے ساتھ

سراسر ناانصافی ہوگی۔ سرسید احمد خان کے حوالے سے شاید یہ بات ذہن میں آجائے کہ انشائیہ کوئی غیر افادی یا محض وقت گزاری کی صنف ہے یہ خیال درست نہیں۔ دیگر اصناف کی طرح انشائیہ بھی اپنے لکھنے والے کے رویے کا مرہون منت ہے، انشایئے میں ہر قسم کے مضامین اور موضوعات کا اظہار کیا جا سکتا ہے بلکہ آزاد ذہنی ترنگ کے باعث انشائیہ نگار کے پاس، اپنے مختصر کینوس میں، دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ ہی کہنے کی گنجائش ہوتی ہے لیکن اس نوع کے انشائی رویے کے لئے جس خاص قومی مزاج اور ترقی یافتہ زبان کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے سرسید احمد خان اور ان کی تحریک کے زیر اثر پروان چڑھنے والا دور قطعاً سازگار نہیں تھا۔ اس دور کی بیشتر نگارشات میں خطیبانہ اور ناصحانہ انداز کی جھلک پائی جاتی ہے، جو وقت کا اہم تقاضا تھا۔ تاہم سرسید احمد خان، مولوی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، نواب سلطان جہاں بیگم، وحید الدین سلیم، ناصر نذیر فراق، سر عبدالقادر، منشی پریم چند، احسن لکھنوی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور پروفیسر محمد مجیب کے ہاں مجرد سوچ کی گہری چھاپ موجود ہے۔ ان کی نگارشات میں نہ تو مقالے کی روایتی علمیت ہے اور نہ ہی جواز مضمون کے ٹھوس حقائق کی بھرمار، ان کے ہاں موضوع کو آزاد، مجرد سوچ کے آئینے میں دیکھنے کا رجحان غالب پایا جاتا ہے لیکن یہ مجرد سوچ ایک انشائیہ نگار کی بجائے ایک عالم کی سوچ میں ڈھل گئی ہے۔ انشائیہ نگار اور عالم کی سوچ میں بڑا لطیف سا فرق ہوتا ہے۔ وہی بات جسے ایک عالم اپنی دستار کی فضیلت کے حوالے سے بیان کرتا ہے۔ انشائیہ نگار اسے ننگے سر اور گردن تک بڑھتے ہوئے بالوں کی اوٹ میں کہہ جاتا ہے۔ اس دور کے بعض لکھنے والوں (مثلاً عبدالحلیم شرر، آغا شاعر قزلباش دہلوی، عبدالرشید چشتی، مولوی عزیز مرزا، کوثر چاندپوری، باقر علی داستان گو، نیاز فتح پوری، میاں بشیر احمد، افضل علی، اختر جوناگڑھی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، منشی سجاد حسین اور میر ناصر علی) کی تحریروں میں ہلکے سے ناصحانہ انداز تخاطب کے ساتھ ساتھ فطرت پرستی اور آزاد سوچ کا رجحان عام ہے۔ اب تک انگریزی تعلیم اور ادب برصغیر میں کافی اندر تک در آیا تھا اور ان کے اثرات کو بخوشی قبول کیا جا رہا تھا۔ لیکن دوسری اصناف کی طرح انگریزی ایسے کو بھی خالصاً اس زمانے کے ہندوستانی مزاج

کے ساتھ خوش آمدید کہا گیا۔

یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ آزادی کی جنگ زور وشور سے جاری تھی اردو لکھنے والوں کو عوامی ذہن کی بعض بے اعتدالیوں کا شدت کے ساتھ احساس تھا چنانچہ مضمون نگاری نے انشائیہ کی طرف پیش قدمی کرنے کی بجائے طنز ومزاح کی جانب موڑ کاٹا، منشی جوالا پرشاد، سید سجاد حیدر یلدرم، خلیق دہلوی، میاں عبدالعزیز، فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، سلطان حیدر جوش، عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی، پطرس، راجہ مہدی علی خان، کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، سید امجد حسین، نذیر احمد شیخ، سید ضمیر جعفری، عزیز ملک، ابراہیم جلیس، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خان، انتظار حسین، نظیر صدیقی، احمد جمال پاشا، مسعود مفتی، سید باقر علیم، رضیہ فصیح احمد، منور قیصر، غلامی کے آخری دور اور آزادی کی پہلی دہائی میں جنم لینے والی نئی فکر کی پیداوار ہیں۔ آزادی کے بعد ماقبل آزادی مشاہدہ میں آنے والی بے اعتدالیوں کا احساس اور زیادہ شدت کے ساتھ ہونے لگتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ آزادی کی پہلی دہائی میں تقریباً تمام اصناف ادب پر طنز کی گرفت مضبوط ہوگئی اور راجہ مہدی علی خان سے نظیر صدیقی تک بہت سے ادبا اپنے آپ کو طنز کے گرداب سے بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے لیکن آزادی (وسیع تر مفاہیم میں) اپنے ساتھ وسعت کشادگی، وسیع النظری اور متحمل مزاجی بھی لاتی ہے۔ آزادی کے بعد آزادی سے قبل والے تناؤ، انتشار اور تصادم کی گرد چھٹ کر ''بات'' دھیمے انداز میں کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ انشائیہ تاریک گھٹن زدہ فضا میں پنپ نہیں سکتا ہے۔ آزادی کی پہلی دہائی کے اختتام پر ہی پاکستان میں انشائیے کا آغاز اور مقبولیت پاکستانی قوم کی روشن خیالی، وسیع القلبی اور آزاد سوچ کی غماز ہے اور یہ بات یہاں کے لئے از حد فخر کا باعث ہے خصوصاً جبکہ برصغیر کے دیگر ممالک میں اُردو کے علاوہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی موجودگی کے باوجود انشائیہ معرض وجود میں نہ آسکا یا کم از کم اسے ابتک وہ مقام نہیں مل سکا جو اسے پاکستان میں حاصل ہے۔ قدیم اردو ادب میں انشائیہ کی تلاش میں سرگرداں حضرات قومی اور قومی ادب کی سطح پر آزاد پاکستانی ذہن اور فکر کی نفی کرنے کی سعی نامشکور کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ میرا انشائیے کو قومی مسئلہ بنا کر پیش کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، لیکن تاریخی حقائق سے نگاہیں چرانا

بھی انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ قدیم ادب میں انشائیے کے مماثل (بطور ایک مکمل صنف کے) ڈھونڈ نکالنے کی ساری کوششیں رائگاں ثابت ہوئی ہیں۔ اُردو کے بعض محققین کی طرح گریٹ ایسز آف آل نیشنز (Great Essays of All Nations) مرتب الیف۔ ایچ۔ پریچرڈ (F. H.Prechard) نے دور کی کوڑی لانے کے مترادف تمام زبانوں کی قدیم نگارشات میں ایسے (Essay) کے منتشر اوصاف کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے پریچرڈ اس بہت بڑی ادبی حقیقت کو نظر انداز کر گیا کہ ادب کی کوئی صنف بھی مکمل طور پر ماضی سے غیر منسلک نہیں رہ سکتی۔ پہیلی غالباً ادبی ذہن کی پہلی تخلیق تھا۔ پہیلی سے دیومالا اور داستان کے شگوفے پھوٹے۔ دیومالا قدیم اعتقادات کے قفس میں مقید ہو کر رہ گئی۔ داستان سناتے سناتے انسان کی نوک زبان تھک گئی تو اس نے جسم کے دیگر اعضا سے زبان کا کام لینے کی ٹھانی، اور اس طرح رقص اور ڈرامہ معرض وجود میں آئے۔ پھر ڈرامے میں ''واقعہ'' (Situation) کے شوق نے ناول کے پٹ وا کئے اور انسانی ذہن کی امتزاجی (Synthetic) حس نے مختصر کہانی کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ شعری اصناف بھی انہی خطوط پر سفر کرتے ہوئے مثنوی سے نظم، غزل اور نظم کی دیگر اصناف میں ڈھلتی چلی گئیں۔ نثر میں انشائیہ اور نظم میں غزل (یا معنوی لحاظ سے اس سے مشابہہ اصناف مثلاً (Odes) اور سانٹ وغیرہ) ایک سے ادبی ذہن کے ارتقا کا پتہ دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے نثری اصناف میں انشائیہ ایک ایسی صنف کا درجہ اختیار کر جاتا ہے جو نہ صرف دوسری اصناف کی قدرتی اور ارتقائی پیداوار ہے بلکہ اس میں تمام دیگر اصناف کے ارتقائی مراحل بھی مجتمع ہو جاتے ہیں! ایسی صورت میں کوئی محقق انشائیے (یا بجہ کسی دوسری صنف) کے بعض اوصاف کو قدیم ادب میں ڈھونڈ نکالتا ہے تو وہ عمل معکوس کے ذریعے تخلیقی ذہن کی ارتقائی کڑیوں کی نشاندہی کرنے سے زیادہ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیتا۔

خود یورپ میں اگرچہ انشائیے کا آغاز مونٹین کے ہاتھوں فرانس میں ہوا لیکن اپنے مزاج اور اسلوب کے اعتبار سے یہ خالصتاً انگریزی ادب کی ہی ایک صنف ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ''ایسے'' کے ضمن میں یوں اظہار خیال کیا گیا ہے:۔

"The essay as a literary form is usually spoken of as

a particularly english thing; and as one of the glories of english literature".

لیکن میرے خیال میں انسائیکلو پیڈیا کے مرتبین کی یہ رائے درست نہیں۔ انشائیہ انگریزی ادب کی صرف ایک سطوت کی نشاندہی نہیں کرتا بلکہ ان کے پورے ادب کی واحد پہچان ہے۔ انگریزوں نے صرف ایک ڈرامہ نگار اور چند شاعر ہی پیدا کیے ہیں ناول اور مختصر کہانی میں وہ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہر قابل ذکر انگریز ادیب ایک اعلیٰ اور سلجھا ہوا انشائیہ نگار ہے۔ برصغیر میں قیام پاکستان سے قبل انشائیہ کے لئے معرض وجود میں آنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں برصغیر میں بسنے والی مختلف تہذیبی اور ثقافتی یونٹوں کے مزاجوں کے تجزیہ میں الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن گزشتہ بحث کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ انشائیے کا مزاج صرف اس ثقافتی یونٹ سے لگا کھاتا ہے جسے ''پاکستان'' کا نام ملا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل برصغیر ایک عجیب قسم کے ثقافتی انتشار میں مبتلا تھا اس انتشار اور افتراک نے کھچاؤ، تناؤ اور تصادم کی صورت حال پیدا کر رکھی تھی اور ایسی صورتِ حال انشائی مزاج کی تشکیل کے لئے قطعاً ناسازگار ہوتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک مکمل ثقافتی یونٹ کے علیٰحدہ ہو جانے کے باعث تہذیبی اور معاشرتی سطح پر تناؤ اور تصادم کی صورت حال ختم ہوگئی۔ پھر یہ نیا ثقافتی یونٹ مزاجاً وسعت، کشادگی اور زندگی کے بارے میں پیدا ہونے والے سوالوں کو آفاقی حوالوں سے دیکھنے کا دلدادہ تھا۔ انشائیہ نگار کی نگاہ ہمیشہ افق کے پار دیکھتی ہے۔ وہ بصری اور فکری افق کی قید قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور انشائیے کے لئے ضروری تمام عوامل و عناصر اس نئی ثقافتی یونٹ میں بدرجۂ اتم موجود تھے۔ چنانچہ آزادی کی پہلی دہائی میں ہی تخلیقی سطح پر ان عوامل و عناصر کا اظہار انشائیے کی صورت میں ہوگیا! اور اس طرح سیاسی عمل کے ذریعے ثقافتی یونٹ کو علیٰحدہ کرنے کے صحیح فیصلے کی تصدیق تخلیقی سطح پر بھی ہوگئی۔ □□□

عطیہ رئیس

انشائیہ نگاری

انشائیہ اردو ادب میں ایک نئی اور غیر افسانوی صنف نثر ہے۔ انیسویں صدی نصف بعد میں نثر کو تصنع سے آزاد کرانے کی کوشش کی گئی۔ جس سے نثر کی ایک خاص صورت ابھر کر سامنے آئی۔ نثر کی اس خاص صورت کو سرسید احمد خاں، حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد، شرر، وغیرہ نے فروغ دیا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی چار پانچ دہوں میں اس قسم کی نثر کی توسیع ہوئی جیسے ناصر علی، آغا شاعر، سجاد انصاری، مہدی افادی، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے پروان چڑھایا۔ یہی نثر بعد میں انشائیہ کے نام سے موسوم ہوگئی۔ دیگر اصناف نثر کی طرح انشائیہ نگاری بھی انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں شامل ہوئی۔ وہاں (Personal Essay اور Light Essay) کے نام سے یہ مشہور تھا۔ مغربی اثرات سے قبل اردو میں اس کو کبھی انشائی ادب، ادبِ لطیف، صنف لطیف، لطیف پارہ، انشاپردازی یا مضمون کے نام سے پکارا جاتا رہا۔

اردو میں انشائیہ نگاری کی روایت قدیم ہے لیکن بہت وسیع نہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک زمانے سے یہ صنف اختلافات کی زد میں رہی ہے۔ اختلافات نہ صرف اس کی اصطلاح کے تعلق سے ہیں بلکہ مواد اور موضوعات پر بھی جم کر اعتراضات ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ناقدین کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ وہ ہے جو سرسید یا اُن سے بھی قبل کی تحریروں پر انشائیے کا اطلاق کرتا ہے۔ دوسرا گروہ وزیر آغا کو اس صنفِ نثر کا موجد قرار دیتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے علاوہ ایک تیسرا خیمہ بھی ہے جو دونوں گروہوں کو سچ مانتا ہے اور یہ دلیل دیتا ہے کہ انشائیے کی ابتدائیوں تو سرسید ہی کے زمانے میں ہوئی لیکن وزیر آغا نے اسے نئی

جہت سے آشنا کیا۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ انگریزی ادب کے اثر سے انشائیے میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کے اثرات کو وزیر آغا اور ان کے ہم خیال ادیبوں نے خصوصیت کے ساتھ قبول کیا لیکن سرسید یا اُن کے زمانے میں جو نثر کی نئی صورت ڈھلی تھی اُن میں انشائیہ نگاری کے نقوش موجود تھے۔ اس عہد کے نثر نگاروں کی بہت سی تحریروں کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ انشائیہ نگاری کی جو صورت انگریزی ادب میں موجود ہے وہ بھی عہد بہ عہد اپنے اشکال بدلتی رہی ہے۔ اس منطق کو اگر سامنے رکھا جائے تو بلا شبہ ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ اردو میں انشائیہ نگاری بھی عہد بہ عہد اپنے اشکال بدلتی رہی ہے اور رفتہ رفتہ ترقی کی منزل سے گزرتی ہوئی عہدِ موجود تک پہنچی ہے۔

بیسویں صدی میں غیر افسانوی اصناف ادب میں انشائیہ کا باقاعدہ فروغ اور ارتقاء قیامِ پاکستان کے بعد عمل میں آیا۔ پاکستان کے رسالے 'اوراق' اور 'ادبی دنیا' میں اس صنف پر کھل کر بحث کی گئی اور جسے تحریک دینے والوں میں وزیر آغا سرفہرست ہیں۔ مغرب میں (Light Essay) کے اولین تخلیق کاروں میں مونتین، جانسن اور بیکن کا نام لیا جاتا ہے جبکہ Personal Essay میں چارلس لیمب، چسٹرٹن، رابرٹ لینڈ کے نام لئے جاتے ہیں۔ لیکن اردو ادب میں وزیر آغا کا شمار جدید انشائیہ کو فروغ دینے والوں میں سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔ وزیر آغا کی تحریک پر انشائیہ نگاروں کی ایک پوری جماعت تیار ہوئی۔ لیکن وزیر آغا کی پیش رفت سے قبل ہندوستان میں اختر اورینوری نے اس صنف پر کا تعارف پیش کیا تھا۔ انہوں نے سید علی اکبر قاصد کے انشائی مضامین کے مجموعہ 'ترنگ' پر مقدمہ لکھتے ہوئے پہلے پہل باقاعدہ اسے صنف کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ گویا اختر اورینوی کو اس صنف کے متعارف کرانے میں اولیت حاصل ہے۔

انشائیہ کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں اور اس کے حدود بھی متعین کئے گئے ہیں۔ وزیر آغا نے انشائیہ کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے:

''انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف نثر ہے جو قاری کو بیک

وقت فکرِ لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے اس لئے میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعر کی لطافت اور سفرنامے کا فکری تحرک یکجا ہو گئے ہیں۔''

شارب ردولوی نے انشائیہ کی تعریف اس طرح کی ہے:

''انشائیہ ایک مدت سے ہمارے ادب میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، کسی کو اس کی تعریف پر اعتراض ہے کسی کو اس کے عناصر سے اتفاق نہیں ہے اس لئے کہ جب انشائیہ پر گفتگو شروع ہوتی ہے تو ڈاکٹر ہانس اور ہیزلٹ سے نیچے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یعنی اسے 'ایسے' (Essay) کے مترادف کے طور پر ہی دیکھا جاتا ہے۔ اردو میں شگفتہ نگاری (یا جسے جدید اصطلاح میں 'انشائیہ نگاری' کہتے ہیں) کی روایت بہت قدیم ہے اور غزل کی طرح انشائیہ بھی وہ مخصوص صنف ہے جس سے اردو تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے۔''

شارب ردولوی کے مطابق مغربی افکار کے اردو میں داخل ہونے سے پہلے یہ صنف اردو ادب میں موجود تھی اور اس سے قبل اردو ادب میں انشائیے لکھے گئے ہیں۔ شارب ردولوی کے نزدیک انشائیہ نگاری وہ ہے جس میں شگفتگی یا شگفتہ بیانی ہو۔

رشید امجد کا خیال ہے کہ:

''انشائیہ اظہارِ ذات کی ایک صورت ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر انکشافِ ذات کا ایک ایسا عمل ہے جس میں روحانیت کا ذائقہ بھی ہے اور مادیت کی مٹھاس بھی۔''

محمد یاسین اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''انشائیہ ادب لطیف کی وہ صنف ہے جیسے عام طور پر ہلکے پھلکے

Light Essays سے منسوب کرتے ہیں جس میں انشاپردازی کا مقصد علمی وادبی، سیاسی وسماجی اور اصلاحی نہیں بلکہ محض نشاطی اور انبساطی ہے۔''

دراصل انشائیہ کا تعلق اس نرم ونازک طرز تحریر سے ہے جس میں ایک قسم کی تخلیقی تازگی پائی جائے اور اس کا میدان اس قدر وسیع ہے کہ اس میں تحقیق وتنقید سے لے کر سیاست تک کی بات کی جاسکتی ہے۔ انشائیہ میں استدلال نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں مقالے جیسی سنجیدگی ہوتی ہے بلکہ انشائیہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں انشائیہ نگار Jack of all ہوتا ہے اور وہ کسی ایک مقصد کے طابع نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں کوئی مرکزی خیال بھی نہیں ہوتا اور وہ ہیرو، پلاٹ، کردار، زمان ومکان سب کی بندشوں سے یکسر آزاد ہوتا ہے۔ سید محمد حسنین اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک بلند پایہ انشائیہ نگار گفتار کا غازی ہوتا ہے جسے بات اٹھانے اور بات بڑھانے میں مطلق خوف وخطر نہیں۔ جس عنوان پر چاہے وہ قلم اٹھا سکتا ہے۔ عرش تا فرش اور خلوت تا جلوت ہر جگہ وہ آزادانہ اور فاتحانہ گھومتا ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ بات معمولی ہو یا غیر معمولی، یہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، انشائیہ نگار کا طائرِ خیال چشمِ زدن میں اسے اسیر پنجہ کرلیتا ہے۔''

'ترنگ' کے مقدمہ میں اختر اورینوی لکھتے ہیں کہ:

> ''انشائیوں میں واقعات تو ہوسکتے ہیں مگر ان کا استعمال اور برتاؤ انشائیہ کے خاص رنگ میں ہونا چاہیے۔ اگر انشائیوں میں مختصر افسانوں کی تکنیک برت دی جائے تو پھر یہ انشائیہ نہیں رہے گا۔ بعض ادباء انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اس میں ماجرا اتنا بالیدہ ہوجاتا ہے کہ نتیجہ میں جو چیز پیدا ہوتی ہے کم از کم انشائیہ نہیں ہوتی۔''

محاضرات کو یعنی (Anecdotes) کو انشائیہ کے لئے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ انشائیہ کا اصل حسن اس کی شگفتہ عبارت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کے لئے اختصار بھی شرط ہے کیوں کہ اختصار ہی اس کی کیفیت میں رنگ بھرتی ہے۔ اسی اختصار کے سبب سید محمد حسنین نے اسے نثر کی غزل کہا ہے۔ سید محمد حسنین نے لکھا ہے کہ:

> ''انشائیہ میں داخلیت یعنی Subjectivity ہوتی ہے جو قلم کار کے اپنے تاثرات کو پیش کرتی ہے۔ یہ داخلیت مگر مجرد نہیں ہوتی۔ یہ سماجی کوائف سے آلودہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا مقدس فریضہ آوارہ خیالی ہے۔''

احتشام حسین بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

> ''انشائیہ کو ایک ایسی فلسفیانہ شگفتگی کا حامل ہونا چاہیے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں استدلال کے ذریعے نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے ترتیب انداز بیاں کے ذریعے تاثر قائم کرے۔''

انشائیہ ایک متنازع صنف ادب ہے۔ کیوں کی اس کی صورتوں پر اکثر سوالیہ نشان لگایا جاتا رہا ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہر زمانے میں اس کی صورت بدلتی رہی ہے۔ اس کی ایک صورت تو وہ تھی جسے سرسید احمد خاں اور ان کے رفقا نے پروان چڑھایا تھا۔ اس کی دوسری صورت میر ناصر علی، نیاز فتح پوری، سجاد انصاری، مہدی افادی، خواجہ حسن نظامی، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے ہاتھوں پروان چڑھی تھی۔ اس کی تیسری صورت کو فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، انجم مانپوری، کنہیا لال کپور، فرقت کاکوروی وغیرہ نے پیش کیا۔ اس کی چوتھی صورت وہ ہے جسے وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، نظیر صدیقی، مشتاق قمر، جمیل آزر، غلام جیلانی اصغر وغیرہ نے پروان چڑھایا ہے۔ ابتدائی تین صورتوں میں اسے Personal Essay کی شکل میں فروغ ملا۔ آخری صورت Light Essay کی شکل میں ظہور پایا۔ تاہم ۱۹۶۰ء کے بعد چوتھی صورت نے ایک

تحریک کی شکل اختیار کر لی اور اس زمانے میں انشائیہ نگاری میں زندگی اور اس کے مظاہر کو
نئے شخصی زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی اور اس میں مزید رنگارنگی، تاثر، تازگی اور آوارہ
مزاجی پیدا کی گئی۔ جس سے یہ صنف روشنی اور دھندلکے کا خوبصورت آمیزہ بن گئی۔ وزیر آغا
نے ’خیال پارے‘، ’چوری سے یاری تک‘ اور ’دوسرا کنارہ‘ کے ذریعے اس صنف کو نئے
منظر نامے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ اس روش پر چلنے والوں میں مشتاق احمد
یوسفی نے ’چراغ تلے‘، ’خاکم بدہن‘، ’زرگزشت‘ اور ’آبِ گم‘ کے ذریعے، مشتاق قمر نے ’ہم
ہیں مشتاق‘ کے ذریعے، جمیل آزر نے ’شاخِ زیتون‘ کے ذریعے، اکبر حمیدی نے ’جزیرے کا
سفر‘ کے ذریعے، انجم نیازی نے ’سورج اور سمندر‘ کے ذریعے، اس صنف کو نئی شکل میں مستحکم
کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید ضمیر حسن دہلوی، خالد محمود، اسد رضا، اظہار عثمانی، نصرت
ظہیر، منظور عثمانی وغیرہ نے بھی اپنے انشائیوں کے ذریعہ نئی بصیرتوں کی تلاش کی ہے۔

□□□

مرزا حامد بیگ

انشائیہ کی کونپل

ادب کی بساط پر برج اُلٹ گئے۔ دانا وزیروں اور پیادوں کی ریل پیل میں حکمرانوں
کا کاسۂ سر اپنی پہچان کھو بیٹھا اور نئی توانا آوازیں زندگی کا اظہار بنیں۔

ہم آپ مردہ تحریکوں کے آخری سانس گن رہے ہیں جو پورے ہونے میں نہیں آتے
لیکن تبدیل شدہ پس منظر میں بجتی ہوئی آوازوں کی بازگشت سامنے کے منظر کو دھندلا رہی
ہے۔ اگیا بیتال کے لہریئے لیتے، انسانی ڈھانچے سراب بن رہے ہیں۔ ادب کی اس
دھندلی بساط پر مردہ تحریکوں کی یہ ضرورت بنتی ہے کہ اصنافِ ادب میں نئی ہیئت پیٹرن اور
تجربوں کی پہچان سے جان بوجھ کر اجتناب برتیں۔ ان کا اپنا وجود اس صورت میں ممکن ہے
کہ رواں ستھرے پانی کو گدلا کریں۔ یہ زندگی سے خوف زدہ لوگوں کی کوششیں ہیں اور کاٹھ
کباڑ کے انبار۔

اُردو انشائیہ ایسی ہی دھندلائی ہوئی بساط پر ایک مدھر لئے ہے— ایک کومل، نزدل کونپل۔

میں نے انشائیہ کے اردگرد جس دھندلاہٹ کا ذکر کیا ہے، وہ اپنے اجزائے ترکیبی
کے اعتبار سے چند لایعنی تصورات سے ترتیب پاتی ہے۔ دیکھنے والی کور آنکھیں ہیں اور
متعصب رویہ۔ ابتدا میں اس صنف ادب کو Root Less قرار دیا گیا، اگر ایسا ہوتا تو بے
بنیاد عمارت کے دن گزارتی؟ دراصل یہ Essay کا پھیلاؤ تھا۔ ایسے کی طاقتور جڑوں نے
یورپ اور ہمارے ہاں زمین اور اس کے متعلقات کے حوالہ سے اپنا اظہار کیا جس کے نتیجہ
میں ہمارے ہاں مزاحیہ، طنزیہ Caricature تا تحریف اور تاثراتی ایسے کے ساتھ ساتھ ایک
نئی ہیئت ترکیبی سامنے آئی، اس کا نام ہے انشائیہ۔ ان بنیادوں میں اُردو انشاء نگاری کی

قدیم روایت بھی ہے۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ انشائیہ کے گرد دھندلاہٹ کی ایک دبیز چادر ہے۔ الجھنیں پیدا ہوئیں اور جان بوجھ کر پیدا کی گئیں۔ انتھالوجی ''اُردو کے بہترین انشائیے'' مرتبہ جمیل آذر، لارڈ برکن ہیڈ کی Essays of yesterday & today اور A month of Essays کی طرح بہت سے الجھاوے رفع کر رہی ہے۔ یہ کام بہت پہلے ڈاکٹر وحید قریشی انجام دے پاتے لیکن انہوں نے انشائیے جمع نہیں کیے۔ اُردو Essay کی ایک ادھوری روایت (جسے ہم انشائیے کی جڑیں کہہ سکتے ہیں) ترتیب دے بیٹھے، اور اس سے مزید گھپلے پیدا ہوئے۔ اس لئے اب مجھے اجازت دیجئے کہ اُردو انشائیہ کے بھرپور مطالعے کے ضمن میں انشائیہ کی جڑیں روایت سے تلاش کروں۔ جمیل آذر کی انتھالوجی کے تین مضامین بھی اس کے محرک بن رہے ہیں۔ ذرا پس منظر پر نظر ڈالیں۔

فرانز کافکا اور مونٹین دو ابنارمل فنکار تھے جو دوستوں میں اپنی یادیں اور تجربات چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ ان کی خالصتاً نجی تحریریں اس قدر اہم تحریکات کی صورت اختیار کرلیں گی، یہ دونوں نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ کافکا کے افسانوں کے ساتھ بنائے ہوئے اسکیچز اس کی خالصتاً نجی ایکٹوٹی تھی اور مونٹین کی یادیں بھی، لیکن دونوں عظیم فن کاروں کی اس ذاتی ایکٹوٹی کو لوگوں نے 'قومیا' لیا۔ بوڑھے مونٹین کی ذاتی صورت حال میں شرکت کرنے والے مل گئے، اس لئے بقول انتظار حسین وہم اپنے باطن کے سفر پر نکل کر اندر ہی اندر دوسروں کے باطن سے بھی گزر جاتے ہیں، اور ہمارا ذاتی سفر ''غیر ذاتی'' بن جاتا ہے۔ مونٹین فرانسیسی سول ملازم تھا جو ریٹائرمنٹ کے بعد ایک 'یادوں کی برات' ترتیب دے رہا تھا۔ اس میں ضمناً جو عنوانات بن گئے ان میں سے اہمیت کے حامل وہ افکار ہیں جو کائنات کے بارے میں غور و فکر اور کامیاب زندگی گزارنے کے گر سامنے لاتے ہیں۔ مونٹین کی یہ Meditation ہی اول آخر انشائیہ نگاری کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔ البتہ Prose Composition کی مثالیں 16 ویں صدی سے بھی پہلے کے یونانی ادب سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مونٹین نے ان ''نثری ٹکروں'' کا Meditation کے ساتھ سنگھار کیا۔ انگلستان میں بیکن نے یہ صورت حال دیکھتے ہوئے ''نجی تحریروں'' والی بیخ ہٹادی۔ لیکن ان دنوں اصناف ادب میں

مروج معنوں میں ایسے کی ہیت موجود نہیں تھی۔ بیکن نے اپنی تحریروں کو ''بکھری ہوں سوچوں'' کا نام دیا اور اس پر فلسفے کی چھوٹ ڈالی۔ اس طرح بیکن کے حوالے سے ایسے کی فارم میں ارتقاع کا رجحان سامنے آیا۔ ہمارے شبلی نعمانی کی طرح بیکن نے بہت اونچی مسند سے قاری اور سامع کو دہشت اور تحیر میں بتلا کر دیا۔ اس طرح یہ مسئلہ لاینحل نہیں رہتا کہ 17 ویں صدی میں ایسے کیوں نہیں لکھا گیا۔ نسبتاً نجی نوعیت کے ایسے کی اس ناکامی کے بعد نصابی نوعیت کی مضمون نگاری سامنے آئی۔ جس میں مذہب، فلسفہ اور ادب کی درس و تدریس ملتی ہے۔ 18 ویں صدی، معلّمینِ اخلاق کے بام عروج کا زمانہ ہے۔ ''اسپکٹیٹر'' جاری ہوا اور Essay کا براہ راست اثر 'تہذیب الاخلاق' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ''ٹیٹلر'' کی بھی ہمارے ہاں اسی طرح پذیرائی ہوئی اور ریمبلر (مرتبہ ڈاکٹر جانسن) کے اثرات بھی ہم با آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ اصلاحی تحریک نے مزاحیہ مضمون کا رخ کیا تو پنچ نکلنا شروع ہوا۔ ہمارے ہاں 'اودھ پنچ' کا زمانہ بھی وہی ہے۔ 'اودھ پنچ' کے اجراء سے مضمون نگاری میں گہما گہمی پیدا ہوئی۔ بعد میں ''اودھ پنچ'' اور ''ریاض الاخبار'' کے مضمون نگاروں کی معرکہ آرائی نے مزاحیہ، طنزیہ، تحریف، Caricature اور تاثراتی مضمون نگاری کے لئے ابتدائی اور بنیادی کام کیا۔ 18 ویں صدی کے اواخر اور 19 ویں صدی کے آغاز کی کالم نگاری جس طرح بعد میں سالک، حاجی لق لق، مجید لاہوری اور انتظار حسین کی سطح کے کالم نگاروں کے لئے زمین ہموار کر رہی تھی، اسی طرح طنز و مزاح اور انشائیہ نگاری کے لئے بنیادیں فراہم کر رہی تھی۔ حاجی لق لق اپنے سیاسی مخالفین کو خراب کرنے کا مصرع طرح آج کے مُنّو بھائی اور م۔ش کو دے گئے، لایعنی بنا کر مخالفین سے بدلہ لینے کی ابتداء بابا ڈرائیڈن کر گئے تھے۔

انشائیہ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے سراسر مزاحیہ نہیں، یہ انسان سے تعلق کے باوجود زندگی اور زندگی کرنے والوں کی خصلت میں ناہمواریوں کی تلاش نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کا چلن Satire ہے جس کا جنم جھنجلاہٹ سے ہے اور جس میں طنز نگار کی شخصی برتری کا پہلو نمایاں ہو کر تلخ اندیشی، نفرت اور حقارت اگلتا ہے۔ یہ پیروڈی بھی نہیں ہے۔ اس طرح طنز اور تحریف کی ناپسندیدگی کو حدود میں لانے کی خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے۔ Irony اسے بنیادی

ضروریات کی سطح پر انشائیہ کو کوئی علاقہ نہیں۔ تاثراتی مضمون سے انشائیہ اس طرح مختلف ٹھہرتا ہے کہ یہاں زورِ بیان دکھانا مقصود نہیں اور محض جذباتیت سے اس طرح جان چھوٹ جاتی ہے کہ انشائیہ میں بہر طور ایک مہذب اور بردبار رویہ جاری و ساری رہتا ہے، فاضل ہمدردی کے اخراج کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اس طرح اُردو طنز و مزاح کے تمام بڑے نام انشائیہ نگاری کے ذیل میں نہیں لئے جا سکتے۔

یہ تو ذکر تھا پس منظر کا جس میں انشائیہ کی جڑوں کو بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک عجیب بات یہ سامنے آئی کہ مونٹین کے نسبتاً نجی نوعیت کے ایسے کو اس کی زندگی میں تو بہت شہرت ملی اور برطانیہ میں بیکن اس راہ پر چل نکلا، لیکن بعد میں یورپ ان دونوں کو پس پشت ڈال کر معلمین اخلاق کا شکار ہو گیا اور ہمارے ہاں تو مونٹین پہنچا ہی نہیں تھا۔ ہم نے تو اپنی ضروریات کے تحت اصلاحِ معاشرہ والا ایسے چن لیا۔

19 ویں صدی میں نجی نوعیت کے ایسے کی راہوں پر چلتے ہوئے باقاعدہ انشائیہ نگاری کا آغاز چارلس لیمب، ہیزلٹ، ہنٹ اور ڈی کوئنسی سے ہوتا ہے۔ چارلس لیمب ایسے کا شہزادہ، کہلاتا تھا۔ لیمب کا عہد انگریزی ایسے کا ابتدائی عہدِ زریں ہے۔ 20 ویں صدی میں چسٹرٹن، رابرٹ لنڈ، اسٹیونسن، ورجینا وولف اور بیر بہوم نے ایسے کا معیار قائم کر دیا۔ ان کے ایسے پر 20 ویں صدی کے معاشرتی اور معاشی مسائل کی چھوٹ بھی نظر آتی ہے۔

فرانسیسی میں Essay کی روایت عربی کے السعی، سے پڑی جس کے معنی ہیں، کوشش، یہ اظہار کی کوشش کسی بندھے ٹکے اصول کے مطابق نہیں تھی۔ اس لئے اسے ''کوشش'' ہی رہنے دیا گیا۔ اور ضرورت کے مطابق کوشش کے ساتھ صنعتیں استعمال کر کے موضوعی سطح پر مختلف نام دے دئے گئے۔ اب جہاں تک Impersonal اور Personal Essay کا تعلق ہے یہ الجھن تو بیکن نے ابتدائی دنوں میں ہی رفع کر دی تھی اور خالصتاً انشائیہ طرز کی تحریروں کو ''بکھری ہوئی سوچیں'' کا نام دیا تھا، ہمارے ہاں لفظ انشائیہ، اس اعتبار سے زیادہ جامع ہے اور اس کی بھی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں انشائیہ نگاری کا نام بہت چلا ہوا تھا۔ میں یہاں انشاء اور انشائیہ کے جھگڑے میں نہیں پڑوں گا۔ اس ضمن میں مشتاق قمر کا مضمون

مطبوعہ، اوراق، یہ الجھنیں پہلے ہی رفع کر چکا ہے۔

اُردو انشائیہ Personal Essay نہیں ہے، اسے اپنی زمین کی سپلائی لائن کے حوالے سے Personal Essay کی توسیع کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو Personal Essay کا ابتدائی تجربہ اس وقت فلاپ آ گیا تھا، جب مونٹین کے نجی احساسات میں شرکت کرنے والا پہلا قاری نصیب ہوا اور بعد میں ان خود کلامیوں کی مقبولیت نے ایسے کی شخصی سطح توڑنے ہی نہیں دی۔ اس لئے کہ انتہائی نجی صورت حال میں بھی نجی احساسات کے ضمن میں روایتی سطح پر دیگر افراد کے احساسات سے اپنا رشتہ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ پرسنل ایسے کو چھاپے جانے کی خواہش بھی اس کا رد نفی ہے۔ اسی طرح Essay پر نظر ثانی بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ قاری مدنظر ضرور ہے۔ تو Essay پرسنل کہاں رہا؟ اس طرح Personal اور Impersonal کی اصطلاح ہی مبہم ٹھہرتی ہے۔ سو یہاں تو میں انشائیہ کے بہت سے نقادوں سے اختلاف رکھتا ہوں۔ بالکل اس طرح کوئی لاکھ کہے کہ کیٹس کے اپنی محبوبہ کے نام خطوط اور اقبال، غالب یا W. B. Yeats کے خطوط میں انشائیہ نگاری پوشیدہ ہے، جاہلانہ بات ہوگی۔ Yeats تو اپنے خطوط پر نظر ثانی بھی کرنا چاہتا تھا لیکن کیا نظر ثانی کے بعد خطوط، انشائیہ کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں؟

'ریمبلز' کے بیشتر مضامین 'غیر رسمی طریقۂ کار' کی مثال ہیں لیکن جہاں ڈاکٹر جانسن انشائیہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے A loose Sally of the mind کہتے ہیں اصل گڑبڑ وہاں سے پیدا ہوئی ہے۔ جمیل آذر ان سے متفق ہیں اور مجھے ان سے اختلاف ہے۔ اس لیے کہ جدید نفسیات کی روشنی میں آزاد تلازمۂ خیال بھی ایک سطح پر تلازمۂ خیال ہوتا ہے۔ 'Loose sally' تو بے ربطی کا باعث بنتی ہے۔ انشائیہ خواہ کتنا ہی سبک اندام کیوں نہ ہو، اس میں بہر طور ایک ربط ہوتا ہے۔ اسی طرح انشائیہ ایسی کوشش کہلائے گا جو شعوری سطح پر ہو یا لاشعوری سطح پر لیکن بہر طور مربوط شے ہوگا۔ اس کوشش کو مربوط بنانے کے لئے تخلیق کار کی شخصیت مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ شاید اسی لئے یورپ کے تمام اعلیٰ سطح کے Essays میں مکمل تنظیم نظر آتی ہے۔

اسی طرح جانسن نے انشائیہ کو غیر رسمی طریقہ کار کہہ کر انشائیہ کی تعریف کو مہمل بنا دیا۔

اس لئے کہ مروج روایات سے باغی، ہر تحریر اس کھاتے میں ڈالی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے تخلیق کار کے اظہار ذات کو درخور اعتنا نہیں جانا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاں ڈاکٹر وحید قریشی اب تک اس نظریے پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ تمام فکشن، نثری ٹکڑے اور شاعری، انشائیہ کے مختلف روپ ہیں۔ لیکن کسی بھی ادبی صنف کو بے چہرہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔ جو چیز بھی کسی تنظیم کے تحت تخلیق پائے گی وہ بے چہرہ نہیں ہوگی۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ انراج (Chaose) کو فارم دینے کا نام ہی ادب ہے۔ البتہ فکشن کی طرح انشائیہ میں بھی ایک چھوٹ ہے وہ یہ کہ اس کی فارم، موضوع اور Treatment کی سطح پر لچک ہے۔ انشائیہ کو اہم بنانے والی شئے تخلیق کار کا انفرادی اسٹائل ہے۔ اسی طرح ایک ہی موضوع پر دو الگ انشائیہ نگار فن پارے کو قطعاً مختلف Treatment سے آشنا کر کے اپنی الگ پہنچان کرواتے ہیں۔ ورجینا وولف نے بھی پیش پا اُفتادہ موضوعات کو انفرادی Treatment دے کر چونکا دیا تھا۔

انشائیہ میں ذات کے انفرادی گوشوں کی رونمائی کے ساتھ جس قدر کام شعور کی رو سے لیا گیا ہے، کوئی اور صنف اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ناول اور افسانے میں شعور کی رو نے الجھنیں پیدا کیں اور گنے چنے فنکار ہی اسے صحیح طور پر برتنے میں کامیاب ہوئے اور انشائیہ کو گہرائی سے آشنا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تخلیق کار نیم شعوری سطح پر اپنے موضوع کو برتے۔

ورجینا وولف نے ناول "To the light house" میں شعور کی رو کے کامیاب ورتارے کے بعد انشائیہ کا رخ کیا اور انشائیہ کا معیار قائم کر دیا۔ لیکن شعور کی رو کو برتنے والے دیگر بڑے ناول اور افسانہ نگار مثلاً مارسل پروست، جوائس اور ہنری جیمز کی طرح ہمارے ہاں قرۃ العین حیدر یا احمد علی انشائیہ نہیں لکھ سکے۔

انشائیہ کے لئے شعور کی رو اور تجرید بہت اہم وسیلۂ اظہار ہیں۔ اسی وجہ سے ہم اپنے عہد کی بے ربطی اور انتشار کو بہت خوبی کے ساتھ انشائیہ میں سمیٹ سکتے ہیں۔ یہی ٹکڑے ٹکڑے زندگی جس طرح حیاتیاتی وحدت میں ڈھلتی ہے، انشائیہ میں اپنے وحدتِ تاثر تک

رسائی پاتی ہے۔

سلیم اختر کا یہ کہنا کہ انشائیہ واحد صنف ادب ہے جو نثری کہلا سکتی ہے، بالکل درست ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ یونانی نثری ٹکڑوں کی جس روایت کو مونتین نے پیش نظر رکھا تھا۔ اب تک کے ادب میں وہی نثری ٹکڑے خالص نثر کے بچ رہے ہیں۔ ورنہ نظم کی لپیٹ میں کیا کچھ نہیں آگیا۔

اُردو میں نسبتاً نجی نوعیت کے مضمون کی توسیع پہلی بار ڈاکٹر وزیر آغا (خیال پارے 1960ء) کے ہاں 'انشائیہ' کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ وزیر آغا کے خیال میں اختصار (بلکہ کفایت) غیر رسمی طریقہ کار، اظہار ذات، شگفتگی اسلوب اور عدم تکمیل انشائیہ کو دیگر اصناف سے جدائی کرتی ہے۔ انشائیہ زندگی کرنے کے ایسے رویہ کا بھی مطالبہ کرتا ہے جو اردگرد پھیلے ماحول کو ہموار سطح سے دیکھنے کا عادی ہو۔ احساس برتری اور احساس کمتری، طنزیہ اور مزاحیہ مضمون کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ یہ ہموار سطح ہی ہے جو انشائیہ کو ایک متوازن صورت سے دو چار کرتی ہے۔ زندگی کرنے کا یہ ایسا رویہ ہے جو ہمیشہ پیش نظر کے ساتھ ایک ہو کر زندگی کرنا اور سہنا سکھاتا ہے۔ اس لئے انشائیہ کی نشوونما کے لئے حالات سازگار ہیں۔ انشائیہ نے لخت لخت ذات کو یکجا کرنا چاہا ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمام عالم کے گزشتہ تیس برس کی تبدیلیاں اس صنفِ ادب میں جس کامیابی کے ساتھ سمیٹی جاسکتی ہیں، اس طرح شائد افسانے اور ناول میں بھی ممکن نہ ہو۔ اس لئے بھی کہ انشائیہ میں فن کار اپنے مرکز سے خود کو منقطع کر کے اپنے لئے ایک اور مرکز دریافت کرتا رہتا ہے۔ تبدیل ہوتی ہوئی صورت حال کے ساتھ اپنی سطح ہموار کر لینے کی یہی خوبی انشائیے کو اپنے گردوپیش سے بچھڑنے نہیں دیتی۔

سوشل کمنٹری اور Human Element انشائیہ کے لئے ضروری ہے۔ یہ علیحدگی کے شکار فرد کی تحریر نہیں۔ یہ Human Element سطحی نہیں ہوگا بلکہ گہرائیوں میں جانے کی ضرورت پیش آئے گی۔ یہاں ذہانت اور فطانت کے بوجھ سے تحریر کو بوجھل نہیں بنایا جائے گا جس کی مثالیں میتھیو آرنلڈ کے Essays میں ملتی ہیں۔ وہ تو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ چوسر کو رد کرتا اور گرے کو اس پر فوقیت دیتا ہے۔ اس High Seriousness کا متحمل انشائیہ نہیں

ہوسکتا، بلکہ چارلس لیمب کے بھی بیشتر انشائیے، اُردو انشائیے کی طرح Light نہیں رہتے، بوجھل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لیمب کے وہ حصے جہاں ابتدائی برہمچاری عہد کی یادوں کے دھند لکے ہیں اور لیمب نے اسکیچز بنانے کی کوشش کی ہے۔

انشائیہ کسی خاص طرح کی معاشرتی خدمت کے طور پر بھی نہیں لکھا جاتا، اس لئے اس میں ''لے سانس بھی آہستہ''، ''جوہر کا المیہ''، ''عقل کا استعمال (مشکور حسین یاد) طرز کی تحریروں کی گنجائش نہیں نکلتی اور یہ اصلاحی جذبہ ایسی تحریروں کو انشائیہ نہیں بننے دیتا۔ انشائیہ میں تو ایک انوکھے زاویے کی دریافت ہوتی ہے۔ وہ ایک مشہور کرسچین قول ہے۔ ''جنت میں شادیاں ہوں گی۔'' آسکر وائلڈ نے اسے ایک نیا رخ دے دیا۔ اس نے کہا ''اگر جنت میں شادیاں ہوں گی تو طلاقیں بھی ہوں گی۔''

انشائیہ اپنے موضوع کو عام سطح سے اونچا اٹھا کر لے جاتا ہے۔ پیش منظر کی مروج سطح کو ماورائی کیفیت عطا کر دیتا ہے۔ اس کی بہت عمدہ مثالیں ہمیں حمید احمد خان کے ایسّے ''انگلستان میں کتے کا معاشرتی مقام'' سے ملتی ہیں۔ کتا انسانی تعلقات کو Replace کر رہا ہے۔ بہت ممکن ہے حمید احمد خان کے پیش نظر جارج ایلیٹ کا ناول "Silas Marner" رہا ہو جس میں مرکزی کردار کی سب سے بڑی محبت سونے کی گنی ہے۔ اس خزانے کے چرائے جانے کے بعد وہ ایک لاوارث لڑکی کے سنہرے بالوں میں سکون پاتا ہے۔ اس طرح چاہت کا رس سوکھ نہیں پاتا۔ اسے دوسرا چینل مل جاتا ہے۔ حمید احمد خان ایسے بھی کتے سے آگے نکل کر فلسفیانہ اور نفسیاتی مسائل تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ البتہ اس کی بوجھل مثالیں ایسّے کو انشائیہ نہیں بننے دیتیں، سٹائل کے اعتبار سے سبک اندام ہے۔

انشائیہ Sublime صورت حال سامنے نہیں لاتا۔ تحیّر اور خوف میں گھری ہوئی خوبصورتی کا نام انشائیہ نہیں ہے۔ لانجائنس کے اس تصور میں اگلا قدم اسلوب کا ہے انشائیہ میں Sublime صورتِ حال کی مثالیں نظیر صدیقی کے ہاں ملتی ہیں۔

انشائیہ تو Meditation سے جنم لیتا ہے اور انشائیہ نگار غور فکر کر کے مروج اور مقبول زاویے نئے پرانے کرتا ہے، بالکل سوئفٹ کی "Meditation Broom Stick" کی طرح

جب سوئفٹ آدمی کو الٹا کھڑا ہوا جھاڑو کہتا ہے تو سوچ کو مہمیز لگتی ہے اور ہمارے سامنے لامتناہی وسعت آجاتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں خاص طرح کی spice اسے مزاحیہ یا طنزیہ مضمون بننے سے بچا لیتی ہے۔ منفرد سٹائل انشائیہ کو اہمیت بخشتا ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انفرادی اسٹائل میں علامتیں، امیجری، سیمبلیز اور تلمیحات کا درتارا کیسا ہے۔ ہماری یہ پرکھ اعلیٰ فن پاروں کی پہچان میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے یہاں وضاحت کر دوں کہ انشائیہ پروز ہونے کے باوجود Prosaic نہیں ہوتا۔ فن کار اپنی ذات کے حوالے سے امیجری اور علامتیں برتتا ہے۔

انشائیہ کا موضوع اور اسلوب ایک ہارمنائزڈ کیفیت سامنے لاتا ہے جو صرف اور صرف تنظیم کے تحت جلوہ افروز ہوتی ہے۔ انشائیہ کا اظہار نسائی دھیمے پن کا اظہار بھی ہے۔ لیکن ایسا نسائی اظہار جو جذبات اور تخیلات کی سطح پر زیادہ جذباتی صورت سامنے نہ لائے، اس لئے کہ انشائیہ میں فن کار کی ذات کا ٹھہراؤ اور بردباری اہم ہے۔ وحید قریشی انشائیہ میں جاری رویہ کو سراسر فنکار کا جذباتی رویہ سمجھتے ہیں جو سرے سے غلط ہے۔ انشائیہ جذباتی سطح پر مادر سری اصول زیست کے جذباتی انداز اور پدرسری اصولوں کے ٹھہراؤ اور بردباری کے توازن سے کام لیتا ہے۔ مجھے اعلیٰ انشائیہ میں جذباتی سطح پر مادرسری اصول کی کارفرمائی اور پدرسری کا ٹھہراؤ اور بردباری کا ایک توازن نظر آتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ صنف صرف مردوں کا اظہار ہے اس لئے بھی درست نہیں کہ استثنائی صورتوں میں عورت کے لئے بندھے ٹکے نفسیاتی فارمولے غلط ٹھہرتے ہیں اور تخلیق کاری، بہر طور استثنائی مثالوں سے ہی سامنے آتی ہے۔ لیڈی روز میکالے کی وجہ شہرت سراسر انشائیہ ہے۔ الزبتھ بادن اور ورجینا وولف نے انشائیے کا معیار پیش کیا اور الزبیتھ سٹ ویل نے ادبی تنقید کے ساتھ ساتھ متعدد انشائیے رقم کیے، بلکہ دیکھا جائے تو "Blooms Bury" جو فن کے شیدائیوں کا ایک گروپ مشہور ہے اور ان لوگوں نے 1915ء کے بعد تقریباً بیس پچیس سال اقلیم ادب پر حکمرانی کی، اس میں ہکسلے، ایلیٹ، لارنس، اور لٹن اسٹریچی کے ساتھ ورجینا وولف بھی شانے سے شانہ ملائے کھڑی ہے۔

انشائیے میں جذبہ فکر کے ساتھ گندھ کر سامنے آتا ہے۔ اس لئے محسوسات اور سوچ کے وسیع تر امکانات سامنے لاتا ہے۔ جذبہ، فکر، لفظیات اور انشائیہ نگار کی Treatment کی بہت مربوط صورت انشائیہ میں ظہور پاتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ انشائیہ کو جذبے، فکر اور ورتارے کی مختلف سطحوں پر الگ الگ نہ پرکھا جائے اور اس کی پرکھ اس کی کلیت میں ہونی چاہئے۔ اسی طرح انشائیہ نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ اختتام میں سوچ کی راہوں کو محدود نہ کردے اس سے انشائیہ ایک وسیع تر اپیل کھودے گا۔

□□□

اُردو انشائیہ کا فکری بیک یارڈ

(۱)

نثر میں جب استعارہ پھیل کر مسکراہٹ اور ماورا ہو کر اسرار ذات کا لائحہ عمل بن جاتا ہے تو انشائیہ کی جہت مشکبار مسکراہٹوں کی ہم نوائی میں پیش قدمی کرتی ہے۔ انشائیہ کی جہت دراصل ارتقائی انسانیات کی تہذیبی آہٹوں کی ابتدائی جہت ہے۔ ارتقا کے دھندلکوں میں ایک دن کسی نامعلوم مقام پر انسان نے بندر کو مسکرا کر دیکھا تھا اور ہمیشہ کے لئے اس سے الگ ہو گیا تھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی شفق لانے والے عضلات چپکے سے ابھر آئے تھے۔ یکایک انسان پر نئی وسعتوں کا سورج طلوع ہوا تھا جس کی روشنی میں اس نے معروضی جبریت اور جبلی تشدد سے ماورا ہونے کا راستہ پا لیا تھا۔ جب کہ بندر معروضی جبریت اور جبلی تشدد کے دائرے میں محصور بہت پیچھے رہ گیا۔

پھر برف کا آخری دور شروع ہو گیا۔!

اور انسانی مسکراہٹ ماورا ہو کر تصویری صورت میں رہائشی غاروں کی دیواروں پر آویزاں ہو گئی۔ انسانی ذات کے اظہار کی یہ اولین دستک تھی کہ جس کی گونج دور دراز کے ستاروں تک پھیلتی چلی گئی۔ انسان کی طرف سے جمالیاتی عقل کے جال میں وقت اور فطرت کو مقید کرنے کا آغاز ہوا تھا اور اس ناطے اس پر داخلی تشدد اور خارجی جبر کی اضافیت منکشف ہوتی گئی جس کے زینہ بزینہ خود موضوع ہونے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو محمول کے طور پر دیواروں پر منعکس کر دیا تھا۔ جمالیاتی دانش کے اظہار کے یہ چند اولین پھول تھے جنہوں نے کڑی دھوپ اور تیز ہوا میں اپنے ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس اعلان کی بازگشت انسانی فکر و فن اور سائنس و ادب کے محرابی دروازوں کے اندر اب بھی سنی جا رہی

ہے۔زیادہ مضبوط اور شفاف۔

انشائیہ اس منظر نامے میں کڑی دھوپ اور تیز ہوا میں اپنے ہونے کا اعلان ہے، انسانی مسکراہٹ کا اعلامیہ ہے۔ جمالیاتی دانش کا تصویری خبر نامہ ہے۔ اس عکس نہاد میں ڈاکٹر وزیر آغا کا انشائیہ کتابوں کی معیت میں، انسان کی لازوال مسکراہٹ کا وسیع استعارہ ہے کہ اس استعارے کے دامن میں اشیا اور واقعات بے انتہا خوبصورت مگر اضافی ہیں، وجودِ زیست کا استمرار ایک مسلسل جمالیاتی تسلسل ہے۔ وجود اور لفظ تخلیقی بہاؤ کے رشتے میں مربوط ہو کر تعلقاتی دائرہ تعمیر کرتے ہیں۔ ان تعینات میں تین کتابوں The Immense journey, thus Spake, Zarathustra اور Leaves of grass کا وضاحتی حوالہ اُردو انشائیہ کے بیک یارڈ کی تہہ در تہہ وضاحت ہے۔

(2)

والٹیئر کا قول ہے: ''ہمیں اپنے بیک یارڈ کو سرسبز و شاداب بنانا چاہئے۔''

فرانس بیکن' والٹیئر سے متفق ہے اور وہ عہد نامہ عتیق کے باب پیدائش کے کشف سے اتفاق کرتا ہے کہ خدا نے سب سے پہلے باغ لگایا تھا۔ باب پیدائش میں مذکور ہے۔

''خدا نے سب پر جو اس نے بنایا تھا نظر کی اور دیکھا کہ بہت اچھا ہے۔ سو چھٹا دن ہوا۔ خدا نے ساتویں دن کو مقدس ٹھہرایا کہ ساتویں دن تخلیقی کرب، تخلیقی ارتفاع میں تبدیل ہوا اور خدا اس دن کی فراغت میں اپنے اسرار کی مسرتوں، خوشبوؤں اور رنگوں سے لطف اندوز ہوا، خداوند خدا نے مشرق کی طرف عدن میں باغ لگایا اور ہر درخت جو دیکھنے میں خوشنما اور کھانے کے لئے اچھا تھا زمین سے اگایا۔''

اس دوران آدم اور حوا صبح ازل کے عنبریں جھونکوں اور نئی نویلی دھنک رنگ کرنوں کے ہم قدم تقویم احسن کے مرحلے سے گزر چکے تھے اور تمثیل ہے کہ خداوند خدا ٹھنڈے وقت باغ عدن میں چہل قدمی کرتا، یوں خدا، باغ عدن اور آدم کا ساتھ تخلیقی لمحے کی ایک عظیم مثلث ہے جسے ارتقائی سفر کی علامت بھی کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کے ایڈیم میں در حقیقت یہ اتھلے پانیوں اور فراموش شدہ جھیلوں کے دلدلی انتظار اور اضطراب کی کوکھ سے

زندگی کے عظیم الشان سفر کا آغاز ہے۔ چنانچہ ایک سبز تر جگمگاہٹ ابتدا میں دور دور تک پھیل گئی تھی۔ پھر کروڑوں سال بیت گئے تھے Immense journey کے مصنف ڈاکٹر لورین آئزلے نے زیست کے سفر کی تصویری روداد پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''اس زمانے میں ہریاول کے سوا کچھ نہ تھا۔ جدھر دیکھو سبزہ ہی سبزہ۔ یکساں ہموار سبزہ دکھائی دیتا۔ ابھی تک گھاس اور اس کی مختلف اقسام وجود میں نہ آئی تھیں۔ گھاس کے طویل و عریض میدان بھی دھوپ میں نہ چمکے تھے، سبزہ زار، مرغزار، گل بہاریاں، اور چراگاہیں، ابھی پردہ غیب سے باہر نہ آئی تھیں۔ اس منظر میں ہمہ گیری، تنوع اور ہفت رنگی کی صفات بہت کم ہیں، ہر طرف یک رنگی اور ہم آہنگی ہے، سچ پوچھئے تو یہ گویا کسی جن کی دنیا تھی۔''

پھر ایک شدید مگر بے آواز دھماکا ہوا۔ لاکھوں سالوں پر محیط افراتفری کے بطن سے اچانک پھول دار پودے، رنگ، خوشبو، مسرت، پیدا ہو گئی تھی، ڈاکٹر لورین آئزلے مشاہد ہے کہ یہ پھولوں کی پیدائش کا ہی نتیجہ تھا کہ انسان بڑے پراسرار انداز میں وجود کا لباس پہن کر عالم نمود میں چلا آیا تھا۔

پھول اور انسان کا پیدائشی تعلق ایک ناقابل فہم اسرار ہونے کے باوجود سرسبز و شاداب تمثیلی استعارہ ہے جس کے سینے میں سات رنگ اور سات سر انگڑائیاں لیتے آبگینے ہیں۔ انسان ان آبگینوں کے جھرمٹ میں ہی اپنے وجود کی پہچان سے گزرا ہے کہ اس درجے پر تخلیق کا دلدلی کرب انسان کے وجود کی سند ہے۔ روشنی رنگ اور خوشبو اس کا لینڈ سکیپ ہے، پرانے عہد نامے میں وہ باغ عدن میں کھڑا ملتا ہے اور بعینہ ڈاکٹر لورین آئزلے کے عظیم سفر میں اس کا ظہور پھولوں سے مربوط نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے پھولوں کے قدم بہ قدم باغ عدن کا بیک یارڈ ہے۔

دجلہ و فرات کی وادیوں میں شاعری، ڈرامہ اور داستانیں سرسبز بیک یارڈ کا حصہ ہیں۔ انہیں ہم محدود سطح پر Safety valve کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ معروضی جبریت، صحرائی جھکڑوں، اڑتی ریت کے تودوں، دریائی طوفانوں، وبائی حملوں اور

حیوانی وانسانی درندوں کی بے پناہ یلغاروں پر مشتمل پیش منظر تھی۔ جب کہ جبلی تشدد، بھوک، جنس اور درندگی انسان کی ذات کے لامحدود ویرانوں میں چھلل پایوں کے روپ اوڑھے، خون آشام رقص کرتیں، ہندی علم الاصنام میں کالی کا حوالہ یقیناً جبلی تشدد کے اس سیاق و سباق میں قابل فہم ہے۔ انسانی ذہنیات کا زیر زمین سفر اور آخر کار شاعری ڈرامہ اور داستانوں کے سروپ میں بیک یارڈ کی توسیع ایک ایسی پناہ گاہ کی جستجو ہے جس میں برف باری کا زمانہ گزارا جا سکے اور جب موسم بہار کے شگوفے نکل آئیں تو سنہری دھوپ میں نئی زندگی کے سہانے گیت جھکیں۔ لگتا ہے میں نے سیفٹی والو کے تصور کو کچھ زیادہ ہی رومانوی رنگ دے دیا ہے۔ براہ راست مراد یہ ہے کہ بہت یگوں بعد شاعری، ڈرامہ اور داستان کے وجود میں آنے کے بہت مدتوں بعد جب معروض اور موضوع کی نئی جدلیت رونما ہو رہی تھی، انشائیہ دلدلی جھیلوں کے کرب کی کوکھ سے کنول کے پھول کی طرح مسکرایا تھا۔

بیکن نے بیک یارڈ کی شادابی پر اس لئے اصرار کیا تھا کہ پیش منظر اژدھے کی ذہانت اور فاختہ کی معصومیت میں منقسم دو انتہاؤں میں بٹ چکا ہے، متصادم میلانات اور ممنوعات کا ایک نا تمام سلسلہ ہے۔ کائنات کالی اور سفید مچھلیوں۔ بھیڑ اور بھیڑیوں، موضوع اور معروض۔ پھر حساب، الجبرا، جیومیٹری اور منطق میں منقسم ہے نجانے کتنے خانے، حصے اور مفروضے بن چکے ہیں۔ بیکن نے اسی جبر سے لبریز تقسیم سے نجات کے لئے انشائیہ کو منتخب کیا تھا۔

اُردو انشائیہ بھی اس کڑی تقسیم کا ثمر ہے کہ اس کا بیک یارڈ پنجاب کے روحانی اور تخلیقی مؤثرات سے مرتب ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو انشائیہ غیر ملکی حوالوں اور سوالوں کے باوجود اپنی پہچان کے منطقے میں Essay پر منطبق نہیں ہوتا۔ فی الاصل اُردو انشائیہ کا بیک یارڈ چناب کی چند لہروں، راوی کے ریشمی کناروں، سرسوں کے کھیتوں پر مسکراتے چاند اور ہمالہ کی برف پوش چوٹیوں کا پیش منظر ہے جب کہ اس کا تقابل:

آدم بو آدم بو کرتی علم کی برہمنی تقسیم

ذات پات کے آندھی اور طوفان بن جانے والے سیاہ و سفید جن

اور موہنجو دارو عورت کی شکست، موت اور کالی، کے ویرانوں میں بھوک اور جنس اور درندگی کا چھلل پائیوں کے روپ اوڑھے خون آشام رقص۔!

یہ ہے وہ درونِ ذات کا Dark arena جس نے پنجاب (وادی سندھ) کی زیرزمیں فکری لہروں میں روحانی کرب، دردناک اجنبیت اور لامحدود دکھ کو سمویا ہے۔ اسی روحانی کرب، خوفناک تنہائی اور بے پناہ دکھ کو اوڑھے شہزادہ سدھارتھ جنگل کی مہیب خاموشی میں اترا اور برگد کے درخت کے نیچے اس نے روشنی اور نجات کا مرحلہ طے کیا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا تھا۔ وہی آدم بو آدم بو کرتی علم کی برہمنی تقسیم اور وہی آندھی اور طوفان بن جانے والے ذات پات کے سیاہ سفید جن۔ وارث شاہ اور میاں محمد نے اسی دہشت ناک تضاد کو دوسرے میڈیم میں پیش کیا۔ وزیر آغا کا فٹ پاتھ، اور حقہ پینا، اسی تناظر میں خارجی حسن اور داخلی دلدلی کرب کا لطیف اظہار ہیں۔

(3)

انشائیہ کا پیکر مونٹین نے اپنے بیک یارڈ کی معطر اور گلاب گوں مٹی سے تراشا تھا۔ اس میں اپنی روح پھونکی تھی۔ پھر جب اس پری پیکر نے غزالی آنکھیں کھولی تھیں تو بوڑھے مونٹین کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی تھی۔ بوڑھے مونٹین نے کہا تھا بہت اچھا ہے۔ یہ آناً فاناً اپنی گرفت میں لینے والی سچائی تھی۔ مسحور کن ذاتی سچائی۔ اس نے مذہبی رجعت پسندی اور عدم رواداری کو انسانیت نواز حوالے سے دیکھا تھا اور منظم سوچ کے ایک مخصوص نقطہ نظر کی رسی سے بندھے رہنے سے گریز ہی نہیں کیا تھا بلکہ بہت بڑی بغاوت کی تھی کہ اس نے اپنی سوچ کے بے ترتیب دھارے اور انسانی تضادات پر مبنی دلدلی خلاء کی دریافت کے لئے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ بنیادی طور پر انسانی عقل کی محدودیت کا حامی ہونے کے حوالے سے اس کی خواہش تھی کہ ہر انسان اپنی ذات کا عرفان حاصل کرے، خود کو دریافت کرے اور پہچان کے پر مسرت مقام پر فائز ہو۔ پر مسرت پہچان کے اس سنہری فریم میں مونٹین نے پوری انسانیت کا پورٹریٹ پیش کیا جس کے بنیادی رنگ بکھراؤ اور بے ترتیبی قرار پاتے ہیں۔ خود پسندی، بدمزاجی اور غرور پر اس لئے سخت تنقید کی۔ اس کے ہاں انسان کی عزت نفس فطرت کی عزت نفس کے اعلیٰ مقام کے مساوی ہے۔ اس طرح اس کے انشائیوں میں داخلی سکون غیر جذباتی فضا اور ذہن کی لامحدود آزادی کا حسین امتزاج نقاب کشا ہے۔

فکری منطقے میں مونٹین ڈیکارٹ کا پیش رو تھا جب کہ پاسکل ڈیکارٹ کا ہم قدم تھا۔

ڈیکارٹ نے اپنی سوچ سے حاصل شدہ تشخص کے حوالے سے ہی کائنات کے وجود سے آشنائی استوار کی تھی۔ پاسکل نے اس کے برعکس اپنے وجود کی آشنائی کے لئے نسبتاً طویل فاصلے کا سفر کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے دل کے دلائل کچھ ایسے ہیں کہ استدلال خود ان سے ناواقف ہے۔ وہ ماورائے عقل دائرہ معنی کی بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لاتعداد اشیاء عقل کی رسائی سے ماوراء سانس لیتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جب فطری اشیاء عقل کی حدود سے باہر ہیں تو مافوق الفطرت اشیاء کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ خارج میں پھیلی ہوئی کراں تا کراں کائنات اور پھر اول و آخر لامحدودیت میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی جگہ جس پر انسان کھڑا ہے پاسکل کے مکاشفے میں ہے۔ میرے لئے لامحدود خلاؤں کا خوف دہشت ناک ہے۔ اقدار کے دائرہ عمل کی تفہیم کے لئے عقل کی پاسبانی سے مکمل نجات لازمی ہے۔ حقائق کو معنی اس وقت ملتے ہیں جب ہم ان میں شمولیت کریں۔ ہمارے احساسات کام کر رہے ہوں۔ مونٹین کا عقیدہ بھی داخلی شراکت اور احساسات کی پیش رفت کا آئینہ دار ہے۔ تاہم پاسکل داخلی شراکت اور حسی پیش رفت پر مبنی صداقت کے نظریہ کو تکمیل نہ دے سکا۔

کرکیگار کے لئے مقسوم تھا کہ اس صداقت کو وا کرے جس کے سہارے ہم زندگی کرتے ہیں۔ کرکیگار نے لکھا چونکہ زندگی کی حرارت انتخاب میں ہے اس لئے تجربی عمل انتخابی ہے۔ نیکی اور سچائی معروضی حقائق نہیں داخلی تصرفات ہیں، وجدان کے مرحلے ہیں۔ کرکیگار نے Existentialism کی ترکیب ایجاد کی اور جذبی کیفیات کی روشنی میں انسانی وجود کے معنی دریافت کئے۔ انسان کی بے مثل انفرادیت کا نعرہ بلند کیا روایتی نظریہ کے برعکس یہ وہ ذاتی اور شخصی تجربہ ہے جس کی پشت پر جیٹ لینڈ کی ٹھٹھرتی تنہائی۔ گہرے مقبروں کی طرح شکوک اور سیاہ راتوں کی مانند مایوسی بکھری پڑی ہے۔ اس تناظر میں یہ بات یقیناً قابل فہم ہے کہ کوپن ہیگن میں خوبصورت لڑکیوں کی معیت میں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں کی عشرت انگیز فضا میں سورن کرکیگار اس قدر تنہا تھا کہ خودکشی کر لینا چاہتا تھا۔ پھر اس کی زندگی میں ریجینا اولسن بہار بن کر آئی۔ مگر وہ بھی اس کی ذات کے خلاء افسردگی، تنہائی، مایوسی، اکتاہٹ، اضطراب، حزن، اور لغویت کا مداوا نہ کر سکی۔ پھر دونوں محبت کرنے والوں کی زندگی کرب اور عذاب سے لبریز لمحوں کا مسکن بن گئی۔ سوالوں کا خوفناک دہانہ کھل گیا

جس کے بھنور میں اس کی منگنی کے نشاط انگیز لمحے دم توڑ گئے تھے۔

ا۔ کیا دو انسان اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مکمل اکائی کی حیثیت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے زندگی بھر کے لئے کمٹ منٹ کر سکتے ہیں؟

۲۔ کیا شادی یک طرفہ قبضہ نہیں جس میں انسانی انفرادیت جملہ مقبوضہ اشیاء میں ڈھل جاتی ہے۔ پوزیس Possess ہو جاتی ہے۔

کرکیگار جب Either /or کے اس بھنور سے نکلا تھا تو یہ اعتقاد بھی اس کے ساتھ تھا کہ تنہائی ہی صرف انسان کے مربوط ہونے کی ضمانت ہے۔ تنہائی اپنی ذات میں سنجیدہ کمٹ منٹ ہے۔ یہ آزادی میں انتخاب اور تسلسل ہے۔ صداقت موضوعی اور ذاتی ہے۔ معروضی اور منظم نہیں۔ واحد حاضر (Other self) کا رشتہ کائنات کی پوزیس ہونے والی اشیاء سے نہیں، سسٹم پہلے سے قائم شدہ معروضوں کا تالاب ہے جس میں حقائق ہمیشہ کے لئے رک چکے ہیں۔ لہٰذا صداقت کی پہلی صورت چلتے رہنے اور بہے جانے کا عمل ہے۔ جب کہ دوسری صورت فکر و شعور کا عکس ہے جو انسان کے زندہ رہنے تک دائم ہے۔

دوستوو سکی کی Under Ground کا آدمی تمام عمر سسٹم کے خلاف احتجاج کرتا رہتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی کے معنی دریافت کرنے کا حق ہے۔ عقل پورے انسان کو پیش نہیں کرتی۔ پورا انسان تو عقل اور جذبات سے مل کر بنتا ہے۔ تمام یوٹوپیاز خطرناک الیوژن ہیں۔ ایملی زولا Emlile Zola کے نزدیک شر ایک معاشرتی عنصر ہے۔ انسانی آزادی دہشتناک ہے۔ کافکا کے مطابق انسان اور جو کچھ اس کے اندر وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے یا جس سے اس کا واسطہ رہتا ہے یہی صرف ایک دروازہ ہے جو کائنات کی طرف کھلتا ہے۔ کافکا نے منظم سوچ اور سسٹم کی دیوار کہ انسان کی انفرادیت اور وجود کے اردگرد چنی گئی ہے پر بہت بڑا شب خون مارا تھا۔ پاسکل سے دوستوو سکی اور کرکیگار سے کافکا تک انسان کے اردگرد چنی گئی دیواروں کے خلاف شب خون مارنے کا سلسلہ ہے۔

اُردو انشائیہ اسی جذباتی یافت، انفرادی تصدیق، عزتِ نفس، انکشاف ذات اور مزید برآں آزادی میں انتخاب و تسلسل (on- Going Process) سے متشکل ہوا ہے۔ یوں اُردو انشائیہ اجتماعی نظام زندگی کی زنگ آلود صورت حال کی بجائے انفرادی تروتازگی اور داخلی

احساسات کی پیش رفت کا دعوٰی دار ہے۔ انشائیہ نگار اپنے لئے اپنا سورج خود بالائے بام لاتا ہے۔ اقدار کا ذاتی سلسلہ متعین کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس پس منظر میں انشائیہ کے بارے میں خیال کی آوارہ خرامی کا نظریہ ناقابل فہم ہے۔ انشائیہ تو عام اور سادہ تجربات کو داخلی مطلعے پر انتہائی سنجیدہ کشفِ ذات کے مراحل سے گزار کر فن کارانہ مہارت، دلکش انداز اور حسی شراکت پر مبنی پیرایۂ اظہار کا نام ہے۔ جس میں تصویر اور تصور کی اڑان اور حیران کن بلا تکلفی اہم صفات ہیں۔

(4)

کہتے ہیں نطشے اپنا سوچ آپ بالائے بام لایا تھا۔

ہیگل کے ہاں کائنات کے نظام کا عظیم نقشہ جو برسر نمود ہوا اس میں انفرادی وجود واعمال صحرا میں ریت کے ذرے کے مساوی طے پائے دنیا سٹیج ہے۔ تاریخ ڈرامہ، انسان ایکٹر اور روح کی تکمیل ذات کا نقطۂ آخر۔ جدلیاتی تصورات کا یہ نظام اس قدر ہمہ اوستی نوعیت کا حامل ہے کہ ہر سوال کا جواب اور ہر مسئلہ کا حل فراہم کرنے کا دعوٰی دار ہے۔ نطشے نے کائنات کے بارے میں ہر قسم کے نظام اور ہمہ اوستی تعبیر کو عام ٹھہرایا کہ ان نظاموں میں دورانِ سفر انسان کہیں اندھے فاصلوں کے پھیر میں گم ہو جاتا ہے۔ ہر نظام سکھ چین اور بہتر مستقبل کے خواب دیتا ہے جس کے لئے اداریاتی تبدیلیاں ابتدا ہوتی ہیں۔ جاگیردارانہ بادشاہتوں اور چرچ کے زوال کے آخر کار آزاد معیشت Laissez faire پر مبنی لبرل ازم ہماری کائنات کی یوٹوپیائی تعبیر کا علمبردار ہوا۔ نیشنل ازم نے بھی بہتر مستقبل کے سہانے خواب فراہم کئے۔ انسان کے معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے کے لئے مارکس نے ایک وسیع پیداواری نظام کو مداو اقرار دیا۔ ساتھ ساتھ سائنسی کونیات Scientific Kosmologies نے دنیا کی مشینی اور حیاتیاتی تفسیر کے حوالے سے نوعِ انسان، ارتقاء اور قوانینِ فطرت کو بنیاد بنایا۔ تاہم طرفہ تماشہ یہ تھا کہ انیسویں صدی کے نظام کار یہ ماننے سے قاصر تھے کہ انسانی آزادی ومنزلت، قانونی فرامین، اداروں، نظریات کے ساتھ وابستگی یہ مہربان کائناتی عمل کا نتیجہ نہیں۔ آزادی تو ایک چیلنج ہے، آسودگی یا حق ہرگز نہیں۔ یہی سبب کہ نطشے کے نزدیک تمام نظام محض غلامانہ ذہنیت کے پیش کار ہیں۔ ذہنی بدکاری کے بغلی

دروازے ہیں۔

اس نے Lou salome سے ٹوٹ کر عشق کیا مگر ناکامی اور مایوسی اس کا مقدر ہوئی اور پھر وہ خاموشی اور تنہائی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اٹلی ہوتا ہوا کوہ ایلپس میں وقت اور آدمی سے چھ ہزار فٹ دور Sils Maria کی تنہائیوں میں پناہ گزیں ہوا۔ ان تنہا اور برفیلی چوٹیوں میں نطشے پر اس عظیم کتاب یوں زرتشت نے کہا، اُتری وہ لکھتا ہے۔

میں وہاں منتظر تھا کسی بھی چیز کے انتظار میں نہیں
خیر وشر سے دور

اب دھوپ ہے، سایہ ہے، صرف یہی ہے،
دن، جھیل، دوپہر، وقت بے کراں
پھر مرے دوست! ایک کے دو بن گئے
اور زرتشت میرے پاس سے گزرا!

اس کی روح تمام حدوں سے باہر نکل گئی۔ اُسے نیا استاد اور مرشد مل گیا تھا۔ ایک دیوتا۔ سپرمین، ایک نیا مذہب، ابدی نجات، اُس نے گانا شروع کر دیا۔ میں گا نا گا سکتا ہوں اور گاؤں گا اگرچہ میں تنہا ہوں، ایک خالی مکان میں بند لیکن مجھے ضرور گانا چاہیئے اپنے آپ کے لئے اپنے کانوں میں۔

اے عظیم ستارے! تیری خوشیاں کیا ہوں گی؟ کیا یہ خوشیاں ان کے لئے نہیں ہیں جن کے لئے تم چمکتے ہو۔

افسوس میں اپنی دانش سے نالاں ہوں اُس شہد کی مکھی کی طرح جس نے بہت زیادہ شہد اکٹھا کر لیا ہو۔ مجھے وہ ہاتھ چاہیئے جو شہد تک پہنچے اور پھر سلس ماریا کی ہولناک تنہائیوں میں اس طرح زرتشت نے کہا، پایۂ تکمیل تک پہنچی۔

زرتشت تیس سال کی عمر میں غور وفکر کی پہاڑی سے اترتا ہے۔ لوگوں کے درمیان تبلیغ کرتا ہے۔ تاہم ہجوم اس کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے بازی گر کا تماشا دیکھنے لگتا ہے۔ پھر رسے پر چلنے والا گر کر مر جاتا ہے۔ زرتشت اسے کندھے پر اٹھا کر چل دیتا ہے اور کہتا ہے بازی گر نے خطرے کو زندگی کا اصول بنایا اس لئے میں اسے اپنے ہاتھوں سے دفناؤں گا۔

زرتشت نے دعویٰ کیا کہ پُرخطر زندگی قابل فخر ہے۔ برتر شر برتر خیر کا حصہ ہے۔ اسے تخلیقی اچھائی کا مقام حاصل ہے۔ گذشتہ ورفتہ اقدار کو ٹوٹ کر بکھر جانا چاہئے۔ ہماری صداقتوں اور سچائیوں پر جس برق تپاں نے ٹوٹ پڑنا ہے ٹوٹ پڑے۔ بہت سے نئے امکانات ابھی پھول بنتے ہیں۔ اعلیٰ ترین بیج بونے کا یہی وقت ہے۔ برتر انسان کی خلافیات کے لئے راستہ ہموار و استوار کرنا چاہئے۔ طاقت، ذہانت اور فخر دانا سے برتر انسان تشکیل پاتا ہے۔ لیکن طاقت، ذہانت اور فخر دانا میں ایک توازن مرتب ہونا لازی ہے۔ جو آدمی ہجوم سے بلند ہونے کی خواہش کرے اس پر لازم ہے کہ تن آسانی چھوڑ دے اور کسی مقصد کو کہ جس کے لئے وہ ہر چیز کرنے کے لئے تیار ہو جائے اپنا لے۔ نطشے فرانسیسی کلچر کے سوا یورپ کے سارے کلچر کو محض غلط فہمی قرار دیتا ہے جب کہ انشائیہ نگار مونٹین اس کے پسندیدہ لوگوں میں سے ہے۔ سلس ماریا کی برفیلی چاندراتوں میں فلسفہ شاعری کے روپ میں زمین پر اُترا۔ زرتشت مشرقی دانش کی علامت کے طور پر طلوع ہوا۔ نطشے کے چاروں اور روشنی ہی روشنی تھی۔ وہ خیر و شر سے ماورئی (Beyond Good & Evil) ہو چکا تھا۔

(5)

مشرق طلوع آفتاب کی سرزمین ہے۔ شیخ شہاب الدین سہروردی مقتول کے قول کے مطابق اشراق حقیقت وصداقت کا نام مشرق ہے۔ یہیں تہذیب کی تجلی اُما (روشنی) نے آنکھ کھولی تھی جس کے دائرہ نور میں دجلہ وفرات کی دلدلیں۔ سمیری ولمون کی کہانی، بابل ونینوا کے دیوتاؤں کے فیصلے۔ حمورابی کے قوانین، کوہ زیتون کے صحیفے، موسیٰ کے دس احکامات پر محیط طور سینا، بہار آفریں آئسس کا باوفا تھیس مردوں کی کتاب اور فرعونوں کے اہرام عیسیٰ کی تنہائیوں کا صحرائے گلیل، دور غلامی کے اسرئیلی نبیوں کا موعودہ سائرس اعظم اور زرتشت کی وسعتیں جلے ہوئے خشک صحرائی پہاڑوں کے درمیان شہر امن بلکہ، مقدس جھیل مان سرور کے پوتر پانیوں کا سلسلہ سندھ اور عظیم یوتا شوکی جائے رہائش کیلاش پربت کے قدموں سے بہتے ہوئے گنگا کے کناروں پر تحریر کئے گئے پراسرار وید، برف پوش ہمالہ کی ترائیوں میں بدھ گیا کا جنگل، تبت سے پرے سنہرے پھول کا راز، لاؤزے تاؤ کی کتاب اور زین نظمیں، سورج کا سایہ قائم رہتا ہے۔

روح کا ماڈل زمین ہے

زمیں کا ماڈل آسمان ہے

اور آسمان کا ماڈل تاؤ ہے

اور تاؤ کا ماڈل بہاؤ ہے

مشرقی دانش میں Self actuality اور Self realization صدیوں سے تہذیب کا مرکزی خیال رہا ہے۔ اسے ہم نروان کا راستہ کہہ سکتے ہیں۔ مشرقی طریقوں میں نروان زندگی سے پرے یا موت کے بعد حقیقت نہیں بلکہ یہی دنیا صداقت اور طہارت کا مقام ہے۔ آزادی اور نجات سے مراد یہ نہیں کہ روح جسم کی قید و حدود سے آزاد ہو جائے بلکہ آزادی اور نجات درحقیقت روح اور جسم کی دنیاوی تقسیم سے نجات اور بازیافت ہے۔ مشرقی دانش میں عقل اور کلچر کی حیثیت عشق کے بالمقابل نہیں۔ عقل اور کلچر تو عشق عملی توسیع ہیں نتیجہ عقل اور کلچر جبر کی بجائے اظہار کا سبب بنتے ہیں۔

صنعتی انقلاب اور نئی دنیا کی دریافت یورپی انسانیات کا ایک پُرشکوہ باب ہے۔ یورپی انسان نے اپنے سبق کا آغاز روح اور جسم کی تقسیم سے کیا تھا۔ صنعتی انقلاب اور نئی دنیا کی تلاش کے بعد یورپی تہذیب کا جو نیا نقشہ پیش ہوا اس میں حقیقت کا جسمی اور مادی پہلو چھا جانے کی حد تک نمایاں ہوتا چلا گیا جب کہ روح ارسطا طالیسی نفسیات کا حصہ بن کر رہ گئی۔ جسمی متعلقات کی گردن توڑ دوڑ میں اور ثقافتی و تکنیکی برتری کے دق میں انسان کا داخلی منظر تیز رفتار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا چلا گیا، معاشی اخلاقیات نے عقل اور کلچر کو طلب و رسد کی بے رحم مارکیٹ میں فروخت کیا۔ روحانی خود کفالت کی جگہ معاشی خود کفالت نے لے لی۔ یہ جسم کہ عیسیٰ کا مقام تھا۔ بازار حصص کے اتار چڑھاؤ پر قربان ہوا۔ انسان ہفتے کے بے کار اور لغو دنوں میں تقسیم ہو گیا لایعنی حصوں میں منقسم Stereotyped معاشرتی مشروطیت میں گرفتار، اس قدر Outer Directed اور معاشرے میں بکھرا ہوا کہ اکٹھا کیا جائے تو اکٹھا نہ ہو سکے کچھ یوں اجنبی کہ پہچانا نہ جا سکے کچھ ایسے کہ دیکھا نہ جا سکے۔

سائنس، فلسفہ، مذہب اور اساطیر وفنون لطیفہ سب جبر کے پیش کار ہیں کہ یہ سب وہ Snapshots ہیں جو زندگی کے لمحوں کی حرکت اور جذبہ کو ایک ٹھہری ہوئی تصویر میں پیش

کرتے ہیں۔ نظام کاروں نے انسانی مسائل کے سادہ حل کا امکان جس قدر آسان سمجھ لیا تھا
فی الحقیقت ایسا نہیں تھا، معاشرتی آسودہ حالی اور معاشی خود کفالت ہی صرف انسان کے
دکھوں کا مداوا نہیں۔ یوں چیزیں اور انسان جب اس قدر بیرون جہت ہو جائے تو اشیاء اور
انسان ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ اسی بنیادی تضاد کا خوفناک ردِعمل تھا
جس کے آخر کار انسان ایٹمی تباہی اور مکمل معدومیت کے دہانے پر آ کھڑا ہوا۔ عقل اور کلچر
محض سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔ اوسوالڈ شپنگلر نے 1919ء میں The decline of the
west کی صورت میں پوری عقل اور کلچر کا نوحہ لکھا۔ نطشے کے مکاشفوں میں اس زوال تباہی
اور دہشت ناک انسانی بے بسی اور بے حرمتی کی آہٹیں بہت پہلے دست دے چکی تھیں۔ لیکن
یورپی انسان نے اس دستک پر اپنے دل کے دروازے نہ کھولنے تھے نہ کھولے۔ فرانسیسی،
مونٹین کی دستک اس سلسلے میں سب سے قدیم ہے۔

اس پھیلے ہوئے تناظر میں شاداب بیک یارڈ کا استعارہ یقیناً معنی خیز اور زرخیز ہے کہ
سائنسی معروضیت اور کرداریت کے صحرا کے بڑھاؤ اور یلغار کو روکنے کے لئے ذات کے
نخلستانوں کی آبیاری امرِ لازم ہے۔ افسانہ و ناول میں دوستوفسکی اور کافکا نے شاعری میں رِلکے
اور انامیونو نے زندگی سے لبریز سانسوں کو بطور موضوع منتخب کیا۔ مصوری میں تاثریت،
اظہاریت، کیوب ازم اور سریل ازم زندگی کی عمیق گہرائیوں میں دریچے بن کر کھلے Cezanne
اور Gauguine کی تاثریت اور Von gogh نے Munch اور Kokoschka کے ساتھ ساتھ
اظہاریت کے زیرِ عنوان ذات کی وقوع پذیری کے مقصد کی طرف مراجعت کی۔

پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران چور چور فرانس سے چلی ہوئی دستک کی یہ
بازگشت یورپ میں ہر انسان کے دل پر دستک بن کر گونجی وجودی، ہپی، اینگری ینگ مین
اور بِیٹنک اسی دستک کے نقوش ہیں۔ ان نقوش کو ایشیائی دانش کی یورپ پر ایک بار پھر فتح کی
دستاویز کے مختلف مراحل بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ردِعمل بازگشت کے برعکس انشائیہ نے
مشرقی دانش کے طریق کار اور مقصد و مزاج کی رسی کو ہمیشہ تھامے رکھا۔ اس مقام پر میں
دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ انشائیہ بنیادی طور پر مشرقی دانش کی یورپی توسیع ہے۔
یہی سبب کہ انشائیہ میں عقل اور کلچر جبر کی نمائندگی نہیں کرتے اس لئے کہ عقل اور کلچر جب

جبر کی تفسیر بنتے ہیں تو نتیجہ سائنس دان کی خشکی، واعظ کی بلندی، بھاٹ کی پستی اور اخبار
نویس کی رجعی طنز نگاری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ انشائیہ تو عقل اور کلچر کو عشق کے آئینے
میں بالمقابل پیش کرتا ہے۔ لمحے Snap shots کے منجمد دائرے سے نکل کر سانس لیتے،
لو دیتے باوفا لینڈ سکیپ میں ڈھل جاتے ہیں اور نمایاں خصوصیات لطافت فکر، امن و
مساوات، عجز و ارتفاع، نگاہ بلند اور سخن دلنواز نئے موسموں کا اعلان ہیں۔

مقصد یہ کہ انشائیہ آزادی کی فطری ترتیب کا عکس نما ہے۔ اس میں عقلی استدلال اور
ثقافتی ضوابط کہ نثری مظاہر کا خاصہ ہیں مکمل معدوم ہونے کی بجائے ثانوی حیثیت پر آجاتے
ہیں۔ انشائیہ نگار کا رویہ عقلی ہونے کی بجائے جمالیاتی نہج اختیار کرتا ہے۔ جبکہ جمالیاتی رویہ
کی نہج عقلی رویہ کے برعکس حیاتی عمل کو متعارف کراتی ہے جس کے آخر کار تہذیب کے
امکانات وسیع ہوتے ہیں۔ مجبوری کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان جسمانی اور اخلاقی طور پر
آزادی کے دروازے سے گزرتا ہے۔ عقل کے ضوابط اخلاقی مجبوری سے الگ ہو کر حواس
اور چاہتوں کے مفاد میں پھر سے وسیع ہوتے ہیں، مربوط ہوتے ہیں۔ مشتاق قمر نے لکھا
ہے، انشائیہ انسان کی مخفی تمناؤں کی دریافت ہے، اس حوالے سے اُردو ادب میں انشائیہ کی
تحریک ایک بہت بڑی پیش رفت ہے۔ جس کے جلو میں ہمارے اپنے لمحوں، زمینوں،
تہذیبوں کی خبر ملتی ہے۔

(6)

میں نے کچھ دیر قبل کہا ہے کہ انشائیہ مشرقی دانش کی توسیع ہے۔ ظاہر ہے مشرقی دانش
سے مراد کسی منجمد تصور کی روداد نہیں بلکہ نگاہ کی اس جہت کا نام ہے جس میں عقل اور کلچر
اداریاتی تشدد کی بجائے آزادانہ اظہارِ عشق کی کہانی ہے، بہتی ہوئی ندیا کا مترنم بہاؤ ہے۔
جنوبی ہند کے لنگ راج مندروں میں داسیوں کا رقص ہے، موسم بہار کی گلاب گوں
دوپہروں میں بیلے بیلے گونجے۔ ہیر وارث شاہ کے بول ہیں۔ کسی بدھ بھکشو کی گہری اور
پرسکون چپ ہے۔ ذین (Zen) سوچ میں نروان کے لئے کوئی بھی روپ اپنایا جاسکتا ہے۔
کوئی بھی کام کیا جاسکتا ہے۔ برتن بنا کر، باغوں کی نوک پلک نکھار کر، گلدستے ترتیب دے
کر، مکان تعمیر کر کے، چائے پیش کرنے کے انداز سے حتیٰ کہ تلوار کی تیز دھار کے استعمال

سے بھی نروان حاصل کر سکتے ہیں کہ دراصل یہ حسن عشق کی معاملہ بندی ہے۔ لیوس ممفورڈ (Lewis Mumford) نے حسن کی توضیح اس طرح کی۔ حسن نے محض ڈارون کے نظریہ اختلاط وتخم ریزی تک ہی کام نہیں کیا بلکہ ارتقا کی تگ ودو میں حسن نے دوسرے عوامل کے مساوی نتائج فراہم کئے ہیں۔ اس لئے فطرت کو متھ (Myth) میں سوچنا کہ جس طرح شاعر استعارہ اور Rythm میں سوچتا ہے، انسان کے لئے جائز ہے۔ اسے ہم ایک ایسا فطری رو ہم اور تخلیقی استعارہ کہہ سکتے ہیں جس کے دامن میں کالے گورے اونچے نیچے، نسل اور مذہب کی تفریق اور تقسیم لایعنی ہے، گناہ وثواب کے سب فاصلے معدوم ہو جاتے ہیں۔

ذین ماسٹر (Zen Master) سنگ ساں Seng-T'sam کے لفظ بولتے ہیں۔

مکمل راستہ مشکل کے بغیر ہے
اس لئے کہ یہ انتخاب وقبول سے اجتناب کرتا ہے
اگر تم سادہ حقیقت وصداقت پانا چاہتے ہو
تو درست اور نادرست سے لاتعلق ہو جاؤ
درست اور نادرست کا تصادم
بیمار ذہن کا مرحلہ ہے۔

یوں درست اور نادرست، خیر وشر کی حتمی تقسیم روحانی تشدد، تہذیبی خودلذتی اور معاشی مثالیت پسندی ہے جب سادہ صداقت کا بہاؤ سکون اور مسرت کا پیام بر ہے فی نفسہٖ حقیقت یہ ہے کہ اضافیت سے لبریز کائنات میں تمام فیصلے محض کھیل ہیں، سائنس آرٹ اور اخلاقیات کو تخلیقی بہاؤ کے ایما پر چھوڑنا اظہار اور آزادی کو تقویت فراہم کرتا ہے۔ کمار سوامی کا لہجہ کس قدر روشن ہے! لکھتا ہے بے ساختگی Spontaniety جستجو کی نفی کا راستہ ہے۔ ہم عمل کریں۔ عمل کے بغیر، سوچیں سوچ کے بغیر، محبت کریں محبت کے بغیر۔

جستجو کی نفی لاشعوری کردار کو قبول کرنے کی رسم ہے۔ جسے جمالیاتی کردار کی پیش رفت بھی کہا جاسکتا ہے۔ جس پرشانِ استغفار، وسعتِ نظر اور بے نیازی سے لبالب اطمینان مختلف مقامات ہیں، اُردو انشائیہ انہی مقامات کی سیاحت سے طے پاتا ہے جب کہ اس کا مطمحِ نظر ایسے سیاق وسباق کی دریافت ہے۔ جس میں انسان سادہ صداقت حزین ہو کر

درست، نادرست، خیر وشر کے اخلاق یا مذہبی قیود سے بالاتر ہو جاتا ہے اور تمام معاشرتی مکر وہات بشمول طنز ومزاح کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ انسان خوشبو کی طرح ہلکا پھلکا اور لطیف ہو جاتا ہے۔

وزیر آغا کے ہاں انشائیہ خوشبو کی طرح معاشرتی میکانکیت، علمی علیت اور شہری ضابطہ بندی کی قید سے آزاد شخصی انفرادیت کا علمبردار ہونے کے باوصف وجودی صورتِ حال کا پیش کار ہے۔

”لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے اندر یہ احساس جاگا کہ میں نے اپنے شانوں پر معاشرے کا کتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا تھا اور میری شخصیت کس طرح اس بوجھ تلے پس کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی لئے حساس اذہان خود کو پہچاننے کے لئے ہمیشہ شہر کو چھوڑ کر غاروں، صحراؤں اور پہاڑوں کی طرف بھاگتے رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ شہر اور اس کی مخلوق فرد کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ معاشرہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھیڑ اس کے گلے سے الگ ہو کر بھٹک جائے۔ اسی لئے وہ اخلاقی ضوابط، سماجی قوانین، روایت اور اصول اور قاعدہ اور ڈسپلن کی ڈور سے اسے اس طور جکڑ لیتا ہے کہ وہ پھر کبھی اس جال سے باہر نہیں جاسکتا۔ مگر اس سارے حزم واحتیاط کے باوجود وہ ان لوگوں کو نہیں روک سکا جو اسے خیر باد کہہ کر بار بار جزیروں اور پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف جاتے رہے ہیں۔“ (کتابوں کی معیت میں)

غلام جیلانی اصغر کا ”کچھ جھوٹ کی حمایت میں“، انشائیہ کی مخصوص جہت کا آئینہ دار ہے۔ چند سطور دیکھئے۔

”سچ اور جھوٹ میں یہی فرق ہے۔ سچ حقیقت کے ایک تنہا رخ کو اپنی گرفت میں لے کر حقیقت کے دوسرے متنوع پہلوؤں سے اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے لیکن جھوٹ اسی حقیقت کو پوری اکائی تسلیم کر کے اس کی تمام جہتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس طرز فکر کا یہ فائدہ ہوتا

> ہے کہ آدمی تنگ نظری یا کورچشمی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ وہ حقیقت کے تمام پہلوؤں پر حکیمانہ نظر رکھتا ہے۔ یوں بھی حقیقت اس سیّال مادہ کی طرح ہے جو ہمہ وقت اضطراب میں رہتا ہے۔ ابھی ایک بات صحیح ہے اور دوسرے ہی لمحے وہی بات غلط۔''

اس قسم کی استعاراتی فضا، فطری بہاؤ اور تصویر کے دوسرے رخ کی نقاب کشائی صرف انشائیہ کا ہی خاصہ ہے کہ اس دائرہ اثر میں کائنات اضافیت سے لبریز متصور ہے اس لئے متخالفات میں سے انتخاب محض نا قابل فراق کا فراق ہے۔ استعارہ کچھ یوں بنتا ہے کہ سطح پر عدم اور وجود اس طرح یک جا پڑے ہیں کہ یہ انتخاب کہ صورت کونسی ہے اور پس منظر کسے کہا جائے۔ ایک یک طرفہ فیصلہ ہوگا۔ یوں فرض کرنا کہ عدم اور وجود متفرق اور مختلف حقائق ہیں ایک نا قابل قبول مفروضہ ہے۔ جیلانی اصغر کے انشائیہ ''بچہ اور باپ'' میں عدم ایک مثبت اور خوبصورت نقطۂ نگاہ بن کر طلوع ہوتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ادب اور مذہب کا اس دنیا کا ناموجود سے گہرا رشتہ ہے۔ اگر زندگی کے دامن میں دو چار مہلک جنگوں، ایٹمی ہتھیاروں اور بین الاقوامی کھنچی کے سوا کیا رہ جاتا ہے؟ نیست دراصل ہمارا یوٹوپیا ہے، جس کے بغیر کوئی نقشہ مکمل نہیں ہوسکتا۔

غلام جیلانی اصغر کا ''گالی دینا''، وزیر آغا کا ''حقہ پینا''، مشتاق قمر کا ''کتب خانہ''، اور انور سدید کا ''اونگھنا''، مشرقی دانش کے مخصوص مزاج کے مختلف پرت ہیں۔ جمیل آذر کا انشائیہ ''مچھلی کا شکار''، ہست و نیست، موجود اور ناموجود کے باہمی اشتراک کی معنی خیز روداد ہے۔ راحت بھٹی کا سفید بال اسی جہت اور لینڈ اسکیپ کا انشائیہ ہے۔

(7)

سوچ کی اس نہج اور مقام پر ممکن ہے آپ کی ذہنی فضا میں بہت سے نامعلوم سوال اُن تعقلات کے دامن میں سرسرانے لگیں جن کی منفی قدر و قیمت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ان پہلے سے موجود تعصبات کے سائے میں ہوسکتا ہے کہ آپ فوری تعمیم Hasty Generalization کے مغالطے کا شکار ہو کر اسے بھی ادب کہہ دیں اور قطعیت پسندی کے شوق میں آپ کے ذہن کے سامنے والے حصے میں کلیت پسندی، لذتیت اور ایپکوزین

مسرت اندوزی ایسے کلمات آپ کی ذہنی مجبوری بن جائیں۔ یقین مانیے کہ ایسی کوئی بات نہیں، کسی تعصب، مجبوری، تقسیم قطبین اور قطعیت پسندی کی کوئی گنجائش نہیں۔ پھر یہ کہ انشائیہ کسی ایسے طریق کار پر کاربند نہیں جس میں قاری سے نفرت کے نتیجے میں افہام و تفہیم کا محل نہ ہو اور نہ ہی تجریدی ایذا پسندی اور کلیت اس کے پس پردہ کارفرما ہے مثالیں تو آپ نے دیکھ لی ہیں۔ تیسرے یہ کہ انشائیہ کے ذیل میں استعمال ہونے والے مسرت و بہجت کے الفاظ سے مراد ہرگز خود پرستی پرمبنی ہر چہ بادا باد کے نتیجہ میں حاصل شدہ مسرت نہیں بلکہ مسرت و بہجت کا وہ تصور مقصود ہے جو حقیقت کے دونوں پہلوؤں سے آشنائی۔ زندگی کے پانچویں عنصر امید کی دریافت، تعصبات و تعمیمات سے بے نیازی، حقائق و مسائل پرشان استغنا سے بے ساختہ نظر، ذاتی اغراض و مقاصد کے بدتر اور برتر عوامل سے لاتعلقی اور دلیل و جواز و ثبوت کے جھمیلوں کو صرف نظر کرنے کے آخر کار صبح صادق کی طرح ذات کے در و دیوار پر اُترتی ہے جس کے جلو میں پھولوں کی خوشبو اور چڑیوں کے ترانے قافلہ در قافلہ چلے آتے ہیں۔ زندگی تو ایک کھیل ہے۔ بے ساختہ بہاؤ ہے۔

اب جب کہ آپ اپنے شبہات کو معروضی حوالے سے اور تعصبات کو صحت فکر کے ناطے سے دیکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کی توجہ پھر لورین آئزلے کی کتاب کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ اس کے باب ''پرندوں کا فیصلہ'' کو زمین کے لمبے سفر میں انسانی صورت حال کا تمثیلی استعارہ سمجھا جاسکتا ہے۔ پرندوں کے ایک فیصلہ کا اختصار کچھ یوں ہے۔

> ''ایک دفعہ میں (لورین آئزلے) پہاڑی جنگل میں ایک درخت کے ٹھنٹھ سے ٹیک لگا کر گہری نیند سو گیا تھا لیکن دھوپ کی تپش اور درختوں کی سرسراہٹ کی وجہ سے جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ دفعتاً جنگل شور و غل سے گونج اٹھا۔ سامنے درخت پر ایک پہاڑی کوا اپنی سیاہ چونچ میں بالکل سرخ رنگ کی بوٹی سی دبائے بیٹھا تھا اور بچے کے والدین کوے کے گرد اگرد ملتجیانہ انداز میں منڈلا رہے تھے۔ کوا بچے کو ننھی بوٹیوں میں تقسیم کرکے ہڑپ کر رہا تھا۔ اس دوران میں جنگل کے ایک ایک گوشے سے شکوہ و شکایت کی دبی دبی آواز

اٹھنے لگی۔ اس راستے پر کوئی نصف درجن انواع واقسام کے لاتعداد پرندے پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے کسی پرندے میں پہاڑی کوا پر حملہ کرنے کی جرأت نہ تھی لیکن ان کی چیخیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ ان کا غم مشترک ہے۔ ہر پرندہ قاتل کے سر پر سے یوں گزر جاتا ہے جیسے اس پر لعنت بھیج رہا ہوں۔ اور وہ پہاڑی کوا موت کا پرندہ بڑے اطمینان سے بچے کی بوٹیاں کھا رہا تھا۔

آخر کار آہ و زاری ختم ہوگئی۔ بس عین اس وقت میں نے پرندوں کا فیصلہ سنا اور انہیں فیصلہ کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ موت کے خلاف زندگی کا فیصلہ تھا۔ وہاں اس ماتمی فضا میں ایک اور پرندے کے دل میں کیا آئی کہ ایک گیت کی سُر الاپتا ہوا ایک درخت سے اڑ کر دوسرے درخت پر چلا گیا۔ ایک اور پرندے نے بڑے دکھ کے ساتھ گیت کے یہ سُر اٹھائے۔ پھر تیسرے پرندے نے پھر چوتھے پرندے، گیت تمام پرندوں کے دل سے یوں گزر گیا تھا جیسے کوئی کسی خوفناک بدی کا پرانا احساس دور کر رہا ہو۔ تمام پرندوں میں جرأت پیدا ہوئی تو انہوں نے مل جل کر خوشی کا راگ گانا شروع کر دیا۔ وہ زمزمہ سنج تھے کہ زندگی پر لطف ہے۔ دھوپ خوشگوار ہے۔ موت کا پرندہ ابھی تک ان کے سر پر بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ زندگی کا گیت گا رہے تھے کیونکہ وہ زندگی کے مغنی تھے، موت کے نہیں۔"

دھوپ خوشگوار ہے، زندگی پر لطف ہے۔ اس پورٹریٹ میں موجود جنگل کی ہر شاخ سے امید کے شگوفے جھانکتے ہیں، محبت کے جگنو جھلملاتے ہیں۔ ہم آہنگی اور مفاہمت کے رنگ بکھرتے ہیں۔ محولہ تمثیلی استعارہ انشائیہ کے باطنی منظر کی خبر دیتا ہے کہ فی الحقیقت اُردو ادب میں انشائیہ گھاس کی سرسبز اور ہوا میں جھومتی پتیوں، کشادہ رنگوں، خوشگوار دھوپ اور نئے موسموں کا اعلامیہ ہے، مشرقی دانش کی توسیع ہے۔

□□□

جمیل آذر

انشائیہ زندگی سے مربوط ہے

یوں تو تمام اصناف ادب ڈرامہ، ناول، شاعری اور افسانہ زندگی ہی سے مواد اخذ کرتے ہیں اور زندگی سے اس طرح مربوط اور ہم آہنگ ہیں جس طرح روح جسم کے ساتھ، خوشبو پھول کے ساتھ اور روشنی سورج کے ساتھ۔ جس طرح جسم بغیر روح کے' پھول بغیر خوشبو کے اور سورج بغیر روشنی کے' بے معنی ہے اسی طرح انشائیہ بغیر زندگی کے' بے معنی ہے۔ انشائیہ کی تخلیق فی الحقیقت زندگی ہی کی تخلیق ہے۔ انشائیہ اپنے قاری کو زندگی کے متنوع روپ دکھاتا ہے، اس کے جذبہ تحیر کو مہمیز لگاتا ہے اور اسے زندگی میں بھرپور شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ انشائیہ زندگی سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا بلکہ زندگی کو عطیہ خداوندی سمجھ کر اس سے پیار کرنا سکھاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا جمالیاتی، رومانی، اخلاقی اور تہذیبی فن بھی سکھاتا ہے۔ انشائیہ اپنے قاری سے زندگی کی رونقیں، مسرتیں اور اس کے حسن و جمال کو نہیں چھینتا بلکہ وہ تو اسے ایک نئی اور توانا زندگی بخشتا ہے۔ اس کے وژن کو کشادہ کرتا ہے، ذہن کو جلا بخشتا ہے اور جذبہ کو انگیخت لگاتا ہے تاکہ وہ زندگی کے لامتناہی سلسلہ کو شعور کی گرفت میں لاتا رہے۔ انشائیہ، حیات مستعار کی تکلیفوں اور اذیتوں میں سے راحتوں کی کرنیں سمیٹ کر اپنے قاری کے آغوش فکر میں بکھیرتا ہے تاکہ نئے ادراک کے ساتھ وہ زندگی کے سفر میں اعتماد اور حوصلے سے آگے بڑھے۔

عصر جدید کی سائنسی تہذیب نے انسان کو بے پناہ مشینی طاقت عطا کی۔ اس مشینی طاقت کے بل بوتے پر انسان نے نہ صرف بحر و بر پر اپنی فتوحات کے علم بلند کئے بلکہ خلاؤں کو بھی مسخر کیا۔ بڑے بڑے دیو ہیکل کارخانے اور فیکٹریاں جہاں دن رات کی تمیز نہیں،

مصنوعات تیار کرنے میں مصروف ہیں، چھوٹے چھوٹے شہر بڑے شہروں میں تبدیل ہو گئے۔ عظیم سیلف سروس سٹورز وجود میں آئے، ہر سال نئے ماڈل کی کاریں، ریفریجریٹر، رنگین ٹیلی ویژن اور وی سی آر جیسی پرکشش مصنوعات سے بازاروں کی رونقیں بڑھیں، ریڈی میڈ لباس ٹنڈ فوڈ اور پٹینٹ ادویات سے دوکانیں بھرنے لگیں۔ بڑی بڑی پوش عمارتیں، شاہراہیں، وسیع کاروبار مراکز وجود میں آئے۔ خوفناک تجربہ گاہوں، بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں کے جال نمودار ہوئے۔ پڑوسی ملکوں کے عدم اعتماد نے جنگی سازوسامان کی خرید وفروخت کے کاروبار کو چمکایا۔ بڑے ملکوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جتنی ترقی کی اتنا ہی ترقی پذیر ملکوں کا سیاسی اور معاشی استحصال بھی بڑھ گیا۔ اب ہر ترقی پذیر ملک ترقی یافتہ ملک کا اقتصادی شکار ہے۔ G.N.P کی بڑھوتی کو اقتصادی ترقی کا معیار سمجھا گیا۔ مستعدی، پابندی وقت اور باقاعدگی مشینی زندگی کے اٹوٹ حصے بن گئے۔ محنت اور مشقت کے نعرے لگا لگا کر انسان کو مشین کے ساتھ نتھی کر دیا گیا۔ جاپان محنت اور مشقت کے میدان میں یورپی ممالک سے بھی آگے نکل گیا۔ اس صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے کسی نے کہا، گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے۔ ترقی یافتہ ممالک میں سائنسی اور ٹیکنالوجی ترقی کے ساتھ ساتھ بے روزگاری، افراط زر، روحانی بے سکونی، اخلاقی بے راہ روی، جنسی بدنظمی، ازدواجی انتشار، مذہبی تشکک، متنوع سیاسی اور سماجی نظریات کا تصادم، بھی ظہور میں آیا۔ اس صورت احوال نے لوگوں میں مایوسی، یاسیت، دل شکستگی، اعصابی تناؤ، ذہنی تناؤ، ذہنی خلفشار، چڑچڑاپن اور بے چینی پیدا کر دی۔ جاپان جتنا زیادہ صنعتی میدان میں ترقی یافتہ ہے اتنا ہی وہاں کے لوگوں میں خودکشی کا رجحان سب سے زیادہ ہے۔ امریکہ کے افسردہ اور ناراض نوجوانوں نے ہیروئین اور ماریجوانا جیسی انفعالی نشہ آور ادویات میں پناہ لی یا پھر جوگیا لباس پہن اور گلے میں منکوں کا ہار ڈال کر بھارت کے سادھوؤں، جوگیوں، بھکشوؤں اور گروؤں کے ہاں عارضی روحانی سکون کی خاطر پناہ لی۔ فرانس کے نوجوان نے دریائے جنس میں تیراکی کو آخری سہارا پایا۔ انسان نے موت، غنودآور نشہ اور جنسی تلذذ کی حیات کش راہوں پر چلنے کو ترجیح دی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی جو انسان کی مسرت کا باعث بنتے ہیں اس کی تباہی و بربادی کے

عفریت ثابت ہوئے۔ انسان کی آزادی اور اس کا حیاتیاتی ماحول مجروح ہوا۔ مشین نے انسانی زندگی کو یکسانیت و تکرار اور بوریت دے کر اس سے تنوع، رنگارنگی، طبعی بے ساختگی اور بے تکلفی چھین لی۔ عالمی جنگ اول و دوم اقتصادی بدحالی، بداعتمادی، یکسانیت، اذیت ناک تنہائی، افراط زر، تکلیف دہ بوریت کا ہی نتیجہ ہیں۔

تہذیب حاضر کی اس بوریت زدہ مایوسی اور اضطراب کو ادیبوں نے اپنے ڈراموں، ناولوں اور افسانوں میں پیش کرنا شروع کیا۔ البرٹ کامو (Albert Camu) نے پچاس کے ابتدائی عشرہ میں آئندہ فکشن کے لئے اس اضطراب انگیز صورت حال کو پیش کیا۔ البرٹ کامو اپنے ناول La Chute (The Fall) (گراوٹ) کا جو 1956ء میں طبع ہوا، اس طرح آغاز کرتا ہے:

"May I, monsieur offer my services without running the rish of the risk of intruding I fear you may not be able to make yourself understood by the worthy gorilla who presides oure the fate of this extablishment."(The Fall)

گوریلا اسٹیبلشمنٹ کے مقدر پر صدارت کرنا بڑی تلخ اور تکلیف دہ علامت ہے۔ آگے چل کر یہی مرکزی کردار اپنے ہم عصر لوگوں کے جذبات کے بارے میں اور جدید انسان کی نفسیات کے بارے میں یوں گویا ہوتا ہے:

"It always seemed to me that our fellow - citizens had two pasaiono: Ideas and fornication without rhyme or reason, so to speak, Still, Let us take care not to condemn them they are not the only ones, for all euroke is in the same boat. I sometimes think of what future hiotrians is in the same boat. I sametimes think of what future hiotrians will say of us. A single sentence will suffica for modern man: he fornicated a read the papers." (The Fall)

آپ نے دیکھا کہ کاموس بے رحم تلخ بیانی سے جدید انسان کی شہوت پرستی، گہری منافقت کو پیش کر کے قاری کے ذہن کی مطمئن اور آسودہ زندگی میں اضطراب کی لہریں پیدا کر کے دماغ کے تار جھنجھوڑ دیتا ہے۔ بغیر عقل وضبط کے جدید انسان 'اخبار پڑھتا ہے، نظریات پیش کرتا ہے لیکن آزادی کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کا فرد ہے جس پر گوریلا حکمران ہے۔ یہ تمام علامتیں جدید تصور اقدار کی غمازی کرتی ہیں۔ ژاں پال سارتر نے جدید تہذیب کی اس تکلیف دہ صورت کو Alienation of personality یعنی شخصیت کی بیگانگی قرار دیا ہے۔ اپنے شہرۂ آفاق ناول Nausea (متلی) میں شخصیت کی دوئی کو ہی پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں بھی انسان کو کئی مقامات پر اخلاقی گراوٹ کی پست سطح پر دکھایا ہے۔ جارج آرویل (George Orwell) نے ان سے بھی دو قدم آگے اپنے مخصوص علامتی انداز میں اپنے ناول Animal Farm میں انسان کو سوروں اور دوسرے جانوروں کی شبیہوں میں پیش کر کے اور سیاسی نظریات اور سیاسی اقتدار کے حصول کے لئے خوش کن نعروں کی پیروڈی کر کے جدید انسان کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا ہے۔ ہوس، اقتدار، کرپشن اور بے دریغ جھوٹ نے انسان کے ارفع و اعلیٰ نظریات کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ جارج آرویل نے انسان کی اسی کمزوری کو اپنے ناول کا موضوع بنایا اور عجیب ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کی مصنوعات صرف وہاں تک محدود نہیں رہتیں۔ ان مصنوعات کے لئے ترقی پذیر ممالک آسان منڈیوں کا کام کرتے تھے۔ کاریں اگر جاپان میں بنتی ہیں تو ان کی ریل پیل ترقی پذیر ممالک میں ملتی ہے۔ مشروبات اگر امریکہ میں بنتے ہیں تو ان سے ہماری دکانیں بھری ہوئی ہیں۔ اس طرح ادبی نظریات اگر فرانس میں جنم لیتے ہیں تو ہمارا ادب انہیں ہاتھوں ہاتھ قبول کرتا ہے۔ لہٰذا یورپی ادب میں جو بے معنویت، بے چہرگی، بے مقصدیت، یاسیت، قنوطیت، بے چارگی اور بے حسی کی شکلیں پیدا ہوئیں ہمارے فکشن میں بھی در آئیں۔ سیاسی افکار کے اظہار پر پابندیاں تو تھیں ہی علامتی اور تجریدی اسلوب نے ابلاغ کے مسئلے کو مزید پیچیدہ اور مشکل بنا دیا۔ جارج آرویل کے ہاں انسان سور میں بدلا تو انتظار حسین کے ہاں کچھوا اور کتا بن گیا۔ کامو کے ہاں انسان گوریلا کی علامت میں نمودار ہوتا ہے تو ہمارے

افسانے میں بے ہستی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ گو انسان لاانسانیت (Dehumanisation) کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ غربت و افلاس، بھوک، ننگ، اقتصادی ناہمواری، سیاسی جبریت، بے روزگاری، اخلاق بے راہ روی، بیوروکریسی کی سرد مہری اور لاتعلقی، غیر ملکی نظریات اور ثقافت کی یلغار نے تو پہلے ہی اذہان کو پریشان کر رکھا تھا ہماری فکشن نے اس صورت حال کا ایسا ہولناک آئینہ دکھایا کہ زندگی سے اعتماد منہا ہونے لگا۔ ایسی صورت حال میں منچلے طنز نگاروں نے طنز و تعریض کے تیر برسائے تو مزاح نگاروں نے مضحکہ خیز ٹوپی پہن کر ہمیں ہنسانے پر مجبور کیا کہ افسردگی اور گھٹن سے نپٹنے کا یہ اچھا اعلاج ہے۔

افراط و تفریط کے ماحول میں انشائیہ اپنے معتدل مزاج کے ساتھ بساط ادب پر اپنی ننھی سی انفرادی آزاد شمع روشن کرتا ہے تاکہ دھند اور کہرے میں لپٹی ہوئی ویرانی میں زندگی کے حسن کی جلوہ نمائی کرے اور زندگی پر سے اٹھتے ہوئے اعتماد کو بحال کرے۔ انشائیہ تھکے ہارے مایوس بیزار انسان کو سورج کی پہلی کرن بن کر اپنے ہلکے ہلکے گرم لمس سے بیدار کرتا ہے اور اسے سورج کے صدیوں کے عمل میں ایک نیا ذائقہ اور ایک تازہ روپ دکھاتا ہے وہ اسے اپنے اردگرد پھیلی تکرار سے معمول زندگی میں مسرت انگیز نئے پہلو دکھاتا ہے تاکہ اس کے اندر بوریت اور یکسانیت کا تسلسل ٹوٹ جائے اور اس کے اندر زندگی سے محبت پیدا ہو۔ عمل تکرار کو توڑ کر ایک نئی جہت کی نشان دہی انشائیہ کا وصف خاص ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے تازہ انشائیوں کے مجموعہ "دوسرا کنارا" کے دیباچہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

> "وقت کی گزران کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہر شئے جسے انسان نے اول اول مسرت اور حیرت کے ساتھ دیکھا تھا، اب اسے پٹی ہوئی پامال اور پیش پا افتادہ نظر آنے لگتی ہے حتیٰ کہ موسموں کا مد و جزر دن رات کی گردش اور زندگی اور موت کا ڈراما بھی اسے پرانا، فرسودہ ہزاروں لاکھوں بار کا دہرایا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جس انسان کو ہر طرف تکرار ہی تکرار نظر آئے تو اس پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کو بوریت بھی کہا گیا ہے جو براہ راست مشینی تکرار سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر مشین تکرار کا منظر پیش کرتی ہے

> اور تکرار چاہے مشین کی ہو، نظریے کی ہو یا لفظ کی، انسان کے شعور کو معطل کر کے اسے سو جانے پر مائل کرتی ہے۔ انشائیہ کا وصف یہ ہے کہ وہ تکرار کے اس دائرے کو توڑتا ہے اور جس ہتھیار سے اسے توڑتا ہے وہ ہے ایک عالمِ حیرت! عالمِ حیرت کا کام یہ ہے کہ وہ جگاتی ہے، سلاتی نہیں ہے۔ وہ بیداری کا نقطہ آغاز ہے اور بیداری کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر چیز کو اس طور دیکھے جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔"

زندگی کو حیرت و استعجاب، محبت و پیار اور روشن دلی سے دیکھنے ہی سے اس کا حسن و نکھار اور تر و تازگی آشکار ہوتی ہے۔ انشائیہ زندگی کی راہوں سے بکھرے ہوئے نفرتوں اور منافقتوں کے کانٹے ہٹا کر پھولوں کی پتیاں بکھیرتا ہے۔ تاکہ انسانیت کی عظمت اور زندگی کا وقار بلند ہو۔ وہ زندگی کی بے معنویت میں معنی کے موتی بکھیرتا ہے۔ گھٹن زدہ معاشرے کو صحت مند فضا میسر کرتا ہے اور اسے تازہ خون بہم پہنچاتا ہے۔ ناراض اور بیزار افراد کو زندگی کے روشن اور رجائی انداز اور رنگ دکھا کر زندگی سے پیار کرنے اور اسے قبول کرنے کی حسین ترغیب دیتا ہے۔ انشائیہ میں انسان کو نہ تو گوریلا، سور، کتا اور کچھوے وغیرہ کی سطح پر لا کر اس کی تذلیل کی جاتی ہے اور نہ اسے مافوق الفطرت کرامات کا حامل انسان پیش کر کے اور غیر ارضی مخلوق دکھا کر اس کی پرستش پر مائل کیا جاتا ہے۔ انشائیہ تو انسان اور اس کی زندگی کو کلیت کے طور پر قبول کرتا ہے، وہ زندگی کو اس کے حسن و بدصورتی، اچھا اور برائی، صحت اور بیماری، جنگ و امن، کانٹوں اور پھولوں، خشکی و تری، آسمان و زمین، رات اور دن، جھوٹ اور سچ، نیکی اور بدی، کے وجود کے ساتھ خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے کیونکہ اسی تار حریر دو رنگ سے زندگی عبارت ہے۔ انشائیہ میں انسان اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بحیثیت انسان نمودار ہوتے ہیں۔ ایسے انسان جن کے اندر تخیل کی پرواز، جذبات کی حدت، فکر کی لے، شعور کی رو اور حیرت و استعجاب کی گرمی ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے ذہن، روح اور دل کے تمام دریچے کھول دیتا ہے تاکہ باطنی صداقت کی روشنی سے زندگی کی تاریکیاں چھٹ جائیں۔ انشائیہ نگار کا دل جتنا پاکیزہ، صاف اور سادہ ہوگا انشائیہ اتنا ہی حق و صداقت کا مظہر ہوگا۔ چونکہ انشائیہ زندگی کو اکائیوں میں بٹا ہوا

نہیں دیکھتا بلکہ اسے کلیت کے ساتھ قبول کرتا ہے اس لئے انشائیہ میں مردم بیزاری کلیت و یاسیت، انفعال پسندی، بٹی ہوئی شخصیت، تعصب، نفرت، ناراضگی، اضطراب ذہنی انتشار، سیاسی و سماجی گھٹن و جبریت کا کوئی گزر نہیں کیونکہ انشائیہ میں ان تمام منفی اقدار کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے ٹھیک اس طرح جس طرح سورج کی پہلی کرن نکلنے سے رات کی تاریکی، گلاب کے پھول کھلنے سے کانٹوں کی موجودگی اور صداقت کے حسن سے جھوٹ کی بدصورتی، دور ہو جاتی ہے۔ انشائیہ زندگی کے غم ناک اور افسوس ناک پہلوؤں کو اجاگر کر کے زندگی کے بوجھ میں مزید اضافہ نہیں کرتا بلکہ ان کی صورتوں کو لطیف کر کے زندگی کو سبکسار کرتا ہے اور انسان کو اس خطہ ارضی کو جنت نشان بنانے کی فنکارانہ ترغیب دیتا ہے۔ انشائیہ نگار زندگی کا بھرپور مشاہدہ کھلی آنکھ سے بازاروں میں گھوم پھر کر، جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہو کر، شاہراہوں اور فٹ پاتھوں پر چل کر، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں بیٹھ کر، سینما میں جا کر، کرکٹ کے میچوں کو دیکھ کر، سردی اور گرمی کے تھپیڑوں کو برداشت کر کے، بیماری اور بھوک کی اذیت میں سے گزر کر، ریل گاڑی کا سفر کر کے، سرکس کا تماشہ دیکھ کر لوگوں میں تقریر کر کے مغنی کا گانا سن کر، رقاصہ کا رقص دیکھ کر، چائے پی کر یا اخبار پڑھ کر کرتا ہے۔ انشائیہ نگار زندگی کے تجربے سے گزرتا ہے۔ اسے اپنے خون کی گردش میں محسوس کرتا ہے۔ اپنی روح میں سموتا ہے اور پھر ذہن کے عمل کیمیا سے گزار کر اپنے تجربہ کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس میں ایک ماورائی گوشہ اور تازگی کی خوشبو پھیلی ہوتی ہے۔ دسمبر کا موسم جب انور سدید کے تجربہ کی رو میں آتا ہے۔ تو اس کی صورت یوں بنتی ہے:

> "......دسمبر کمرے میں آ جاتا ہے بیوی آتش دان کے کوئلوں کو انگیخت دینے لگتی ہے۔ بچے سمٹ کر میرے اور قریب آ جاتے ہیں اور دسمبر ہمارے وسط میں کسی بے تکلف دوست کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ اسے ذرا سی بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے ساتھ یوں گھل مل جاتا ہے جیسے وہ ہمارا اٹوٹ انگ ہے۔" (دسمبر)

اور جب کرکٹ کے میچوں میں وزیر آغا کی نظر کا نقطہ شعار کرکٹ کے بارہویں کھلاڑی پر پڑتا ہے تو ان کا وژن اسے اپنے گرفت میں اس طرح لاتا ہے۔

"......بارہواں کھلاڑی ایک ایسا ہی سچا صوفی ہے۔ وہ بیک وقت اپنی ٹیم سے منسلک بھی ہے اور جدا بھی، وہ میدان میں پہلی کے چاند کی طرح آتا ہے جو دوسرے ہی لمحے رخصت بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کرکٹ کے کھیل کا نباض، مفسر، کارکن اور جاسوس ہونے کے باوجود اپنے دامن کو تر نہیں ہونے دیتا۔ ہونٹوں پر ایک عارفانہ مسکراہٹ سجائے وہ قلب مطمئنہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔" (بارہواں کھلاڑی)

میں نے یہ دو مثالیں بے اختیاری طور پر دو مختلف انشائیہ نگاروں کے ہاں سے پیش کی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں ہماری انسانی زندگی سے متعلق ہیں لیکن انشائیہ نگاروں نے اپنے وژن کو کچھ اس طرح برتا ہے کہ یہ ہمیں دسمبر میں بے تکلف دوست اور کرکٹ کے بارہویں کھلاڑی میں ایک صوفی، نباض اور مفسر حیات نظر آتا ہے۔ یوں انشائیہ نگار کے ہاں ڈبل وژن (Double Vision) بھرپور انداز میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور اس ڈبل وژن کے زور ہی پر وہ زندگی کا نیا رخ، زاویہ اور دوسرا کنارا دریافت کرتا ہے۔

□□□

وزیر آغا

اُردو انشائیہ کی کہانی

آج سے کم و بیش چالیس برس پہلے اُردو انشائیہ کے خدوخال واضح ہونے شروع ہوئے یہ نہیں کہ اُردو انشائیہ اس سے قبل اپنا کوئی الگ وجود رکھتا تھا اور کسی خزانے کی طرح زیرِ زمین پڑا تھا جسے کسی نے اتفاقاً دریافت کر کے اہل نظر کے سامنے پیش کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ملک سے پہلے طنزیہ مزاحیہ اور سنجیدہ مضمون بلکہ جواب مضمون لکھنے کی روش تو عام تھی جو کتابوں اور رسائل سے نکل کر آہستہ آہستہ اخباری کالموں اور شذروں کی صورت میں ڈھل رہی تھی مگر اُردو انشائیہ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ پھر جیسا کہ قاعدہ عام ہے کہ جب کوئی نئی شے وجود میں آ جائے تو فوراً اس کا سلسلہ نسب دریافت کرنے کی مساعی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جب 1960ء کے لگ بھگ اُردو انشائیہ اپنے بھرپور انداز میں ابھر کر سامنے آیا اور اُردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ بھی شائع ہو گیا تو پوری اُردو دنیا میں انشائیہ کی جڑوں کی تلاش کا سلسلہ فی الفور شروع کر دیا گیا۔ انہیں دنوں میں نے انشائیے کے امتیازی اوصاف کو واضح کرنے کے لئے متعدد مضامین لکھے اور ایک مضمون میں جو علی گڑھ میگزین کے انشائیہ نمبر میں چھپا، اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ انشائیہ کے عناصر تو تقسیم سے پہلے کی غیر افسانوی نثر میں بھی جا بجا مل جاتے ہیں۔ لیکن سر سید احمد خاں کے مضامین سے لے کر تقسیم ملک تک لکھے گئے مضامین کے انبار میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں ہے جسے مکمل انشائیہ کا نام دیا جا سکے۔

اُردو کے معاملے میں تقسیم سے پہلے ہر قسم کے مضامین کو بطور ایسّے پیش کرنے کی روش عام تھی۔ البتہ تقسیم کے بعد انگریزی کے لائٹ یا پرسنل ایسّے کے تتبع میں ایسی تحریریں وجود میں آئی ہیں جو تقسیم سے پہلے کے مضامین سے صنفی اعتبار سے مختلف ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا

کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس نومولود کو ایک نئے نام سے موسوم کیا جائے تا کہ اذہان پر اس کی انفرادیت کا احساس مرتسم ہو سکے اور وہ اسے دوسری اصناف نثر سے الگ کرنے میں کامیاب ہوں۔ اپنے اس موقف کو عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے انگریزی کے پرسنل یا لائٹ "ایسے" کے لئے ایک متبادل اُردو لفظ کی تلاش شروع کی تا کہ وہ غلط فہمیاں جو لفظ "ایسے" سے انگریزی ادب میں پیدا ہوئی تھیں اُردو میں بھی پیدا نہ ہو جائیں۔ مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ادھر ہم نے پرسنل "ایسے" کے لئے "انشائیہ" کا لفظ تجویز کیا اور ادھر یار لوگوں نے اس لفظ کو ساری غیر افسانوی نثر کے لئے مختص کرنا شروع کر دیا۔ بس سارا جھگڑا یہیں سے شروع ہوا مگر اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے۔

میں نے 1950ء سے 1960ء تک کے عرصہ میں ادب لطیف میں متعدد "پرسنل ایسے" تحریر کئے تھے جنہیں "لائٹ ایسے" انشائے لطیف، لطیف پارہ، مضمون لطیف وغیرہ ناموں کے تحت شائع کیا گیا تھا مگر چونکہ ایسے کے لفظ نے خود مغرب میں بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دیا تھا جنہیں ہمارے انگریزی پڑھانے والوں نے وراثت میں حاصل کیا تھا لہٰذا میں چاہتا تھا کہ پرسنل یا لائٹ ایسے کے لئے کوئی نیا اور منفرد اُردو نام تجویز کیا جائے۔ انہی دنوں میں نے بھارت کے کسی رسالے میں انشائیہ کا لفظ پڑھا اور مجھے یہ اتنا اچھا لگا کہ میں نے میرزا ادیب صاحب سے جو ان دنوں "ادب لطیف" کے مدیر تھے، اس نام کو پرسنل ایسے کے لئے مختص کرنے کی تجویز پیش کر دی جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے ڈاکٹر سید حسنین "انشائیہ" کا لفظ "لائٹ ایسے" کے معنوں میں استعمال کر چکے تھے۔ مگر جن لائٹ ایسوں کے لئے انہوں نے یہ لفظ استعمال کیا تھا وہ سرے سے "لائٹ ایسے" تھے ہی نہیں۔

پچھلے دنوں اس سلسلے میں مزید انکشاف ہوئے۔ ایک تو یہ کہ تقسیم سے پہلے علی اکبر قاصد کے مضامین کے مجموعہ "ترنگ" کے دیباچہ میں اختر اورینوی نے انشائیہ کا لفظ استعمال کیا تھا اور اس سے مراد "پرسنل لائٹ ایسے" لی تھی لیکن خود علی اکبر قاصد کے مضامین کا انشائیہ سے دور کا واسطہ نہیں تھا گویا اختر اورینوی کے تجویز کردہ لفظ کے لئے اُردو میں

انشائیہ ایسی کوئی تحریر بطور مثال موجود نہیں تھی لہٰذا ان کے زمانے میں اس لفظ کو قبول نہ کیا گیا۔ ان سے قبل شبلی نعمانی کے بعض مضامین میں بھی انشائیہ کا لفظ استعمال ہو چکا تھا مگر ان مضامین میں لفظ انشائیہ کا "پرسنل ایسے" سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً بلاغت کے باب میں شبلی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بلاغت" اس کا نام ہے کہ مبتدا اور خبر کہاں مقدم لائے جائیں اور کہاں مؤخر، کہاں معرفہ ہوں کہاں نکرہ، اسناد کہاں حقیقی ہوں، کہاں مجازی! جملہ کہاں خبریہ ہو کہاں انشائیہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اس میں شبلی نے لفظ انشائیہ تو استعمال کیا ہے مگر ایک بالکل مختلف حوالے سے۔ سو جب "ادب لطیف" میں لائٹ یا "پرسنل ایسے" کی پیشانی پر لفظ انشائیہ درج کر دیا گیا تو گویا پہلی بار انشائیہ کے صحیح نمونے کو لفظ انشائیہ سے نشان زد کیا گیا اور ہر قسم کے طنزیہ، مزاحیہ، سنجیدہ، تنقیدی یا معلوماتی مضامین سے اسے الگ کر دیا گیا۔ ان دنوں میں اور میرزا ادیب اکثر اس بات پر غور کرتے کہ ہم نے انشائیہ کا لفظ رائج کرنے کی کوشش تو شروع کر دی ہے لیکن یہ رائج کیسے ہوگا؟ مثلاً اگر کہا جائے کہ فلاں کتاب انشائیوں کا مجموعہ ہے تو "انشائیوں" کا لفظ عجیب اور نامانوس لگے گا۔ واقعی اس وقت خود ہمیں بھی "انشائیوں" کا لفظ عجیب سا لگا تھا۔ آج کہ یہ لفظ رائج ہو چکا ہے تو انشائیہ نگاری، انشائیے، انشائیوں اور انشائیہ فہمی ایسی تراکیب اور الفاظ بالکل مناسب اور برمحل لگتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی زمانہ میں Point of View کے لئے "نقطہ نظر" کی ترکیب وضع ہوئی تھی جسے لوگوں نے سخت ناپسند کیا تھا۔ مگر پھر یہ سکہ رائج الوقت ہو گئی اور اب کسی کو یاد بھی نہیں کہ اس ترکیب کی پیالی میں کتنا بڑا طوفان اٹھا تھا۔

ان دنوں میں اُردو انشائیہ نگاری کے میدان میں بالکل تنہا تھا۔ پھر "ادب لطیف" ہی میں مشکور حسین یاد کے دو تین ایسے مضامین شائع ہوئے جن میں انشائیہ کے مقتضیات کو ایک بڑی حد تک ملحوظ رکھا گیا تھا لیکن ایک تو ان مضامین کا اسلوب انشائیہ کی تازگی (ان دنوں میں لفظ شگفتگی استعمال کرتا تھا جس نے بعد ازاں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کیں) کا حامل نہیں تھا۔ پھر یہ کہ مشکور حسین یاد مضمون میں اصلاحی رنگ لے آتے تھے۔ چنانچہ میں نے "ادب لطیف" ہی میں ایک خط لکھ کر ان کے مضمون کی تعریف کرتے ہوئے ان اسقام

کی طرف بھی ہلکا سا اشارہ کر دیا میں تو اپنے اس خط کو بھول چکا تھا لیکن اس کی اشاعت کے کم و بیش بیس برس بعد مشکور حسین یاد نے مجھے اس خط کا تراشہ دکھایا جو انہوں نے محفوظ کر رکھا تھا اور کہا کہ دیکھیے، آپ نے ایک زمانے میں مجھے انشائیہ نگار تسلیم کیا تھا۔ یہ غلط بات نہیں تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یاد صاحب نے میرے خط کے اشاروں کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور بعد ازاں بتدریج اصلاحی یا انتہائی سنجیدہ فلسفیانہ یا نیم فلسفیانہ انداز اختیار کرتے چلے گئے۔ حد یہ کہ انہوں نے انشائی اسلوب سے بھی نجات حاصل کر لی۔ آج وہ آپنے جن مضامین کو انشائیہ کے نام سے شائع کراتے ہیں وہ تنقیدی اسلوب میں لکھے گئے اصلاحی وضع کے مضامین ہیں۔ جن میں انشائیہ کی تازگی کا فقدان ہے۔

مگر جن ایام کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ محض انشائیہ لکھنے ہی کا دور نہیں تھا بلکہ انشائیہ فہمی کا دور بھی تھا۔ میں نے اس سلسلے میں انشائیہ فہمی کے سوال پر متعدد مباحث کرائے جن میں غلام جیلانی اصغر اور نظیر صدیقی اور دوسرے دوستوں نے خوب حصہ لیا۔ ان میں سے نظیر صدیقی انگریزی کے استاد ہونے کے باعث انشائیہ (یعنی پرسنل ایسّے) کے مقتضیات سے تو واقف تھے لیکن انشائیہ کو پہچاننے کے معاملے میں وہ بھی اختر اور ینوی اور ڈاکٹر محمد حسنین وغیرہ کے گروہ ہی سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ خود انہوں نے انشائیہ کے نام سے جو مضامین لکھے وہ زیادہ سے زیادہ رشید احمد صدیقی کے تتبع میں لکھے گئے طنزیہ مزاحیہ مضامین ہی کہلا سکتے ہیں۔

1965ء تک انشائیہ اور انشائیہ، نگاری کے سلسلے میں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر بالکل سرسری سی۔ چنانچہ میں اور مشتاق قمر اکثر انشائیہ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے اور کہتے کہ کم از کم ہماری زندگیوں میں تو اس صنف کے پھلنے پھولنے یعنی مقبول ہونے کے امکانات بہت کم ہیں۔ کیونکہ پچھلے ایک سو برس سے اُردو داں طبقہ مضمون کے لفظ سے مانوس ہو چکا ہے اور مضمون میں اگر طنز و مزاح ہو تو اسے بطور خاص پسند کرتا ہے۔ لہٰذا انشائیہ کے اس خاص وصف سے مانوس ہونا اس کے لئے بہت مشکل ہے جو معمولی شے کے غیر معمولی پن کو سطح پر لاتا ہے اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے کے علاوہ سوچ کے لئے غذا بھی مہیا کر دیتا ہے۔ گویا اس وقت ہمارے نزدیک انشائیہ کو مقبول بنانے کے لئے انشائیہ کو پہچاننے

کی ایک باقاعدہ تحریک کی ضرورت تھی مگر یہ جبھی ممکن تھا کہ ایک بڑی تعداد میں اُردو انشائیے دستیاب ہوتے۔ ادھر یہ حال تھا کہ ابھی انشائیوں کا صرف ایک مجموعہ ہی شائع ہوا تھا۔ مشتاق قمر اس سلسلے میں بہت سنجیدہ تھے لیکن چونکہ وہ ایک عرصہ سے طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھتے آ رہے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے ایک مدار سے باہر آ کر ایک بالکل نئے مدار میں گردش کرنا بے حد مشکل تھا۔ تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور چار برس تک انشائیہ نگاری کی کوشش کے بعد بالآخر ایک انشائیہ لکھنے میں کامیاب ہو گئے جو میں نے ''اوراق'' میں شائع کر دیا یہ گویا بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ اس کے بعد جمیل آذر، غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر انور سدید نے بھی انشائیے تحریر کرنے شروع کر دیے۔ مشتاق قمر نے تو اتنے انشائیے لکھ لیے کہ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''ہم ہیں مشتاق'' کے نام سے شائع بھی ہو گیا۔ مگر ابھی تک انشائیہ کی تحریک محض چند ادبا تک ہی محدود تھی۔ نئے لکھنے والے ابھی اس میدان میں نہیں آئے تھے۔ پھر سلیم آغا کو انشائیہ لکھنے کا خیال آیا اور جب اس کا پہلا انشائیہ ''اوراق'' میں چھپا تو یہ انشائیہ کے میدان میں نہ صرف نئی پود کی آمد کا اعلامیہ تھا بلکہ اس سے یکا یک انشائیہ نگاری کی تحریک میں تازہ خون کی آمیزش بھی ہو گئی اور انشائیہ کا نام کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر لیا جانے لگا۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایف۔ اے کے نصاب میں تو اُردو انشائیے بھی شامل کر لیے گئے اور طالب علموں نیز اساتذہ کے ہاں انشائیے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ایک جستجو وجود میں آ گئی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جہاں سینئر ادبا انشائیہ کو اکثر و بیشتر ''ایسّے'' کے متبادل گردانتے تھے اور اس کے دامن میں ہر قسم کی غیر افسانوی نثر کو شامل کر لیتے تھے وہاں نوجوان لکھنے والے انشائیہ کے مزاج سے آگاہ ہو رہے تھے۔ ان کے لئے یہ آسانی تھی کہ انہیں کسی سابقہ نظریہ میں ترمیم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ انشائیہ پڑھتے تو اسے فوراً پہچان لیتے۔ حتیٰ کہ اسے طنزیہ اور مزاحیہ یا ہلکے پھلکے معلوماتی قسم کے مضامین سے الگ کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے۔ ''اوراق'' نے ان نئے انشائیے نگاروں کے لئے اپنا دامن کشادہ کر دیا۔ چنانچہ پہلے جہاں ''اوراق'' کے ہر شمارے میں محض دو یا تین انشائیے شائع ہوتے تھے جن کا مشکل ہی سے کوئی نوٹس لیتا تھا وہاں اب دس بارہ

اوراس کے بعد اٹھارہ بیس انشائیے ایک ہی شمارے میں شائع ہونے لگے اور نوجوان لکھنے والوں کے علاوہ بہت سے منجھے ہوئے ادیب بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے۔ چنانچہ کامل القادری، اکبر حمیدی، محمد منشایاد، حیدر قریشی، محمد اسد اللہ، رام لعل نابھوی، پرویز عالم، طارق جامی، جان کاشمیری، محمد اقبال انجم، انجم نیازی، محمد ہمایوں، سلمان بٹ، رشید گریجہ، رعنا تقی، اظہر ادیب، سعشہ خان، فرح سعید رضوی، یونس بٹ، امجد طفیل، تقی حسین خسرو، حامد برگی، بشیر سیفی، راجہ ریاض الرحمٰن، خالد پرویز، شمیم ترمذی، اور راغب شکیب کے علاوہ بہت سے سینئر ادبا مثلاً جوگندر پال، احمد جمال پاشا، غلام الثقلین نقوی، شہزاد احمد اور ارشد میر بھی انشائیہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے اور مجھے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ انشائیہ کو طنزیہ مزاحیہ مضامین نیز دیگر معلوماتی مضامین سے ایک بالکل الگ صنف قرار دیتے تھے۔ ''اوراق'' میں انشائیہ نگاری کو فروغ ملا تو دوسرے رسائل اور بعد ازاں اخبارات نے بھی انشائیہ کو اپنے دامن میں جگہ دے دی۔ حتیٰ کہ رسالہ ''فنون'' بھی انشائیہ کو اپنی فہرست میں شامل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن اسے نئے انشائیہ نگاروں کا تعاون حاصل نہ ہو سکا۔

انشائیہ کے یکایک اس قدر مقبول ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے خلاف محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس محاذ آرائی نے کئی واضح صورتیں اختیار کیں۔ پہلی تو یہ کہ کسی ایسی شخصیت کی تلاش کی جائے جسے اُردو میں انشائیہ نگاری کا بانی اور منتہی قرار دیا جا سکے۔ دوسری یہ کہ اُردو انشائیہ کے بارے میں یہ تاثر دیا جائے کہ انشائیہ تقسیم کے بعد وجود میں نہیں آیا بلکہ سرسید کے زمانے سے (بعض کے نزدیک ملا وجہی کے زمانے سے) لکھا جاتا رہا ہے اور اس لئے انشائیہ نگاری کی جس تحریک کی آج کل پبلسٹی ہو رہی ہے وہ صرف پرانی شراب ہے جو نئی بوتلوں میں پیش کی جا رہی ہے۔ تیسری یہ کہ خود صنف انشائیہ کی مذمت کی جائے۔ انشائیہ اور انشائیہ نگاری کا مذاق اڑایا جائے۔ نیز یہ تاثر عام کیا جائے کہ صنف انشائیہ کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے۔ ہر قسم کی نثر پر انشائیہ کا لیبل لگ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں انشائیہ خود مغرب میں دم توڑ چکا ہے۔ اب اُردو والے اس مردے کو دوبارہ کیسے زندہ کر سکتے ہیں؟

پچھلے چالیس سالوں میں انشائیہ کے بارے میں بہت بے پر کی اڑائی گئی ہیں، مثلاً

ایک یہ کہ انشائیہ ایسے معمولی اور بے مصرف موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہے جن کی معاشرتی اور سیاسی حتیٰ کہ مابعد الطبیعاتی نقطہ نظر سے بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ بھلا بال کٹوانا یا آئس کریم کھانا بھی کوئی موضوع ہے جس پر انشائیہ تحریر کیا جائے اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ انشائیہ تو دنیا کی کسی شے کو بھی معمولی قرار نہیں دیتا۔ اس کی نظروں میں ذرہ بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی کہ کل کائنات۔ بیسویں صدی میں Microcosm کی لامحدودیت کا تصور عام ہو رہا ہے اور شیئیت بھی محض روابط کی ایک صورت متصور ہونے لگی ہے۔ بڑے اور چھوٹے موضوعات کی تخصیص کیا معنیٰ رکھتی ہے؟ کسی زمانے میں کہانی شہزادوں اور شہزادیوں، جنوں اور پریوں کے بارے میں لکھی جاتی تھی یا پھر جاگیردار، سرمایہ دار اور پوش سوسائٹی کے کردار فکشن کا موضوع بنے مگر آج کہانی اونچے اونچے میناروں اور محلوں سے اتر کر بازار میں ننگے پاؤں چل رہی ہے۔ یہی حال شاعری کا ہے جو کبھی مثنوی اور قصیدہ کے ذریعے معاشرے کے اونچے طبقوں کی عکاسی کرتی تھی مگر اب عام شہری کے محسوسات کو مس کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں انشائیہ کا یہ کمال ہے کہ اس نے اپنی ابتدا ہی زمین سے کی ہے۔ اس نے بڑے بڑے محلوں، مقتدر کرداروں، گونجتے ہوئے نظریوں اور عقیدوں اور نعروں کو اپنا موضوع بنانے کے بجائے سامنے کی اشیا مثلاً کرسی، اونگھنا، مکان، واشنگ مشین، جھوٹ، دسمبر اور فائل ایسے موضوعات کو چھوا ہے لیکن ان بالکل معمولی موضوعات کے ایسے غیر معمولی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے کہ معمولی چیزوں کے سامنے نام نہاد غیر معمولی چیزیں بالکل معمولی نظر آنے لگی ہیں۔ یہی نہیں انشائیہ نے ایک اور کام یہ کیا ہے کہ وہ موضوعات اور کردار اور ادارے جنہیں معاشرے نے محض عادتاً یا احتراماً جملہ نقائص اور اسقام سے ماورا سمجھ رکھا تھا۔ خود ان پر ایک نئے زاویے سے نظر ڈال کر ان کے معمولی پن کو اجاگر کر دیا ہے۔ مثلاً جب کوئی انشائیہ نگار Ignorance of the Learned پر انشائیہ لکھتا ہے یا کائنات کی لامحدودیت کو دل کے اندر کارفرما دیکھتا ہے یا سچ کی منافقت اور شرافت کی بزدلی اور بہادری کی حادثاتی نوعیت کو سامنے لاتا ہے تو وہ قاری کو اس نظریاتی، اخلاقیاتی اور معاشرتی خول سے باہر نکالتا ہے جس میں اس نے خود کو محبوس کر رکھا ہے۔ اس

اعتبار سے دیکھیے تو انشائیہ اکڑی ہوئی گردنوں اور انانیت میں مبتلا لوگوں کو جھنجھوڑنے اور انہیں بیدار کرنے کا نام ہے۔ اس قسم کی صنف نثر کو جو انسان کے باطن کو اجلا کرنے، اسے جگانے اور معمولات کی میکانکی تکرار سے اسے نجات دلانے کے لئے کوشاں ہو، اس بات پر مجبور کرنا کہ وہ سیاسی یا نظریاتی یا معاشرتی سطح کے اخباری موضوعات کو عصری آگاہی کے نام پر حرز جاں بنائے، بالکل ایسے ہی ہے جیسے گھر کے صحن میں چھوٹا سا گڑھا کھودنے کے لئے ایٹم بم چلا دیا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اہل نظر ابھی تک انشائیہ کی بے پناہ قوت سے واقف نہیں ہو سکے۔ انہیں شاید معلوم نہیں کہ جس طرح ایک مجدد معاشرے کی تجدید کرتا ہے، اسی طرح جب انشائیہ کسی ادب میں نمودار ہوتا ہے تو پورے ادب کی تجدید ہو جاتی ہے۔ ابھی سے اُردو انشائیہ نے اُردو افسانہ اور نظم اور سفرنامے پر اپنے اثرات مرتسم کرنے شروع کر دیے ہیں۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ اس نے نئی پود کو آنکھیں میچ کر پرانی باتیں تسلیم کرنے کے نقصانات سے بھی آگاہ کیا ہے اور انہیں سوال کرنے اور بنے بنائے نظریات اور رویوں پر نظر ثانی کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ انشائیہ ایک نئے زاویہ نگاہ کا نام ہے۔ زندگی کو دوسرے کنارے سے دیکھنے کی ایک روش ہے۔ انشائیہ ایک مثبت طرز کی بغاوت ہے جو شخصیت پر چڑھے ہوئے زنگ کو اتارتی ہے۔ انشائیہ ایک تشنج کو رفع کرتی ہے اور انسان کو جذباتی اور نظریاتی جکڑ بندیوں سے نجات دلا کر آزادہ روی کی روش پر گامزن کر دیتی ہے۔ ایسی دلآویز امکانات کی حامل اور لطافت سے مملو صنف نثر کو پیش پا افتادہ اخباری موضوعات پر خامہ فرسائی کی دعوت دینا ایک قومی المیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

انشائیہ پر ایک اور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تبسم زیرلب کا اہتمام کرتا ہے لیکن کھل کر قہقہہ لگانے کی اجازت نہیں دیتا اور یوں انسانی مسرت کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کا نہایت عمدہ جواب مشتاق قمر نے یہ کہہ کر دیا ہے کہ آپ کس قسم کی مسرت کے جویا ہیں؟ کیا ایسی مسرت کے جو لطیفے سن کر ایک بھرپور قہقہہ لگانے کے بعد غبارے کی طرح پھٹ جاتی ہے یا ایسی مسرت کے جو آپ کے دل کے اندر موم بتی کی طرح سلگتی ہے اور تادیر سلگتی رہتی ہے۔ دونوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ طنز یا مزاح سے

پیدا ہونے والا قہقہہ فاضل اسٹیم کے اخراج کا اہتمام کرتا ہے اور قہقہہ لگانے کے بعد انسان کی حالت اس کارتوں کی سی ہو جاتی ہے جس میں سے چھرّے نکل چکے ہوں۔ چنانچہ اس کے لئے اردگرد کے ماحول کو بے معنی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا یا پھر وہ عادی نشہ باز کی طرح مزید لطائف کی فرمائش کرتا ہے تاکہ مزید جمع شدہ سٹیم کا اخراج کر سکے۔ اس کے برعکس انشائیہ کا مقصد ہنسی کو تحریک دینا نہیں۔ اس کا مقصد ذہن کو تازہ دم کرنا ہے اس کے لئے وہ بقدر ضرورت تبسم زیرلب کا اہتمام کرتا ہے یا اس تبسم کا جسے شاعرانہ مزاح Humour Poetic کہا گیا ہے اور جو غالب کی شاعری کے علاوہ مشکل ہی سے کسی اور اُردو شاعر کے ہاں نظر آتا ہے۔ یہ مزاح کی وہ قسم ہے جس میں آنسو اور تبسم ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تبسم زیرلب کسی لطیفے کو سن کر برانگیخت نہیں ہوتا بلکہ معنی کے پرتوں کے اترنے پر متحرک ہوتا ہے۔ جب انشائیہ نگار ایک معمولی سی شے میں مضمر معنی کو سامنے لاتا ہے تو قاری یا تو زندگی کی بے معنویت کا یا پھر بے معنویت کی معنویت کا عرفان حاصل کر کے ایک معنی خیز مسکراہٹ سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ یہ مسکراہٹ اصلاً ایک عارفانہ مسکراہٹ ہے جو سدھیارتھ کے ہونٹوں پر اس وقت نمودار ہوتی ہے جب اس پر اچانک کائنات کا راز فاش ہو جاتا ہے اور مونالیزا کے ہونٹوں پر اس وقت جب اسے اپنی تخلیقی حیثیت کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ سو انشائیہ نگار کو معنی خیز تبسم عطا کرنے کے اہم کام سے روک کر محض فقرہ بازوں اور لطیفہ گویوں کی صف میں لا کھڑا کرنا کفران نعمت نہیں تو اور کیا ہے؟

انشائیہ پر ایک یہ پھبتی بھی کسی گئی ہے کہ انشائیہ نگار کو جھک کر ٹانگوں میں سے سمندر کو دیکھنے کا مشورہ دیتا ہے۔ پس منظر اس پھبتی کا یہ ہے کہ میں نے انشائیہ فہمی کے سلسلے میں ابتداءً جو مضامین تحریر کئے ان میں اس بات پر زور دیا تھا کہ انشائیہ سامنے کی چیزوں یا مناظر کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنے کا نام ہے۔ اس کے لئے یا تو وہ چیزوں اور مناظر کو الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے تاکہ ان کے چھپے ہوئے پہلو نظر کے سامنے آ جائیں یا پھر خود اپنی جگہ سے ہٹ کر ان چیزوں اور مناظر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ موخرالذکر بات کو میں نے کئی مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کی جن میں ایک مثال بچپن کے اس تجربے

سے لی جب لڑکے بالے کھیل کود کے دوران جھک کر ٹانگوں میں سے منظر کو دیکھتے ہیں اور یوں انہیں ہر روز کا دیکھا بھالا منظر انوکھا نظر آنے لگتا ہے۔ میں نے دوسری مثال دریا کے کنارے کے سلسلے میں دی اور کہا کہ اگر آپ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کو دیکھنے کے عادی ہیں اور آپ کو ہر روز ایک ہی اکتا دینے والا منظر نظر آتا ہے تو آپ کسی روز دوسرے کنارے پر جا نکلیں اور وہاں سے پہلے کنارے کو دیکھیں تو آپ کو سارا منظر ایک نئے روپ میں نظر آئے گا۔ لہٰذا انشائیہ "دوسرے کنارے" سے دیکھنے کا نام ہے۔ مراد یہ کہ ہم عادت اور تکرار کے دائرے سے باہر آئیں، شخصیت کی آہنی گرفت سے آزاد ہوں اور خود پر سے معاشرتی دباؤ کو ہٹائیں تو ہمیں ہر شے ایک نئے تناظر میں نظر آئے گی اور اس کے چھپے ہوئے مفاہیم ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ یہ عمل ہمیں سوچ کی غذا مہیا کرے گا اور ہمارے اندر کی اس "حیرت" کو جگائے گا جس کے بغیر ادب کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ اعصابی تناؤ کا شکار ہیں جو معاشرتی، نظریاتی اور اخلاقیاتی دباؤ کا نتیجہ ہے اور انسان کو ایک تنگ دائرے میں مقید رکھتا ہے۔ انشائیہ نگار جب انشائیہ لکھتا ہے تو خود بھی اس اعصابی تناؤ سے آزاد ہوتا ہے اور اپنے قاری کو بھی "آزاد" ہونے کی راہ دکھاتا ہے۔ "آزادہ روی" کا یہ عمل ہی انشائیہ کا محرک بھی ہے اور اس کا ثمر شیریں بھی۔ وہ لوگ جو بھاری بھرکم لبادوں میں ملبوس ہیں۔ جنہوں نے خود کو معاشرتی اور اخلاقیاتی پابندیوں میں کچھ زیادہ ہی محبوس کر رکھا ہے۔ وہ نہ تو انشائیہ لکھنے پر ہی قادر ہو سکتے ہیں اور نہ انہیں انشائیہ سے لطف اندوز ہونے کی سعادت ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسے لوگ جو ہمہ وقت اپنی دستار کو سنبھالنے کے شبھ کام پر مامور ہیں ان کے لئے جھک کر ٹانگوں میں سے منظر کو دیکھنا یا درخت پر چڑھ کر اس پر ایک نظر ڈالنا یا پھر ہر روز کے دیکھے بھالے کنارے کو چھوڑ کر دوسرے کنارے پر جا نکلنا ناقابل برداشت ہے۔ وجہ یہ کہ وہ "آزاد" نہیں ہیں۔ وہ دراصل اس اعصابی خوف میں مبتلا ہیں کہ زمانہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ اگر انہوں نے بنی بنائی کھائیوں سے باہر آنے کی کوشش کی تو زمانہ ان کا مذاق اڑائے گا یا انہیں سزا دے گا۔ لہٰذا وہ جسمانی اور ذہنی دونوں سطح پر ساری زندگی لکیر کے فقیر بن کر گزار دیتے ہیں۔ انشائیہ دراصل زنگ آلود

معاشرے پر سے زنگ کو کھرچنے کا نام ہے جس کے نتیجے میں لوگوں کو اپنے معمولات سے اوپر اٹھنے کی تحریک ملتی ہے اور عادت اور تکرار کے زندان سے باہر آنے کا موقعہ ملتا ہے۔

اس سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر میں اپنی اس ملاقات کا ذکر کروں جو پچھلے دنوں اردو کے ایک معروف مزاح نگار سے ہوئی۔ موصوف اس بات پر رنجیدہ تھے کہ ہم لوگوں نے انشائیہ کو ہنسنے ہنسانے کے عمل سے منقطع کر کے ایک سنجیدہ صنف بنا دیا ہے۔ کہنے لگے انشائیہ کی تحریک کو فروغ ملا تو میں بہت خوش تھا کہ اب ہم دکھوں سے اٹی ہوئی اس حیات مختصر میں ہنسنے ہنسانے کی کوئی صورت پیدا کریں گے لیکن انشائیہ تو ایک اور ہی پٹڑی پر دوڑنے لگا ہے۔ سچ جانئے مجھے انشائیہ کی اس روش نے بہت مایوس کیا ہے۔ میں نے بصد ادب عرض کیا کہ ہم لوگوں نے انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش کو کبھی ناپسند نہیں کیا تا ہم انشائیہ کے لئے طنز و مزاح کو ناگزیر بھی قرار نہیں دیا۔ یہ تو موضوع کی نوعیت اور لکھنے والے کے مزاج پر منحصر ہے کہ وہ انشائیہ میں طنز و مزاح کی آمیزش کس حد تک کرتا ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرے یا نہ کر سکے تو بھی انشائیہ کے معیار پر اس کا کوئی برا اثر مرتب نہیں ہوگا۔ میں نے مزید کہا کہ انشائیہ کا اولین مقصد مسرت مہیا کرنا ہے مگر مسرت سے مراد کسی خاص برانڈ کی مسرت نہیں ہے۔ مسرت مزیدار کھانے سے بھی مل سکتی ہے اور جنسی تسکین سے بھی، لطیفہ گوئی سے بھی اور حریف کو شکست دے کر بھی، ناہمواریوں کا احساس دلا کر بھی اور ناہمواریوں کے باب میں اغماض و درگزر سے کام لے کر بھی، مگر مسرت کے کچھ اعلیٰ مدارج بھی ہیں مثلاً محبت یا کائناتی شعور Consciousness یا عبادت یا جمالیاتی تجربہ یا وہ اچانک ابھر آنے والی کیفیت جسے Experience Peak کہا گیا ہے۔ یہ سب ایسی مسرت کے حصول پر منتج ہوئے ہیں جس کی کوئی نہایت نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ انشائیہ مسرت کے ان جملہ پہلوؤں اور مدارج پر محیط ہے اگر اسے محض طنز یا مزاح سے پھوٹنے والی ہنسی تک محدود کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے تحصیل مسرت کے دیگر جملہ امکانات کو مسترد کر دیا ہے۔

دراصل انشائیہ کو قہقہہ پیدا کرنے والی ایک مشین قرار دینے کے بجائے اس طور دیکھنا

چاہئے کہ اس کا کام ہمیں اس غنودگی کے عالم سے نجات دلانا ہے جو معمولات کی کھائیوں میں لگاتار سفر کرنے سے وجود میں آتی ہے۔ کولن ولسن نے اس سلسلے میں روبوٹ Robot کا ذکر کیا ہے جو کار کے ڈرائیونگ وہیل پر قبضہ جما کر ہمیں اونگھنے کی کھلی چھٹی دے دیتا ہے۔ گویا روبوٹ شخصیت کا وہ میکانکی پہلو ہے جو تمام وقت مصروف رہتا ہے تاکہ ہم سارا عرصہ نیم خوابی کے عالم میں پڑے رہیں۔ البتہ جب راستے میں اچانک کوئی خطرہ نمودار ہو جائے تو یہ روبوٹ جلدی سے سٹیرنگ وہیل ہمارے ہاتھوں میں تھما دیتا ہے تاکہ ہم خود ہی اس نئی صورت حال کا سامنا کریں اور ہم خطرے کو اچانک سامنے پا کر صدیوں کی غنودگی سے فی الفور نجات پا لیتے ہیں مگر عام زندگی میں ایسے جگا دینے والے واقعات کبھی کبھار ہی نمودار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم تمام کام روبوٹ کے سپرد کر کے خود ''یک گونہ بے خودی'' میں دن رات ڈوبے رہتے ہیں۔ انشائیہ کی اہمیت اس بات میں ہے کہ وہ ہمیں اس ''مقدس اونگھ'' سے بیدار کرتا ہے۔ وہ تمام باتیں جنہیں ہم نے معمول کے عین مطابق قرار دے کر گویا تسلیم کر لیا تھا، انشائیہ ان کا دوسرا رخ دکھا کر ہمیں اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ جگا دیتا ہے اور ہمیں اس نئی صورت واقعہ سے نبرد آزما ہو کر ایسی انوکھی مسرت حاصل ہوتی ہے جو اکثر دل میں اور کبھی کبھی دل کے ساغر سے چھلک کر ایک لطیف سے تبسم کی صورت ہونٹوں پر جگمگانے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بات، شے، عقیدہ، خیال یا منظر کے ''دوسرے رخ'' سے آشنا ہونا نفسیاتی سطح کا ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ انشائیہ کی کامیابی اس بات میں ہے کہ وہ آپ کو دوسرے رخ سے آشنا کر کے بیدار کرتا ہے جس کے نتیجے میں آپ کو ایک مسرت انگریز روشنی ملتی ہے اور زندہ رہنے کی خواہش جو معمولات کی زد میں آنے کے باعث سو گئی تھی از سر نو جاگ اٹھتی ہے اور آپ زندگی کے چھوٹے چھوٹے افعال و اعمال میں ایک بچے کی سی حیرت اور مسرت کے ساتھ دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ تاہم اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انشائیہ نگار یہ سارا کام ایک تخلیقی اسلوب میں سر انجام دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ نگار محض مظاہر کے پامال اور پیش پا افتادہ پہلوؤں ہی سے منہ موڑتا وہ اسلوب کی پٹی ہوئی اور پامال صورت کو بھی مسترد کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ انشائیہ کو اخباری،

میکانکی یا جواب مضمون قسم کی نثر میں لکھا جائے گا تو وہ دلوں کو مس کرنے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اصلاً انشائیہ ادب کے زمرے میں شامل ہے اور اس اعتبار سے ایک تو وہ تخلیقی اسلوب اختیار کرنے کا پابند ہے دوسرے خیال کو منطق سے کہیں زیادہ متخیلہ کی مدد سے کھولتے چلے جانے کا قائل ہے۔ اسی لئے انشائیہ نگار کبھی اس طرح سنجیدہ دکھائی نہیں دیتا جیسے ایک مضمون نگار۔ وہ انشائیہ میں ایک طرح کی ذہنی بشاشت کو سدا زیر سطح قائم رکھتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اس نے اگر اپنے موقف کو انتہائی سنجیدہ بحث و تکرار کی صورت دے دی تو انشائیہ مضمون میں ڈھل جائے گا اور اس زاویہ نگاہ سے محروم ہو جائے گا جو مسائل کے مدو جزر کو بلندی پر سے دیکھنے کے نتیجے میں نمودار ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ خالص طنز یا مزاح نگار قاری کو معاشرے یا فرد کی ناہمواریوں سے لطف اندوز ہونے کے مواقع فراہم کر کے اس کے ہاں زہر خند یا بے ریا ہنسی کو تحریک دیتا ہے جبکہ انشائیہ نگار کا مقصود ناہمواریوں کو نشان زد کرنے کے بجائے خیال یا شے کے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہوتا ہے تاکہ شعور کی توسیع کا اہتمام ہو سکے۔ لہٰذا اگر وہ طنز و مزاح کو بروئے کار لاتا ہے تو اس کا اوّلین مقصد انشائیہ کو قابل مطالعہ بنانا ہوتا ہے۔

آخر میں محض ایک اور بات کا ذکر کروں گا وہ یہ کہ انشائیہ ایک ایسی غیر افسانوی صنف نثر ہے جو قاری کو بیک وقت فکری لطف اندوزی، جسمانی تسکین اور جمالیاتی حظ مہیا کرنے پر قادر ہے۔ اسی لیے میں اسے امتزاجی صنف کا نام دیتا ہوں جس میں کہانی کا مزہ، شعری لطافت اور سفر نامے کا فکری تحریک یکجا ہو گئے ہیں۔ تاہم انشائیہ محض ان اوصاف کی ''حاصل جمع'' کا نام نہیں ہے۔ وہ ان سب کو اپنے اندر جذب کر کے خود ایک ایسی اکائی بن کر نمودار ہوتا ہے جس کی انفرادیت ان جملہ اوصاف کی حاصل جمع سے کچھ ''زیادہ'' ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے انشائیہ کا ایک اپنا سٹرکچرنگ Structuting کے عمل کو بروئے کار لا کر سدا نئے امکانات کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔

ہمارے ہاں بعض اصناف ادب پر دیگر فنون کی یلغار صاف محسوس ہو رہی ہے مثلاً شاعری پر موسیقی کی اور کہانی پر فلم کی لیکن انشائیہ وہ واحد صنف ہے جو اپنی انفرادیت کو برقرار

رکھے ہوئے ہے۔ اس میں اختصار کا دامن وسیع ہے اور خود اس کے اندر مکانات کا یہ عالم ہے کہ اسے کسی اور فنِ لطیف کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آنے والی صدیوں میں انشائیہ وہ واحد صنف نثر ہے جو اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوگی اور اپنی ہیئت اور مواد دونوں میں ایجاز واختصار کو ملحوظ رکھنے کے باعث آنے والی تیز رفتار صدیوں کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے میں کامیاب ہوگی۔ اپنے انشائیہ Going on a Journey میں ہیزلٹ نے ایک جگہ لکھا ہے۔

> Give me a Clear Blue Sky over my head
> a green turf Beneath my feet, a winding.
> Rofd before me and three hour's march
> to dinner and then to thinking.

یہی انشائیہ نگار کا اصل منصب بھی ہے کہ وہ شاہراہ سے اپنے لئے ایک پگڈنڈی نکالتا ہے۔ پھر اس پر اکیلا، زمین کی سبزی اور آسمان کی نیلاہٹ کے عین درمیان، سیر کرتا ہے۔ پھر رات کے کھانے سے لطف اندوز ہوتا ہے اور کھانے کے بعد وہ سوچ کے اس لامتناہی سلسلہ سے متعارف ہوتا ہے جو ازل اور ابد کے درمیان ایک سنہری زنجیر کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا انشائیہ نگار بیک وقت ایک فن کار بھی ہے، دنیا دار بھی اور صوفی یا مفکر بھی! وہ پگڈنڈی پر سفر کرتے ہوئے جمالیاتی حظ حاصل کرتا ہے تو ساتھ ہی رات کے کھانے سے لطف اندوز ہونے کو بھی ضروری سمجھتا ہے مگر کھانے کے بعد لطیفہ گوئی میں وقت صرف کرنے کے بجائے سوچ کی تازگی میں جذب ہو جاتا ہے گویا وہ بیک وقت جمالیاتی تسکین (Aesthetic Satisfaction) بھی حاصل کرتا ہے، جسمانی لذت (Physical Pleasure) بھی اور ذہنی یا عارفانہ تسکین (Intellectual Satisfaction) بھی! اگر کوئی صنف انسان کو بیک وقت ان تینوں سطحوں پر مسرت مہیا کرنے پر قادر ہو تو اس سے بڑی صنف ادب اور کون سی ہوسکتی ہے؟

□□□

احمد حسین آزاد

اُردو انشائیے کا ارتقائی سفر

صنف انشائیہ کے خط وخال کے تعین اور اس کی حد بندی کے بعد ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس صنف کے سفر کا آغاز کہاں سے کیسے، اور کب ہوا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے، جس کا جواب ڈاکٹر اختر اورینوی نے سید علی اکبر قاصد کی انشائی تصنیف "ترنگ" کے تعارف، پروفیسر سید احتشام حسین نے "افکار ومسائل" ڈاکٹر سلام سندیلوی نے "ادب کا تنقیدی مطالعہ" اطہر پرویز نے "ادب کا مطالعہ" ڈاکٹر وحید قریشی نے "اُردو کا بہترین انشائی ادب" ڈاکٹر آدم شیخ نے "انشائیہ" سید ضمیر حسن نے "دِلّی سے دلی تک" سید صفی مرتضیٰ نے "اُردو انشائیہ" سید ظہیر مدنی نے "اُردو ایسز" اور نظیر صدیقی نے "شہرت کی خاطر" میں اپنے اپنے طور پر دینے کی کوشش کی ہے۔ اور ایک دو کے علاوہ سب نے اُردو انشائیہ کا رشتہ مغربی ادب سے جوڑا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس صنف نے سفر کا آغاز 1571ء میں فرانس سے کیا اور "کیسے" کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ فرانسیسی ادیب مانٹین نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرصت کے لمحات گزارنے اور جی بہلانے کے لئے طے کیا کہ اپنے تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں اپنی عقل وفراست اور ذہن کی رسائی کا امتحان لیا جائے۔ چنانچہ اس نے 1569ء یا 1571ء سے مختلف عناوین کے تحت اپنے غیر مربوط خیالات کو قلم برداشتہ کوشش (Essai) کے نام سے صفحۂ قرطاس پر جمع کرنا شروع کیا۔ اس کے Essais کا پہلا مجموعہ 1580ء میں اور تیسرا اور آخری مجموعہ 1588ء میں شائع ہوا۔ جو ادبی حلقے میں بنظر استحسان دیکھا گیا۔ مانٹین کے قلم برداشتہ لکھے ہوئے ان ہی تاثرات نے آگے چل کر Essay اور انشائیہ کا نام پایا۔ لیکن باوجود اس کے کہ اُردو انشائیہ مغربی علوم یا Essays کا

مرہون منت ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ اس صنف کا سفری آغاز فرانسیسی ادیب مانٹین کے اتفاقی "Essais" سے ہوا کیونکہ مانٹین کے قلم برداشتہ لکھے ہوئے انشائی ادب پارے انشائیہ کے بہترین نمونے ہیں۔ ادب کی ارتقائی تاریخ میں اصناف ادب کا کوئی ''امریکہ'' ایسا نہیں ملتا جو ادبی دنیا کے کسی کولمبس کو اتفاقیہ ہاتھ آ گیا ہو۔ پھر انشائیہ کا امریکہ مانٹین کو اچانک کیونکر مل گیا۔ مانٹین کے انشائیوں کے پیچھے دوسرے انشائی عوامل نہ ہوتے اور انشائیہ کی صنف مانٹین کے قلم کا اتفاقی نتیجہ ہوتی تو انگریزی ادیب بیکن (Bacon) مانٹین کے انشائیوں کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر اپنے انشائیوں میں فلسفیانہ خیالات کو جگہ نہ دیتا بلکہ مانٹین کی طرح وہ بھی اپنے انشائیے آتشدان کے پاس آرام کرسی پر لیٹے لیٹے لکھتا اور انشائیوں میں اتنا تنوع بھی نہیں پایا جاتا، جو آج دیکھنے کو ملتا ہے۔

اس بناء پر مانٹین کو انشائیہ کا موجد تسلیم کرنے سے پہلے جب ہم قدیم ترین عالمی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انشائیہ کے خام مواد چین، عرب، ایران اور ہندوستان وغیرہ ممالک کی مختلف نثری تحریروں میں ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں عربی کے مکاتیب، مقامات اور توقیعات اور فارسی زبان کی قابوس نامہ، مقامات حمیدی، گلستان اور ملاوجہی کی ''سب رس'' (اُردو) وغیرہ تصنیفات قابل ذکر ہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ انشائیہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسانی ارتقاء کی تاریخ تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق درج ذیل اقتباسات سے بھی ہوتی ہے۔:

(۱)

''دنیا کا قدیم ترین انشائی ادب وہ تھا، جس کی تخلیق حضرت آدم نے حوا سے اظہار محبت کرتے ہوئے کی تھی۔ اس زمانے سے لے کر آج تک انسانی ذہن کی یہ ترنگ جاری ہے اور انشائی ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ دنیا کا دوسرا انشائی ادب پارہ بھی خوش قسمتی سے حضرت آدم ہی کے حصے میں آیا۔ قابیل اور ہابیل کے اختلاف نے قابیل کو کامیابی سے ہمکنار کیا، اور ہابیل کو گور سے۔ اس فعل پر آدم مرثیہ خواں ہوئے

اور انشائی ادب کا دوسرا نمونہ عالم وجود میں آیا۔ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ یہ ادب پارہ منظوم تھا لیکن میری دانست میں یہ منثور تھا۔''

(اُردو کا بہترین انشائی ادب مرتبہ، ڈاکٹر وحید قریشی)

(۲)

"Great Essays of all Nations" کے مرتب ایف۔ ایچ۔ پریچرڈ مانٹین کو اس صنف (انشائیہ) کا موجد نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک Essay ادب کی قدیم ترین اصناف میں سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے مذکورہ بالا کتاب میں دنیا کی 26 زبانوں کے ادب سے جو Essays انتخاب ہیں ان کے پیش نظر اس کا یہ دعویٰ غلط نہیں، جہاں Serious Essays کے ابتدائی نمونے افلاطون، ارسطو کی تحریروں میں ملتے ہیں، وہاں Light Essays کے نمونے ارسطو کے معاصر و مقلد تھیو فاسٹس (TheoPhastus) کے خاکوں (Characters) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔'' (شہرت کی خاطر، از نظیر صدیقی)

اس بیان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انشائی ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے اور انشائیہ کے سفر کا آغاز انسانی ارتقاء کی ابتدائی تاریخ سے ہوتی ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انشائیہ کو ادب کی ایک صنف قرار دینے میں مانٹین کے Essais کو بڑا دخل ہے۔ صنف کی حیثیت سے انشائیہ پر توجہ "Essais" کے سبب دی گئی۔ اس لحاظ سے جو لوگ انشائیہ کا موجد مانٹین کو مانتے ہیں وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن جو لوگ انشائیہ کے سفر کا آغاز مانٹین کے Essais سے بتاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔

چونکہ اُردو انشائیہ کے فکری ورثے اور روایتوں پر عربی، فارسی، فرانسیسی اور انگریزی کی انشائیہ نما تحریروں اور انشائیے کے اثرات نمایاں ہیں اور ان زبانوں کے انشائی ادب کی بنیاد پر اُردو انشائیہ کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے اس لئے ان زبانوں کے انشائی ادب کا سرسری مطالعہ بھی ضروری ہے۔

عربی اور فارسی ادبیات میں انشائی ادب کے نمونے تو نہیں ملتے، البتہ انشائیہ نما تحریروں کا سراغ عہد قدیم سے ملتا ہے۔ احمد حسن زیات نے لکھا ہے کہ:

''عربی فرماں روا فطری طور پر انشا پرداز واقع ہوتے تھے وہ جو مضمون چاہتے، مختصر پیرایہ اور شستہ و سلیس عبارت میں ادا کرتے یا خود لکھ دیا کرتے تھے۔''

اسی طرح خلفاء یا حاکموں اور امیروں کی ''توقیعات'' اپنے اختصار، جامعیت، حسن، زور بیان کی وجہ سے انشائیہ سے بہت مشابہ ہوتی تھیں۔ خلیفہ ہارون رشید نے جعفر ابن یحییٰ کی سرزنش کرتے ہوئے یہ توقیع لکھی تھی:

''وفا شعاری نے اسے اگایا، بڑھاپا اور نافرمانی نے اسے کاٹ دیا۔''

توقیعات اور مکاتیب کے علاوہ مقامات بدیع الزماں ہمدانی اور مقالات حریری جیسی کتابوں میں بھی انشائی ادب پارے کا سراغ ملتا ہے۔ عبدالحمید بن یحییٰ حافظ اور ابن المقفع جیسے عربی کے مشہور انشاء پرداز گزرے ہیں۔ جب عربوں کے تعلقات ایران سے بڑھے، عربی نثر نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور اس وقت کے نثاروں نے اختصار پسندی، جامعیت، شستگی اور سادگی کے بل بوتے پر اپنی تحریروں کو نیا رنگ و آہنگ بخشا۔

اسی طرح فارسی ادب میں ہمیں قابوس وشمگیر کے پوتے کیکاؤس کا لکھا ہوا ''قابوس نامہ''، قاضی حمید الدین کی ''مقامات حمیدی'' اور ملا ظہوری کی ''سہ نثر'' ایسے ادب پارے ملتے ہیں، جن کا اثر بعد کی فارسی اور اُردو انشائیہ نگاری پر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ گلستان سعدی کے چھوٹے چھوٹے ادب پارے کو مانٹین اور بیکن کے مضامین پر فوقیت دیا جا سکتا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے جو ''چہار مقالہ'' لکھا ہے اس میں بعض فقرے انشائی ادب کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں اور کچھ ایسے انشاء پردازوں کے نام بھی اس میں گنائے گئے ہیں جن کی تحریریں بجا طور اپنے اختصار جامعیت اور سادگی کے لحاظ سے انشائی نمونے کے طور پیش کی جا سکتی ہیں۔

اوپر ہم کہہ چکے ہیں کہ انشائی ادب ایک صنف کی حیثیت سے نہ تو عربی ادب میں

روشناس ہے اور نہ فارسی ادب میں۔ لیکن عربی اور فارسی مکاتیب، توقیعات، مقالات اور مقامات کے مطالعہ سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ عربی اور فارسی زبان میں جو انشائی ادب پارے ملتے ہیں، وہ انگریزی کے بعض مضمون نگاروں کے ادب پارے پر ترجیح دیئے جانے کے قابل ہیں۔

اس کے بعد ہماری نظر فرانسیسی ادب کی طرف جاتی ہے۔ مانٹین فرانس ہی کا ادیب تھا، جس کی تحریروں نے انشائیہ کو ایک صنف کی حیثیت سے روشناس کیا۔ جدید عالمی ادب میں انشائیہ نگاری کی تاریخ اسی فرانسیسی ادیب مانٹین سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے انشائیے اس کی شخصیت کا مکمل عکس پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اس کا یہ قول دہرا دینا بے موقع نہ ہوگا۔

''ساری دنیا مجھ کو میری تصنیف سے پہچان سکتی ہے اور میرے ذریعہ میری کتاب سے واقف ہو سکتی ہے۔''

مانٹین کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے اس نے یہ تحریریں آتشدان کے پاس کسی آرام دہ کرسی پر لیٹے لیٹے لکھا ہو اور ہم اس کی دلچسپ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ مانٹین کے ایک انشائیہ ''خوف کی بات'' کا ایک پیراگراف ملاحظہ فرمایئے:

''لوگوں کا یہ کہنا کہ میں انسانی فطرت کا ماہر ہوں، صحیح نہیں۔ میں یہی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کس پراسرار راستے سے ہمارے اندر خوف کی لہر پیدا ہوتی ہے۔ بہر نوع اس کا محرک کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ خوف ایک عجیب و غریب کیفیت ہے، اتنی عجیب کہ بعض حکماء یہ کہنے پر مجبور ہو گئے، کہ خوف جس سرعت سے ہمارے فیصلوں کو بدلتا ہے، کوئی دوسرا تیزی کے ساتھ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یہ خیال یقیناً صحیح ہے، اس لئے کہ میں خود اکثر اس جذبے سے مغلوب ہو کر ایک ہیجانی کیفیت کا شکار رہا ہوں۔ اور میرا خیال ہے کہ انتہائی مستقل مزاج افراد بھی جب اس جذبے سے دوچار ہوتے ہیں تو وہ شدید استعجاب اور ذہنی

> انتشار سے محفوظ نہیں رہتے ۔ میں اس سوقیانہ قسم کے خوف اور ہیبت کو
> نظر انداز کرتا ہوں ۔ جس کا محرک کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے، جیسے آنجہانی
> اجداد میں کسی کا کفن پوش حالت میں قبر سے نکلنا یا پھر بھوتوں اور آگ
> اگلنے والے اژدہوں کا نمودار ہونا یا کوئی بھیانک خواب ۔"

(ادب کا مطالعہ: از اطہر پرویز)

دنیا کی مختلف زبانوں میں انشائی نمونے صرف ادب پاروں کی شکل میں موجود تھے۔ لیکن انگریزی نثر نگاروں نے انشائیہ کو نثر کی ایک علٰحدہ صنف کی حیثیت سے دنیائے ادب سے روشناس کیا اور بیکن ، ایڈیسن، اسٹیل، لیمب ، ہیزلٹ، جانسن ، گولڈ اسمتھ ، چسٹرٹن، گارڈنر وغیرہ نے بہترین انشائیے لکھے ۔ اُردو انشائیہ نگاروں نے انگریزی کے ان انشائیوں سے استفادہ کیا۔ فرانسیسی ادیب مانٹین کے انتقال کے سترہ سال بعد انگریزی کے امام بیکن نے اس طرز کو اختیار کیا اور اپنے انشائیوں کو افکار پریشاں (Dispersed Meditation) سے موسوم کیا۔ مانٹین کے ساتھ بیکن کے انشائیے کی روح بھی درس اخلاق اور تنقید حیات ہے۔ مانٹین اور بیکن کے انشائیوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مانٹین کے بر خلاف بیکن کے انشائیے دل سے زیادہ عقل کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیکن ایک فلسفی تھا۔ فلسفہ کی جھلکیاں اس کے انشائیے میں بھی ملتی ہیں۔ بیکن کے انشائیے اپنے انداز بیان اور اخلاق آموز ہونے کے سبب بیحد پسند کیے گئے۔ اس کے انشائیہ "مطالعہ" کا اقتباس نمونۃً درج ذیل ہے:

> "مطالعہ مسرت، حسن اور قابلیت کا ضامن ہے۔ مسرت تو ہمیں
> نجی طور پر حاصل ہوتی ہے۔ مگر حسن مطالعہ کا انداز ہمیں گفتگو کے دوران
> میں ہوتا ہے اور قابلیت کا امتحان کاروباری زندگی کے متعلق فیصلوں
> میں ۔ کیونکہ مشاق عملی طور پر زیادہ کامیاب ہوسکتے ہیں ۔ لیکن ان
> معاملات پر صحیح رائیں اہل علم ہی دے سکتے ہیں۔ مطالعہ میں ضرورت
> سے زیادہ وقت صرف کرنا محض تساہل ہے اور محض آرائش بیان کے لئے

> اس کا استعمال تکلف اور محض اصولوں کی بناء پر رائے زنی علماء کا مزاج
> ہے۔ مطالعہ سے ہمارے اندر ایک قسم کی پختگی آتی ہے اور تجربے سے
> تکمیل ہوتی ہے کیوں کہ ہماری فطری صلاحیتیں ایسے خودرو پودوں کی
> طرح ہیں جن کی کاٹ چھانٹ لازمی ہے اور مطالعہ زیادہ حد تک اسی
> سمت میں کامیابی کی دلیل ہے۔" (ادب کا مطالعہ: از اطہر پرویز)

بیکن انگریزی انشائیہ کا بانی ہے۔ لیکن اس صنف کو مقبول عام بنانے کے سلسلہ میں ولیم کارن والس 1660ء اور ابراہم کاولی 1668ء کا نام زیادہ قابل ذکر ہے۔ کیوں کہ بیکن کے برخلاف ان دونوں کے انشائیے مانٹین کے انشائیے سے زیادہ قریب ہیں۔ دور اصلاح (1660ء تا 1700ء) کے انشائیہ نگاروں میں ولیم کارن والس اور ابراہم کاولی (I.Coveley) کے علاوہ سرٹامس براؤن اور ڈرائڈن کے نام بھی قابل ذکر ہیں، جو اچھے انشائیہ نگار تھے۔ براؤن نے اپنے اعلیٰ خیالات کو موزوں اور شیریں الفاظ کے قالب میں ڈھال کر انشاء پردازی کو ایک نیا رخ دیا اور ڈرائڈن نے پر تکلف اور مصنوعی نثر کی جگہ سادہ، رواں اور فکر انگیز نثر کو رواج دیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب ٹیٹلر (Tateler) اور اسپکٹیٹر (Spectator) جیسے اخبار کا اجراء عمل میں آیا تو ان کے ذریعہ انشائیہ نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔ ان دو اخباروں سے ایڈیسن اور اسٹیل جیسے عظیم انشائیہ نگاروں کے نام وابستہ ہیں۔ اسٹیل کے انشائیوں میں کھلی ہوئی بیباکی، کشادہ دلی کے ساتھ انسان دوستی کے عناصر نمایاں ہیں۔ جبکہ ایڈیسن کے اخلاقی انشائیوں میں ظرافت بطور روح کار فرما ہے۔ مجموعی اعتبار سے ایڈیسن ایک خوش مزاج محتسب اور بہترین فن کار ہے۔

اسٹیل اور ایڈیسن کے نقش قدم پر چلنے والوں میں ڈاکٹر جانسن اور گولڈ اسمتھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کے انشائیے صحیح معنوں میں اس کے جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کے انداز بیان میں تازگی اور بے تکلفی کے عناصر نمایاں ہیں اور اس کا انداز نگارش، "جانسنی اسلوب" کے نام سے مشہور ہے۔ گولڈ اسمتھ کے انشائیوں میں بیباکی اور

جدت اور اس کے ظریفانہ اسلوب میں بڑی دل کشی پائی جاتی ہے۔ ولیم ہیزلٹ بھی اس صدی کا ایک ممتاز انشائیہ نگار ہے جو موقع محل دیکھ کر الفاظ کا مصرف لیتا ہے اور دوسرے ادیبوں کے فقرے حوالہ کے طور کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ اس کی تحریروں میں جوش واشتعال انگریزی ملتی ہے۔ غرضیکہ انگلستان میں اٹھارہویں صدی کا ادب بیشتر اخلاقی اور افادی خطوط پر تخلیق کیا گیا تھا۔ جس کی تصدیق پروفیسر احتشام حسین کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

"انشائیہ میں ایک حد تک مقصدیت بھی اسی عہد میں نمایاں ہوئی۔ گو یہ مقصدیت فنی شعور کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریس اور اخبارات کے عام ہونے کے ساتھ ساتھ صنعتی دور کے آغاز نے زندگی کے متعلق غور وفکر کا انداز بھی بدل دیا تھا اور دوسرے اصناف ادب کی طرح انشائیہ بھی وقت کے تقاضوں کا ساتھ دے رہا تھا۔"
(افکار ومسائل: مصنف سید احتشام حسین)

انیسویں صدی دراصل ناول نگاری کی ترقی کا عہد مانا جاتا ہے اور انشائیہ نگاری کی کساد بازاری کا زمانہ۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ناول نے انشائیہ کے طنز وظرافت، تخیل پردازی اور شگفتہ بیانی جیسے عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا۔ پھر بھی اس عہد میں چارلس لیمب اور اسٹیونسن جیسے ممتاز انشائیہ نگار موجود تھے۔ چارلس لیمب (1775ء تا 1834ء) کے انشائیے دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں اور اس کے انشائیوں میں اس کی شخصی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ چارلس لیمب کے ایک خوبصورت انشائیہ "کنوارے کی شکایت" کا ایک اقتباس بطور نمونہ درج ذیل ہے:

"یکا وتنہا فرد کی حیثیت سے میرے وقت کا بیشتر حصہ شادی شدہ لوگوں کی ان کمزوریوں کے مشاہدے میں صرف ہوا ہے جو میرے اس طرح کنوارانہ رہنے پر شاید میری تسکین دل کا بھی باعث ہوتیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مردوں اور ان کی بیویوں کے جھگڑوں کا میرے اوپر کوئی اثر ہوا۔ لیکن شادی شدہ لوگوں کے گھر میں مجھے جس بات کا

سب سے زیادہ رنج ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنی محبت کا شدید طور پر اظہار کرتے...... اپنے کو دنیا سے الگ تصور کر کے ایک دوسرے کی دنیا میں کھو جانے کا مقصد ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔ شادی دراصل ایک قسم کی اختیار کلی ہے جو ہمارے لئے کم دل شکن نہیں۔ اس حق خود اختیاری کا مقصد تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ شادی شدہ جوڑے کنواروں کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں اپنے حق وحصہ کی ترغیب نہ دیتے۔ لیکن یہ لوگ خواہ مخواہ اپنی حرکتوں سے ہمیں چھیڑنے پر آمادہ دیتے۔ لیکن یہ لوگ خواہ مخواہ اپنی حرکتوں سے ہمیں چھیڑنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔" (ادب کا مطالعہ: از اطہر پرویز)

اسٹیونسن (1850ء تا 1894ء) کی ذہانت ہمہ گیر تھی اور الفاظ کے استعمال سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے انشائیوں میں اس کی واعظانہ اور معلمانہ شخصیت کا اظہار ہوا ہے۔

جس طرح عربی، فارسی، چینی، عبرانی، فرانسیسی اور انگریزی وغیرہ زبانوں کے قدیم ترین ادب میں ہمیں انشائی ادب کے کچھ ایسے نمونوں کا سراغ ملتا ہے۔ جو آگے چل کر انشائیہ کو ایک صنف کی حیثیت بخشنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اُردو کے قدیم ترین ادب میں بھی ہمیں کچھ انشائی نمونے ملتے ہیں۔ جن کی روشنی میں اُردو، انشائیہ نے ایک صنف کی حیثیت اختیار کر کے اُردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔ ملا وجہی کی "سب رس" رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" "غالب کے خطوط" میر امن کی "باغ و بہار" عطا حسین خاں "نوطرز مرصع" سید انشاء کی وہ کتاب، جس میں انہوں نے رانی کیتکی کا قصہ ٹھری ہندی میں لکھا ہے اور "طلسم ہوشربا" وغیرہ ایسی ہی کتابیں ہیں، جن میں انشائیہ کے خام مواد ملتے ہیں اور جو انشائیہ کی ارتقائی تاریخ کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ عرب وایران اور مغربی ادبیات کے توسط سے اُردو ادب صنف انشائیہ سے روشناس ہوا۔ لیکن عربی اور فارسی ادبیات میں انشائیہ اب تک ایک صنف کی حیثیت سے روشناس ہو چکا ہے۔ اس بنا پر اُردو انشائیہ کا سرچشمہ مغربی ادبیات ہی قرار پاتا ہے۔ مگر

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُردو انشائیہ کی جڑیں مغربی ماحول میں پیوست ہیں۔ اُردو ادب میں انشائیہ کا ارتقاء اپنے انداز سے ہوا۔ اُردو انشائیہ نے مغربی انشائیوں کے چراغ سے چراغ ضرور جلائے۔ لیکن اس کے اپنے مزاج میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اُردو ادب نے انگریزی انشائیوں سے خوشہ چینی کرنے کے باوجود اپنا رنگ و آہنگ باقی رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی انشائیوں کے مقابلے میں اُردو انشائیہ کچھ اور ہی شئے معلوم ہوتا ہے۔ اس موقع پر اس کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نہ تو انگریزی انشائیوں میں اس کی وضاحت ہے اور نہ یکسانیت ہے اور نہ اُردو انشائیوں میں انگریزی انشائیہ نگاروں کی طرح یکسانیت ہے۔ اُردو انشائیہ نگاروں کے انشائیے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں جو انشائیہ کے تنوع کی علامت ہیں۔ اور اُردو انشائیہ نگاری کے باب میں جو نام بھی ہمیں ملتے ہیں۔ ان میں سے کوئی نام بھی صحیح معنوں میں ایسا نہیں جو انشائیہ نگاری کے لئے مخصوص ہو۔

1800ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اُردو نثر کی دنیا نے اپنی توجہ کو مغرب کی تقلید میں سادہ طرزِ نگارش کی طرف مبذول کیا اور تقریباً پچاس نثری کارنامے ادیبوں کی مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں منظرِ عام پر آئے جس کا زیادہ حصہ افسانوی ادب پر مشتمل ہے۔ پھر جب فورٹ ولیم کالج 1825ء میں دلی کالج کی شکل میں نمودار ہوا جس کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزی زبان و ادب سے روشناس کرانا تھا تو اس کالج سے سینکڑوں طلباء نے استفادہ کیا۔ جن میں سے کچھ نے آگے چل کر اُردو ادب کی پرورش و پرداخت میں نمایاں حصہ لیا اور ناول نگاری و مقالہ نگاری کا چلن عام ہو گیا۔

اُردو میں مقالہ نگاری کا آغاز 1845ء کے آس پاس ہو چکا تھا۔ مگر اس کی مقبولیت کا عہد 1857ء کے سیاسی انقلاب کے بعد سے شروع ہوا۔ مقالہ نگاری کا رواج عام کرنے کے لئے مقالہ نگاری کے مقابلے کا بھی اہتمام ہوا اور دلی کالج کی طرف سے امتحانی پرچوں میں سے ایک پرچہ میں مقالہ نگاری کو داخل بھی کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ماسٹر رام چندر کے ''فوائد الناظرین'' اور ''محبِ وطن'' جیسے رسالوں کے اجراء اور انجمن دہلی سوسائٹی کے قیام نے ماسٹر رام چندر، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، خواجہ ضیاء الدین، بھگوان داس، ماسٹر

پیارے لال اور موتی لال وغیرہ اُردو دوستوں کے ذریعہ مقالہ نگاری کو فروغ دیا۔ یہاں تک کہ غدر کے سیاسی انقلاب کے بعد کچھ جرأت مند ہندوستانیوں کو تعمیرِ نو کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے دلی کالج کی بناء کردہ مقالہ نگاری کا سہارا لیا۔ جب سرسید احمد خاں نے 1870ء میں انگلینڈ سے واپسی کے بعد اپنا رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا تو اس رسالہ کے ذریعہ مقالہ نگاری کا زور بڑھا اور اُردو انشائیہ کی داغ بیل پڑی۔ ''تہذیب الاخلاق'' کے لکھنے والوں میں سرسید کے علاوہ حالی، ذکاء اللہ، محسن الملک اور وقار الملک کے اسماء قابلِ ذکر ہیں۔ اس زمانے میں سرسید، حالی، ذکاء اللہ اور محمد حسین آزاد نے ایک دو انشائیے بھی لکھے۔ یہ انشائیے اصطلاحی طور پر مکمل انشائیے تو نہیں کہے جا سکتے کیونکہ سنجیدگی کے ساتھ ان میں ناصحانہ انداز ہے جو صنف انشائیہ کے منافی ہے۔ لیکن لطائف، طنز و مزاح کے ساتھ اندازِ بیان کا بے ساختہ پن ان کو انشائیے سے بہت قریب کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں سرسید کا ''بحث و تکرار'' اور ''امید کی خوشی'' مولانا حالی کا ''زبانِ گویا'' اور مولانا ذکاء اللہ کا ''آگ'' اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان بزرگوں کے مقالوں کے درمیان یہی انشائیہ ہیں جن کی بنیاد پر بعض نقاد ان کو اردو انشائیہ نگاری کے اولین فنکار کہنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

محمد حسین آزاد نے ''نیرنگ خیال'' کے خیالی مضامین میں انشاء پردازی کا کمال دکھلایا ہے اور بعض مضامین انشائیہ کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ''نیرنگ خیال'' کے تمثیلی اور خارجی رنگ کے باوجود آزاد کا شخصی انداز اور دل کی بات کہنے کی تڑپ انہیں انشا پردازوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ اگر غالب کے یہاں سرتا سر داخلیت نہ ہوتی تو وہ بہترین انشائیہ نگار کہے جاتے۔ غالب کے بعد ہی سرسید نے اُردو نثر کو نئی راہوں سے آشنا کیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید نے جو ''بحث و تکرار'' اور ''امید کی خوشی'' کے ذریعہ انشائیہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ ان کی تقلید میں حالی، ذکاء اللہ، محمد حسین آزاد، نذیر احمد اور کچھ عرصے بعد فرحت اللہ بیگ نے بھی انشائیے لکھے۔ نذیر احمد کا ''کفایت شعاری'' اور فرحت اللہ بیگ کا ''نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی'' قابلِ ذکر انشائیہ ہے۔ لیکن ان

سب کے اسلوب میں دل کشی اور صفائی کے باوجود ناصحانہ انداز نمایاں ہے۔

جب 1877ء میں منشی سجاد حسین نے ''اودھ پنچ'' اخبار جاری کیا تو اس کے سہارے انشاء پردازی میں ظرافت ومزاح نے جگہ پائی۔ اس زمانہ کے انشاء پردازوں میں عبدالحلیم شرر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ شرر کا طریقہ اظہار شاعری کی طرف مائل تھا۔ انہوں نے معمولی موضوعات پر جو کچھ لکھے ہیں، وہ خوب ہیں اور انشاء پردازی کے اچھے نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ جب 1912ء میں ابوالکلام آزاد کی ادارت میں ''الہلال'' کا اجراء عمل میں آیا اور ابوالکلامی اسلوب نے رواج پایا تو سیاسی موضوعات بھی انشایئے کا عنوان بن گئے۔ اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم کی قیادت میں پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج اور فرحت اللہ بیگ جیسے انشاء پردازوں نے سترہویں صدی کے انگریز کردار نگاروں کی طرح اُردو میں ظرافت نگاری کے ساتھ کردار نگاری کو بھی فروغ دیا۔ لیکن کردار نگاری انشایئے کا جزو نہیں ہے اس لئے ان کے انشایئے اُردو انشائیہ کی ارتقائی تاریخ کو آگے ضرور بڑھاتے ہیں لیکن وہ انشائیہ کے اعلیٰ نمونے نہیں کہے جاسکتے۔ ان کے انشائیوں میں ظرافت کا پہلو نمایاں ہے۔ ناصر علی، نذیر احمد اور نیاز فتحپوری نے فطری منظر کشی کے ذریعہ ایک نئے رجحان کو جنم دیا۔ اس کے ساتھ ہی ادب لطیف یا ٹیگوریت کا رواج ہوا۔

انیسویں صدی ناول نگاری کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن بیسویں صدی نے شرر، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور وغیرہ انشاء پردازوں کو جنم دیا۔ ان میں سے اکثر مزاح نگار ہیں یا طنز نگار۔ اس کے باوجود ان لوگوں کی ادبی کاوشوں میں انشائیہ کا عنصر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ رشید احمد صدیقی، پطرس اور کپور تو اُردو انشائیہ نگاری کے بہترین رہنما ہیں۔ اس کے بعد نئے لکھنے والوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی اور احمد جمال پاشا کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان تینوں میں اول الذکر دو نام انشائیہ کے لئے نسبتاً زیادہ موزوں ہیں۔

سید ظہیر الدین مدنی نے لکھا ہے:

''ادب لطیف کی تاریخ میں شرر کو اس کا امام اور سجاد حیدر، نیاز

فتحپوری اور خلیقی دہلوی وغیرہ کو اس قصر ادب کا ستون تصور کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان چاروں حضرات کے کارنامے ادب لطیف (بحیثیت صنف) سے زیادہ ایسے نگاری (انشائیہ نگاری) سے قریب ہیں۔ ان لوگوں نے عموماً انگریزی کے طرز پر ماہرین فن کی طرح اسیرز (انشایئے) لکھے ہیں۔'' (اُردو ایسیز ص ۱۳۹)

شرر نے اپنے تاثرات کو قلم برداشتہ ضرور لکھا ہے۔ لیکن ان کے انشائیہ میں بھی عالمانہ اور ناصحانہ انداز ملتا ہے۔ نیاز کی طرح شرر نے بھی درس عبرت دینے کے لئے عموماً مناظر قدرت کا سہارا لیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں ''سیم سحر''، ''آرزو''، ''غریب کا جھونپڑا'' اور ''لالہ خودرو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سجاد حیدر کے مجموعۂ مضامین ''خیالستان'' میں حضرت دل کی سوانح عمری بھولی بسری یادیں، چاند کی کیفیت، چڑیا چڑے کی کہانی اور سیل زمانہ نہایت شگفتہ انشایئے ہیں۔ آزاد کی طرح نیاز فتحپوری کے مقالے کی زبان سلیس رنگین ہے اور طبیعت عربی کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہے۔ ان کے مجموعہ مضامین ''نگارستان'' میں ''عورت''، ''برسات''، ''اپنے چاند اور ایک رقاصہ'' وغیرہ انشائیہ کے بہترین نمونے ہیں۔

مولانا خلیقی دہلوی کے ادبی مضامین کے مجموعہ ''ادبستان'' میں میرا سفر، حریص رقص، درۂ موت اور کیف نظر معیاری انشایئے شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان سب میں خیالات کی گہرائی کے ساتھ زبان وبیان کی صناعی موجود ہے۔ مولانا خلیقی دہلوی سے پہلے ایک اور نام میر ناصر علی کا ملتا ہے۔ جس کے بارے میں نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ:

''وہ اُردو کے سب سے اچھے اور سب سے پہلے انشائیہ نگار ہیں۔''

نیاز کی اس بات کو کہ میر ناصر علی سب سے پہلے انشائیہ نگار ہیں، تسلیم کرنے کے لئے ہم تیار نہیں اور غالباً نیاز کا مقصد بھی یہ نہیں تھا کہ وہ سب سے پہلے انشائیہ نگار ہیں۔ ان کا مقصد دراصل یہ تھا کہ ان کے انشایئے مکمل اور معیاری ہیں اور اس صورت میں نیاز کے فیصلہ سے ہمیں بھی اتفاق ہے۔ ناصر علی کے انشایئے ''صلائے عام'' میں ''خیالات

پریشاں'' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے لکھا ہے:

''ان کے انشائیوں میں خیالات کی سادگی اور اظہار کی دل کشی کا التزام نمایاں ہے۔ ان کے یہاں نہ سر سید احمد خاں اور حالی کی مقصدیت اور مذہبیت ملتی ہے اور نہ محمد حسین آزاد کی شدت پسند تخیلیت۔ وہ اپنے محسوسات کو بغیر کسی خارجی اثر کو قبول کئے ہوئے پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کا یہ خلوص انہیں دوسرے انشائیہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہی نظر ان کے انشائیوں میں بسی ہوتی۔'' (انشائیہ ص ۵۹)

حسن نظامی کے انشائیے اُردو انشائیہ کے نظریے پر پورے اُترتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں زبان وبیان کی شگفتگی کے ساتھ ہلکا فلسفیانہ رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ انشائیہ کے موضوعات کو حسن نظامی نے وسیع تر کردیا۔ ان کے مجموعۂ مضامین ''سی پارہ دل'' میں، اُلّو، مکھی، دیا سلائی، لالٹین، اوس، اور زلف کا ماجرا وغیرہ اچھے انشائیے کہے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ وہ نہایت شگفتہ اور قلم برداشتہ لکھے ہوئے ہیں۔

اُردو انشائیہ کی تاریخ میں سجاد انصاری کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا اصغر کی تعریف کے مطابق:

''سجاد کے اسیز (انشائیے) وسعت علم، احساس شعریت و حکیمانہ نزاکت خیال کا باہمی امتزاج ہے۔''

اور بقول ڈاکٹر آدم شیخ:

''سجاد کا اسٹائل ان کے انشائیوں کی جان ہے۔ ان کی تحریروں میں ان کے دل ودماغ بعینہ جھلکتے ہیں۔ ان کی شخصیت کو ان کے فن سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اپنے محسوسات کو بے باکی کے ساتھ قلمبند کرتے ہیں۔''

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو کے کچھ نقادوں نے سجاد کی انشائیہ نگاری پر بڑے

متوازن اور وقیع فیصلے دیئے ہیں۔ ''عورت اور مسلمانان ہند'' ان کے بلند درجہ انشائیے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی جان لطیف طنز ہے۔

مہدی افادی کے مضامین کا مجموعہ ''افادات مہدی'' میں بنت عم، خواب طفلی اور آرزوئے شباب، قابل ذکر انشائیے ہیں۔ زندہ دلی اور بے تکلفی ان کے انشائیوں کا نمایاں عنصر ہے۔ وسیع النظری اور اظہار بیان کی جدتوں نے ''افادات مہدی'' کو لازوال بنادیا ہے۔

مولانا آزاد کے ''غبار خاطر'' اور ''تذکرہ'' میں ان کی انشائیہ نگاری کا فن عروج پر ہے۔ قاضی عبدالغفار خاں نے لکھا ہے کہ:

''اُردو ادب میں کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں۔''

ابوالکلام آزاد کے بیان میں فکر کی پختگی، افکار کا تنوع اور لب ولہجہ کا اعتماد ہے۔ ان کے انشائیوں میں ان کی علمیت اور زبان دانی کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

یوں تو بیسویں صدی کے انشائیہ نگاروں میں شرر، مہدی افادی، خلیقی، ناصر علی ملا رموزی، فرحت اللہ بیگ، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری جیسے نام بھی بڑے اہم ہیں۔ لیکن اس صدی کے انشائیہ نگاروں میں احمد شاہ بخاری پطرس، رشید احمد صدیقی اور کنہیالال کپور خاص طور پر ممتاز ہیں۔ ان کے یہاں طنز ومزاح کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان کا ہر ایک جملہ جامع اور ہمہ گیر ہے۔ تازگی اور شگفتگی پطرس کے انداز بیان کا حسن ہے۔ ''کتے'' ان کے مضامین میں خاص طور پر انشائیہ کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ ان کے قہقہوں میں تنقید اور طنز میں دل کشی ہے۔

رشید احمد صدیقی طنز نگار بھی ہیں، مزاح نگار بھی اور انشائیہ نگار بھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں فلسفیانہ پہلوؤں کو جگہ دینا انہیں کا حصہ ہے۔ ان کی تحریریں بیشتر کرداروں کی متنوع حرکتوں کا احاطہ بھی کرتی ہیں۔ چارپائی، دھوبی، ارہر کا کھیت، مرشد، دیہاتی، ڈاکٹر اور وکیل کا شماران کے بہترین انشائیوں میں ہوتا ہے۔ کنہیالال کپور کے طنز ومزاح میں صنف انشائیہ کے خط وخال کافی نمایاں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر آدم شیخ نے لکھا ہے کہ:

''کپور کا عمل سوئفٹ اور ایڈیسن کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔''

اس کے بعد موجودہ دور میں ڈاکٹر وزیر آغا، نظیر صدیقی، مشتاق احمد یوسفی اور احمد جمال پاشا کا نام خاص طور سے لیا جاسکتا ہے۔ احمد جمال پاشا انشائیہ نگار کم، مزاح نگار زیادہ ہیں۔ ان کا ماحول طنز و مزاح کی شگفتہ اور لطیف قدروں سے متاثر ہے۔ ناپسندیدہ لوگ ان کا ایک اچھا انشائیہ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کا اپنا مخصوص لب ولہجہ ہے۔ ان کے انشائیوں کی فضا مزاحیہ اور طنزیہ ہے جس میں فکر کی سنجیدگی بھی ہے اور تاثرات کی بوقلمونی بھی۔ ''صنف لاغر'' ''بڑھئے گر بیمار'' اور ''جنون لطیفہ'' ان کے کامیاب انشائیے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں۔ ان کے انشائیوں میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور جملوں کا استعمال قابل تحسین کہا جاسکتا ہے۔ ''پگڈنڈی'' ''دیوار'' اور ''میری چالیسویں سالگرہ'' ان کے انشائیوں میں قابل ذکر انشائیے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ان کے انشائیوں کا مجموعہ خیال پارے'' کے نام سے شائع ہوا ہے اس میں بعض انشائیے معیار کے اعتبار سے انگریزی انشائیوں کے مقابلے میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ نظیر صدیقی کے انشائیوں کا مجموعہ ''شہرت کی خاطر'' پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیرایۂ اظہار میں رشید احمد صدیقی سے متاثر ہیں اور ان کے یہاں اب تک فنی پختگی پیدا نہ ہوسکی ہے۔ ''شہرت کی خاطر'' میں کچھ ایسے انشائیے بھی ملتے ہیں، جن کی سرحدیں ڈاکٹر وزیر آغا کے انشائیوں کے مجموعہ ''خیال پارے'' سے جاملتی ہیں۔

اُردو انشائیہ کی ارتقائی تاریخ دہرانے کے دوران جن انشائیہ نگاروں کا تذکرہ آیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں مکمل طور سے انشائیہ نگاری کی خصوصیات موجود نہیں۔ پھر بھی ان کو انشائیہ نگار کی حیثیت سے اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ سخت محاسبہ کے بعد اُردو انشائیہ کا دربار ہی سنسان نظر آئے گا۔

□□□

انشائیہ اور عصری آگہی

بظاہر یہ بات تعجب انگیز نظر آتی ہے کہ مختلف اصناف ادب کے فروغ و ارتقاء کا سلسلہ مخصوص ادوار اور زمانوں کے ساتھ بھی متعلق ہوتا ہے تاہم اگر ادب کا تجزیہ کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نظر نہیں آتا کہ بعض اصناف مخصوص زمانے میں فروغ و ترقی کی منزل طے کرتی ہیں۔ اُردو غزل کی روایت قدیم اور بہت مضبوط ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے عروج دور میں غزل کا فروغ و ارتقاء رک سا گیا اور اس دور میں نظم کو زیادہ اہمیت ملی۔ ایک زمانے میں افسانے کی صنف صرف صورت واقعہ کے بیان تک محدود تھی لیکن گذشتہ دو دہائیوں میں کہانی کا فریم ٹوٹ پھوٹ گیا اور علامتی اور تجریدی افسانے کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس پہلو کو مدنظر رکھیں تو یہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ اچھا انشائیہ ہر زمانے میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہر چند انشائیہ آزاد ماحول کا تقاضا کرتا ہے اور پابندی و محبوس فضا کو قبول نہیں کرتا۔ تاہم امر واقعہ یہ بھی ہے کہ انشائیہ صرف اس دور میں پنپ سکتا ہے ماحول اور حالات سے فرد ایک شدید بے اطمینانی کے احساس میں مبتلا ہو۔ ڈاکٹر جانسن نے سٹیل کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وہ غیر مطمئن عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے'' ایسے'' لکھتا رہا اور اس نے نثر میں غیر جارحانہ اور سرد رویے کی عکاسی کر کے سیاست کی پیدا کردہ گرمی کو معتدل بنانے کی کاوش کی ہے۔[2] اس زاویے سے برصغیر کو اس کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں دیکھئے تو آزادی سے پہلے کا زمانہ شدید سیاسی تحریک اور نعرہ بازی کا زمانہ نظر آتا ہے۔ اس قسم کا ماحول انشائیہ نگاری کے لئے سازگار نہیں، آزادی کے بعد فرد نئے معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہوگیا۔ اس دور میں اس نے نہ صرف آسودگی کے ایک خودساختہ تصور کی پرورش کی بلکہ مستقبل کے بارے میں بعض نے نہ صرف آسودگی کے ایک خودساختہ تصور کی

پرورش کی بلکہ مستقبل کے بارے میں بعض مافوق الحقیقت امیدوں کی افزائش بھی کی۔ اسے ماحول سے بے اطمینانی کا احساس تو اس وقت ہوا جب اس کے خیالی مستقبل کے خواب چکنا چور ہو گئے اور سیاسی و معاشرتی مطلع ابر آلود ہو گیا۔ شاید یہی وقت تھا جب انشائیہ کی تخلیق عمل میں آسکتی تھی۔ چنانچہ اسی دور میں اُردو انشائیہ وجود میں آیا اور اس نے زندگی کی نا آسودگی کو کم کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔ پاکستان کے اطراف و جوانب فضا قدرے مختلف تھی۔ چنانچہ اردو زبان کے دوسرے مسکنوں میں انشائیہ کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو اُردو انشائیہ ایک بڑی حد تک پاکستانی صنف ادب ہے اور اسے اب تک جتنا فروغ وارتقاء حاصل ہوا ہے وہ پاکستان کے تہذیبی اور سماجی حالات سے براہ راست متعلق نظر آتا ہے۔

انشائیہ اس لحاظ سے ایک غیر مقصدی صنف ادب ہے کہ یہ فرد کو نہ تو انقلاب کے منفی انداز کے عمل پر آمادہ کرتی ہے اور نہ اسے عرفان کی کسی منزل سے ہمکنار کرنے کی دعویدار ہے۔ لیکن انشائیہ چونکہ فرد کو حقیقت کے ایک نئے مدار سے آشنا کرتا اور اس کو بہجت کی ایک نئی کیفیت سے متعارف کراتا ہے اس لئے یہ اپنی ایک افادی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ انشائیہ اندھیرے کے جگنو کی طرح ہے جو منزل کی امید تو دلاتا ہے لیکن خود منزل نہیں بنتا۔ انشائیہ ہمیں تھوڑی سی دیر کے لئے اس معصوم بچے کی سطح پر لے آتا ہے جو سنگریزوں سے جھولی بھر کر اتنا خوش ہو جاتا ہے جتنا کہ ایک شہنشاہ جواہرات کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر بھی خوش نہیں ہوتا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انشائیہ کو ایک صنف ادب کے طور پر کسی مقصد کا آلہ کار نہیں بنایا جاسکا۔ یہی وجہ ہے کہ انشائیہ کو ان ممالک میں زیادہ فروغ ملا ہے جہاں ادب کو مقصد کا غلام نہیں بنایا جاتا ہے اور بعض ایسے ممالک میں جہاں ادب کو نظریاتی پروپیگنڈے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے وہاں انشائیہ کی کونپل پھوٹ نہیں سکی۔ یوں دیکھیں تو ترقی پسند ادیبا کے کے ہاں انشائیہ کو قبول کرنے کا میلان بھی نظر نہیں آتا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انشائیہ میں اپنے عہد کی آہٹ موجود نہیں ہوتی، ایمی دی گارماں کے مطابق ''فن کار اپنی ذات کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی اپنے زمانے کے بارے میں لکھتا ہے''۳ چنانچہ انشائیہ میں بھی ادیب انکشاف ذات کرتا ہے تو وہ اپنے زمانے کو نظر انداز نہیں کرتا۔ انشائیہ کو یہ

امتیاز حاصل ہے کہ اس میں عصری آگہی کے آثار تخلیق کی سطح کے ساتھ چپکے ہوئے نظر نہیں آتے۔ بلکہ یہ ایک مخصوص عمل سے گزرنے اور منقلب ہونے کے بعد ہی قاری کے سامنے آتے ہیں، انشائیہ میں عصری آگہی معروضی نہیں بلکہ انشائیہ عصری آگہی کو بھی ایک نئی نوع کے تاثر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ اس خوشبو کی مانند ہے جو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے لیکن جسے چھونا ممکن نہیں۔

انشائیہ کے جنم میں اس حقیقت کا عمل دخل زیادہ ہے کہ جب مونٹین نے اپنے عصری آگہی اور ذاتی تجربے کو زمانے کے سامنے آزادہ خیالی سے پیش کرنے کا ارادہ کیا تو غیر منضبط تحریروں سے انشائیہ وجود میں آ گیا۔ مونٹین فطری طور پر داخلیت پسند تھا، اسے زندگی کی بیشتر دنیاوی آسائشیں میسر تھیں۔ اس کا عہد فکری تموج کا عہد تھا، زندگی اور مابعد الطبیعات کی جنوبی جستجو نے ہر خاص و عام کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، سماجی سطح پر شدید بد اطمینانی موجود تھی۔ اس دور میں مونٹین نے ایسی تحریریں پیش کیں جن میں نہ صرف مونٹین خود موجود تھا بلکہ ان تحریروں میں اس دور کا فرانس بھی سانس لے رہا تھا۔ بلاشبہ مونٹین نے زیادہ تر اپنی ذات کو منکشف کیا لیکن اس عمل میں اس نے اپنے زمانے سے اغماض نہیں برتا۔ چنانچہ مونٹین کے نثر پاروں میں اس کی سوانح عمری تو مرتب نہیں ہو سکتی لیکن ان سے فرانس کی تہذیبی زندگی کے نقوش اور اس عہد کی سرگرمیوں کا احوال مرتب کیا جاسکتا ہے۔ وجہ یہ کہ مونٹین نے متعدد تجربات سے ایک کلی حقیقت کا استنباط کیا اور وہ روح عصر جسے فرانس کے فکری انتشار میں سمیٹنا مشکل تھا اس کے افکار پریشاں میں یوں سمٹ آئی کہ پورا فرانس اس آئینے میں اپنی فطرت کا مشاہدہ کرنے لگا۔ چنانچہ مونٹین کی اس خدمت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے فرد کو عصری حقیقت کا ایک نیا اور انوکھا روپ دکھانے کی کاوش کی۔ بیکن نے اپنے عہد کے متصادم میلانات اور برسرِ پیکار تصورات کو عصری آگہی کی نئی تعبیر سے ایک مثبت جہت دینے کی کاوش کی اور فرد کو ممنوعات کے اژدہام سے نکال کر فطری سطح پر زندگی کرنے کی دعوت دی۔ انشائیہ کی یہ ابتدا بے حد معنی خیز تھی تاہم اسے عصری آگہی سے براہ راست متعلق کرنے میں ایڈیسن اور سٹیل نے زیادہ گرانقدر خدمات سر انجام دیں۔ یہ انشائیہ نگار چونکہ اخبارات کے ساتھ وابستہ تھے اس لئے ان دونوں نے انشائیے کو تہذیبی

اصلاح کا وسیلہ بنانے کی کاوش کی۔ چنانچہ ایڈیشن نے انشائیہ کو ایک ایسی مقراض قرار دیا ہے جس سے باغ کی روشوں کی شاخ تراشی کی جاتی ہے۔

انشائیہ میں عصری آگہی اپنے تصور کو جامد صورت میں پیش نہیں کرتی بلکہ اس کا مدار بھی ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے، کبھی انشائیہ نگار اپنی ذات کے ایک نکتے کے انکشاف سے زمانے کو گرفت میں لے لیتا ہے اور کبھی زمانہ کائنات کے زینے سے ذات کے دروازے پر دستک دینے لگتا ہے، دونوں صورتوں میں انشائیہ نگار کسی تیز یا ترش ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتا بلکہ وہ زمانے کی خلوت میں داخل ہونے کے لئے ہمارے سامنے اپنی شخصیت کا دریچہ کھول دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر انشائیہ معاشرے کے اعمال وافعال کی ہر حرکت کو دیکھتا ہے اور اس کی ہر لرزش کو مہکتے ہوئے پھول کی طرح اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے اور یوں انشائیہ نگار کی لوحِ دل سے جو نقش بھی ابھرتا ہے اس میں زمانے کی روح موجود ہوتی ہے۔

اُردو کے بیشتر انشائیہ نگاروں نے بھی لمحے کی چاپ کو بگوشِ ہوش سننے اور عصری آگہی کو مختلف زاویوں سے پیش کرنے کی کاوش کی ہے۔ انشائیہ نگار اپنے عہد کے اعمال و افعال، سیاسی وسماجی تموج، فکر ونظر کے طغیان اور تہذیبی و معاشرتی کروٹوں پر ایک حساس اور تجربہ کار ادیب کی نظر ڈالتا ہے اور عصری حقیقتوں کو نئے نئے زاویوں سے اجاگر کرتا چلا جاتا ہے اور یہ تمام عمل کچھ اس طرح سے ظہور پذیر ہوتا ہے کہ انشائیہ نگار زمانے کے مواج سمندر میں گہرا غوطہ لگانے کے لئے ہر وقت بے تاب رہتا ہے اور جب زمانہ اس پر اپنے اسرار چھوٹے چھوٹے جگنوؤں کی صورت میں کھولنے لگتا ہے تو انشائیہ نگار انہیں صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اسے انشائیہ کی تخلیقی صورت دے کر دوستوں میں تقسیم کر دیتا ہے چنانچہ میری نظر میں انشائیہ لکھنا محض اظہارِ ذات ہی نہیں بلکہ یہ ایک کریمانہ عمل بھی ہے۔

□□□

۱۔ غلام جیلانی اصغر "انشائیہ"، "ادبی دنیا" دورِ پنجم شمارہ نہم

۲۔ بحوالہ "پہلا پتھر" "مقدمہ" "ہم ہیں مشتاق" ص: ۲۰

۳۔ بحوالہ "مسلیٹ کے مضامین" مترجم: ڈاکٹر جمیل جالبی

احمد حسین آزاد

انشائیہ اور دیگر اصنافِ ادب

مضمون اور انشائیہ:۔

"مضمون" ایک عربی لفظ ہے، جس کے معنی "مافی اصلاب الفحول" ہیں۔ یعنی وہ مادہ تخلیق جو حیوانات نر کی اصلاب میں ہو یا استخوان پشت کہ محل نطفہ مرد کا ہے۔ مضمون کو مضمون اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مضمون نام ہے اس تخلیقی خیال کا جو فن کار کے ذہن میں جنم لیتا ہے۔ مضمون کا موضوع لامحدود ہے۔ دنیا کی ہر چیز مضمون کا موضوع بن سکتی ہے۔ اس لفظ کے معنوی ابہام کا یہ عالم ہے کہ مقالہ، سوانح، خاکہ، رپورتاژ، اداریہ، مراسلہ، کیفیہ، روزنامچہ، روداد اور انشائیہ کو بھی جو اپنی صورت اور مزاج کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، عام زبان میں "مضمون" سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ "مضمون" دراصل انگریزی لفظ Essay کا ترجمہ ہے۔ اور لفظ Eassy فرانسیسی لفظ اسائی (Essai) کی انگریزی شکل ہے۔ اور اسائی لاطینی زبان سے ماخوذ ہونے کی بجائے عربی لفظ السّعی کی فرنسیسی شکل معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ صدیوں اہل عرب کا سکہ اندلس اور جنوبی فرانس پر چلتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانسیسی زبان میں لاطینی الفاظ کے مقابلے میں عربی الفاظ زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔

فرانسیسی لفظ اسائی (Essai) اور عربی لفظ اسعی دونوں "کوشش" کے معنی ومفہوم کو ظاہر کرتے ہیں۔ مضمون اور Essay دونوں کو مترادف الفاظ سمجھنا چاہئے اور موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ انشائیہ عربی لفظ "نشا" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی "پیدا کرنا ہیں۔ انشائیہ کی طرح Essay بھی ایک تخلیق ہے۔ اس اعتبار سے ایسے (Essay) یا مضمون کو انشائیہ کہنا نامناسب نہیں۔ لیکن یہ اس صورت میں جب مضمون یا ایسے

سے مانٹین (Montaigne) کے قلم برداشتہ لکھے ہوئے غیر مربوط ادب پارے جیسے Familiar or Personal Essays مراد ہوں نہ کہ Formal Essays یا علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور سوانحی مضامین۔ اس لئے کہ Formal Essays یا علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، سیاسی سماجی، مذہبی اور سوانحی مضامین میں منطقی استدلال، خیالات کا تسلسل، مقصدی تبلیغ اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ لیکن انشائیہ نگاری نہ کسی مقصد کی تبلیغ یا کسی نظریہ کی اشاعت کا نام ہے نہ اس میں منطقی استدلال اور خیالات کا تسلسل ملتا ہے اور نہ موضوع کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ مذکورہ نثری اصناف ادب کے برخلاف انشائیہ میں جو بات بھی کہی جاتی ہے، اپنی ذات کے حوالہ سے کہی جاتی ہے۔ یا کم از کم انشائیہ نگار اپنی ذات کو اس میں دخیل ضرور رکھتا ہے۔

مضمون (Essay) معلوماتی ہوتا ہے۔ انشائیہ معلوماتی کم اور احساسی زیادہ ہوتا ہے۔ مضمون نکات (Points) کے اعتبار سے متعین (Fixed) ہوتے ہیں اور انشائیہ اپنے اندر بے پناہ ہمہ گیریت رکھتا ہے۔ انشائیہ کا مکتوبی اسلوب انشائیہ نگار کی شخصیت ضرور دکھاتا ہے۔ لیکن انشائیہ میں نہ مراسلاتی خبرو خیریت ملتی ہے اور نہ انشائیہ نگار کے سامنے مکتوب نگار کی طرح کوئی دوسری شخصیت ہوتی ہے جو اسے مخاطبت پر مجبور کرے۔ انشائیہ خودنوشت سوانح عمری بھی نہیں، جس میں سوائے ''انا'' کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور نہ اس میں سوانح کی طرح کسی بڑے انسان کی حیات کے تاریخ وار کارنامے کا ذکر ملتا ہے۔ روداد کی طرح انشائیہ میں بھی خارجی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مگر روداد میں جلسوں کی خشک کارروائیوں کا ہی تذکرہ ہوتا ہے جب کہ انشائیہ میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج، بلکہ داخلی رنگ کا غلبہ ہوتا ہے۔ خاکہ اور انشائیہ اپنے اختصار کی صفت میں مشترک ہیں۔ لیکن خاکہ کی طرح انشائیہ میں کسی دلچسپ شخصیت کا مرقع نہیں پیش کیا جاتا ہے اور نہ انشائیہ کا انداز بیان خاکہ کی طرح رمزیہ ہوتا ہے۔ روزنامچہ کا تنوع اور اختصار اسے انشائیہ سے قریب ضروری کردیتا ہے لیکن انشائیہ میں روزنامچہ کے غیر متعلق، بے ربط بیانات نہیں ملتے۔ اس طرح انشائیہ

میں رپورتاژ کی پراثر طائرنگاہی بھی نہیں ملتی۔ غرض کہ مراسلہ، سوانح، روداد، خاکہ، روزنامچہ، رپورتاژ، مقالہ، اداریہ اور کیفیہ، مضمون (Essay) کی مختلف شکلیں ہیں۔ جنہیں ہم ''اصناف ادب'' کا درجہ دیتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ بھی مضمون نگاری کا ایک جزو ہے، جس میں مصنف یا انشائیہ نگار ذاتی اور انفرادی تجربات کو اس طور پر پیش کرتا ہے کہ اس کی شخصیت کافی نمایاں رہتی ہے۔ اس طرح انشائیہ میں ایک طرح داخلی رنگ پایا جاتا ہے۔ مگر مضمون میں خارجی رنگ کا غلبہ رہتا ہے۔ منطقی اصطلاح میں کہا جاسکتا ہے کہ مضمون اور انشائیہ میں عام خاص مطلق کی نسبت پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'تہذیب الاخلاق' میں سرسید احمد خاں کے لکھے ہوئے بیشتر مضامین انشائیہ نہیں ہیں کیوں کہ ان میں علمی اور سیاسی مسائل ملتے ہیں۔ ''مضامین چکبست'' میں چونکہ علمی اور ادبی بحث ہے، اس لئے ان کو بھی ہم انشائیہ سے موسوم نہیں کرسکتے۔ اور مہدی افادی کی ''افادات مہدی'' میں بھی چونکہ ٹھوس فلسفیانہ اور علمی و ادبی مضامین ہیں اس لئے ان کو بھی انشائیہ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ خالص انشائیہ کی مثال میں رشید احمد صدیقی کے ''دھوبی'' سعادت حسن منٹو کے ''ترقی یافتہ قبرستان'' اور کرشن چندر کے ''ردی'' کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

مقالہ اور انشائیہ

مقالہ در اصل مضمون ہی کی ایک خاص شکل ہے، جس کو Thesis یا Formal Essay بھی کہا جاتا ہے۔ مقالہ کا موضوع شعروادب، تحقیق وتنقید، ثقافت وتمدن، علم و سائنس، تاریخ وسیاست، مذہب وسماج سب کچھ ہوسکتا ہے۔ مگر Familiar, Personal and Light Essays کے برخلاف مقالہ (Formal Essays) میں کافی تحقیق وتدقیق کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقالہ نگار کے مطالعہ میں جس قدر وسعت وگہرائی ہوگی، مقالہ میں اس قدر وزن اور استحکام ہوگا۔ متانت وسنجیدگی مقالہ کی روح ہے۔ مضمون اور انشائیہ کی بحث میں کہا جاچکا ہے کہ مقالہ میں مقصد کی تبلیغ، خیالات کا تسلسل، منطقی استدلال اور موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث ملتی ہے اور مقالہ نگار کی شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آتی۔ لیکن انشائیہ میں نہ مقصد کی تبلیغ ہوتی ہے نہ خیالات کا تسلسل اور نہ منطقی استدلال ملتا ہے اور نہ

موضوع کے تمام گوشے ہی اجاگر کیے جاتے ہیں اور نہ مقالہ نگار کی طرح انشائیہ میں انشائیہ نگار کی شخصیت دبی رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مقالہ میں بھاری بھرکم انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ جب کہ انشائیہ کا اسلوب سلیس، شگفتہ اور نرم و نازک ہوتا ہے۔ کیونکہ انشائیہ کا مقصد صرف انبساطی ہوتا ہے، جبکہ مقالہ کا مقصد افادی ہوتا ہے۔ مقالہ میں چند نکات ہوتے ہیں۔ جس کے گرد مقالہ نگار چکر لگاتا رہتا ہے اور انشائیہ نگار نکات متعین (Fixed Points) کا پابند نہیں ہوتا بلکہ بات سے بات نکلتی ہے اور کبھی بے بات کی بات میں بھی فلسفیانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ انشائیہ میں خیالات کی گلگشت ہوتی ہے۔ انشائیہ مقالہ کی طرح خشک ہو جائے تو خراب ہو جاتا ہے۔ اور مقالہ انشائیہ بننے لگے تو مقالہ کا عیب بن جاتا ہے۔ مقالہ "What" پر زور دیتا ہے اور انشائیہ "How" کو اہم جانتا ہے۔

اختصار، طوالت اور جامعیت کے اعتبار سے مقالہ اور انشائیہ کی سرحدیں ملتی نظر آتی ہیں۔ عربی میں بھی کچھ ایسے مقالے لکھے گئے ہیں جن میں انشائیہ کا لطف زبان ملتا ہے مثلاً مقامات بدیع الزماں ہمدانی" اور محمد قاسم حریری کی" مقامات حریری"۔ فارسی مقالوں کی مثال میں ہم نظامی عروضی سمرقندی کی "چہار مقالہ" اور اُردو میں "مقالات شبلی"، "مقالات حالی" اور "مقالات ابوالکلام آزاد" کو پیش کر سکتے ہیں۔ اس موقع پر مقالہ اور انشائیہ کا فرق واضح کر نے کے لئے انشائیوں کی مثال میں سرسید احمد خاں کے امید کی خوشی، حالی کے "زبان گویا"، رشید احمد صدیقی کے "ارہر کا کھیت"، سید ضمیر حسن کے "گالیاں"، عبدالحلیم شرر کے "نسیم سحر" اور پطرس کے "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" وغیرہ کو پیش کرنا مناسب نہ ہوگا۔

ادب لطیف اور انشائیہ:۔

ہر زبان کے ادب کو ہم دو حصے میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ادب لطیف اور ادب سنجیدہ۔ جس کو انگریزی میں Light Literature اور Serious Literature کہا جاتا ہے۔

ادب سنجیدہ کا تعلق علمی اور سائنسی مضامین سے ہوتا ہے۔ ادب سنجیدہ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں تحقیق، تنقید، نفسیات، معاشیات، عمرانیات، فلکیات، سیاسیات وغیرہ سب کی گنجائش ہے۔ ادب سنجیدہ اور انشائیہ کے فرق کی وضاحت ہم "مقالہ اور انشائیہ" کے عنوان

کے تحت کر چکے ہیں۔ ادب لطیف کو بھی ہم منظوم اور منثور دو حصے میں تقسیم کر کے حصہ منظوم میں نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ وغیرہ اور حصہ منثور میں ناول، مختصر طویل افسانہ، سوانح، خاکہ، داستان، ڈرامہ، مقالہ وغیرہ کو شامل کر سکتے ہیں۔

دراصل انشائیہ کا تعلق ادب سنجیدہ کی بجائے ادب لطیف سے اتنا گہرا ہے کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے اور ادب لطیف میں خاص طور پر غزل اور مختصر افسانہ سے انشائیہ بہت قریب ہے۔ ادب لطیف کی ایک شاخ کیفیہ ہے۔ اکبر حیدری کی "کیفستان" حجاب اسمعیل کی 'لغمات موت' ہمشیرہ مشرف حسین کی 'یادرفتگاں' اور آصف علی کی "پرچھائیاں اور اس کا دوسرا رخ" وغیرہ تصنیفات کیفیہ تحریروں کے قابل ذکر مجموعے ہیں۔ کیفیہ سے انشائیہ کا رشتہ مستحکم ہوتے ہوئے دونوں میں نمایاں فرق ہے۔ کیفیہ میں بقول ڈاکٹر سید محمد حسنین صرف نمود سحر کی پاکیزگی نظر آتی ہے یا تاروں کی تنک تابی۔ جبکہ انشائیہ میں دھوپ چھاؤں کی بہار ہوتی ہے اور لیل و نہار کا سماں بھی۔ کیفیہ اور انشائیہ کا فرق یوں بھی ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ کیفیہ وہ منثور شاعری ہے جو Ballade سے ملتی جلتی ہے۔ اور انشائیہ نثر کی غزل ہے، جس کا ہر جرعہ ایک نیا کیف و سرور بخشتا ہے۔ انشائیہ کے جملے غزل کے منفرد اشعار اور مصرعے کی طرح ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ الگزنڈر اسمتھ کا بھی یہی کہنا ہے کہ "اپنی ادبی ہیئت اور مواد کی بنا پر انشائیہ غزل سے مشابہ ہے۔" انشائیہ ادب لطیف کے جزو مختصر افسانہ سے بھی جزوی طور پر قریب ہے۔ جس کی وضاحت ہم کہانی اور انشائیہ کے عنوان کے تحت کریں گے۔

ادب لطیف کو نیازیت اور ٹیگوریت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو نتیجہ ہے رومانی تحریک کا۔ رومانی تحریک کا آغاز ٹیگور اور آسکر وائلڈ کی تحریروں کے تراجم سے ہوا۔ ادب لطیف کے امام شرر ہیں اور سجاد حیدر، نیاز اور خلیق اس ادب کے ستون۔ ادب لطیف کا موضوع خاص طور پر عورت اور فطرت کے حسین مناظر ہیں۔ اس ادب کو منثور شاعری کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس کا ایک خاص رنگ اور لب ولہجہ ہوتا ہے، جو انشائیہ کے رنگ اور لب و لہجہ سے قریب تر ہوتا ہے۔ لیکن ادب لطیف کا خالق واعظ اور مبلغ ہوتا ہے۔ اور انشائیہ نگار کو

تبلیغ اور پند و نصیحت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔ ادب لطیف کی غنائیت اور لطف زبان کا جہاں تک تعلق ہے انشائیہ برابر کا شریک ہے۔ مگر موضوع کے اعتبار سے انشائیہ کا دامن نسبتاً زیادہ وسیع ہے۔ ادب لطیف کی طرح انشائیہ کے موضوع سے بھی عورت اور فطرت کے حسین مناظر خارج نہیں ہیں۔ لیکن عورت و فطرت کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی انشائیہ میں جگہ پاتے ہیں۔

ادب لطیف اور انشائیہ میں ایک نمایا فرق یہ بھی ہے کہ ادب لطیف کے خالق کی شخصیت اس کے ادب پاروں کی تہہ میں چھپی رہتی ہے اور انشائیہ سے انشائیہ نگار کی شخصیت ہر دم جھانکتی نظر آتی ہے۔ ادب لطیف اور انشائیہ دونوں تاثراتی ضرور ہوتے ہیں لیکن اول الذکر میں رقت اور جذبہ کی شدت کارفرما ہوتی ہے اور مؤخر الذکر میں نہ رقت انگیزی ہوتی ہے اور نہ جذبہ کی شدت۔ ادب لطیف اور انشائیہ دونوں میں داخلیت تیز اور پر سوز ہوتی ہے اور انشائیہ کی داخلیت اس قدر رقیق اور شدید نہیں ہوتی۔ انشائیہ میں داخلیت اور خارجیت کے حسین امتزاج سے ایک دائمی اور ہمہ گیر شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔ ادب لطیف کی زبان اور اس کا بیان مصنوعی ہوتا ہے۔ انشائیہ کے برخلاف ادب لطیف کی موضوعیت اور رومانویت ہی اس کے شناختی اجزاء ہیں۔ انشائیہ میں حسن عبارت ہی سب کچھ نہیں ہے۔ انشائیہ نہ ادب لطیف اور ادب پاروں کی طرح کھوکھلا اور بے مغز ہوتا ہے اور نہ مضمون (Essay) کی طرح خشک بلکہ وہ ادب لطیف اور مضمون کے درمیان واقع ہوتا ہے اور ادب لطیف سے حسن بیان لیتا ہے اور مضمون سے موضوع کی استقامت (Stability)۔ یہ دوسری بات ہے کہ انشائیہ میں موضوع کی استقامت کے مقابلہ میں حسن بیان زیادہ ملتا ہے۔ ادب لطیف کی عمدہ مثال ''مضامین شرر'' ہے اور انشائیہ کی مثال میں ہم فرحت اللہ بیگ کے ''اونہہ'' ڈاکٹر وزیر آغا کے ''دیوار'' اور احمد جمال پاشا کے ''ناپسندیدہ لوگ'' کو پیش کر سکتے ہیں۔

صحیفہ نگاری اور انشائیہ

انشائیہ نگاری کی طرح ایک صحافی بھی کسی موضوع کا پابند نہیں ہوتا۔ بات سے بات پیدا کرنا انشائیہ نگار اور صحافی کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ

انشائیہ نگار کا ضمیر پاک ہوتا ہے اور ایک صحافی کے یہاں یہ طہارت نفس ممکن نہیں۔ صحافی کے سامنے ہمیشہ ایک مقصد ہوتا ہے۔ جو دوران تحریر اسے ٹوکتا رہتا ہے اور انشائیہ نگار کے سامنے کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا ہے جو اس کے قلم کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔ صحافی اپنی بات کو منوانے کے لئے منطقی استدلال سے کام لیتا ہے اور اس کی تحریر بہت حد تک سنجیدہ ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار کا دل چونکہ صاف ہوتا ہے اس لئے منطقی استدلال کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ اور وہ بڑی حد تک غیر سنجیدہ اور شگفتہ بیان ہوتا ہے۔ صحیفہ نگار ایک مقالہ نگار کی طرح دعوتِ فکر دیتا ہے مگر صحافی یا صحیفہ نگار کی باتوں میں مقالہ جیسی گہرائی نہیں ہوتی۔ صحافی ہمیشہ کچھ دینے کے ساتھ ساتھ ہم سے کچھ لینے کا بھی متمنی ہوتا ہے اور انشائیہ نگار ہمیں دیتا ہے۔ ہم سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ صحافی اور انشائیہ نگار دونوں جیک آف آل ہوتے ہیں۔ لیکن صحافی کی تحریروں میں کسی نظریہ یا پالیسی کی چھاپ ہوتی ہے، جبکہ انشائیہ پر کوئی چھاپ نہیں ہوتی۔

کہانی اور انشائیہ

ادب میں کہانی، قصہ گوئی یا واقعہ نگاری کے لئے تمثیلیہ، حکایت، داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور مثنوی مخصوص اصناف ہیں۔ ان اصناف ادب کی روح کہانی ہے اور کہانی کی تشکیل و تعمیر میں چند اجزائے ترکیبی مثلاً پلاٹ، کردار اور اتحاد زمان و مکان لازمی طور پر کار فرما ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر کہانوی اصناف کی تعمیر و تشکیل ممکن نہیں۔ کہانوی اصناف میں واقعات، حادثات اور سانحات کا تنوع ہوتا ہے، جو مرکزی خیال سے مربوط ہوتے ہیں۔

کہانوی اصناف کے خالق کی طرح انشائیہ نگار بھی واقعات سے کام لیتا ہے مگر واقعات انشائیہ کی روح نہیں۔ انشائیہ کی روح تو تاثرات ہیں اور انشائیہ میں ناول، داستان اور افسانہ وغیرہ کہانوی اصناف کی طرح واقعات کا تنوع نہیں ہوتا بلکہ تاثرات کی بوقلمونی ہوتی ہے۔ کہانی کار کی طرح انشائیہ نگار فرسودہ رسومات یا اصولوں کا پابند نہیں ہوتا۔ وہ بت پرست نہیں، بت شکن ہوتا ہے۔ وہ پلاٹ، کردار، زمان و مکان، نقطۂ نظر اور پس منظر وغیرہ کی صناعی سے نہیں الجھتا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ نگار کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے، جو دفتر کی چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے۔

چست وتنگ لباس اُتار کر ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ موڈھے پر نیم دراز ہو کر حقہ کی نے ہاتھ میں لئے انتہائی بشاشت اور مسرت سے اپنے احباب سے مصروف گفتگو ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بیان کی تصدیق اس وقت ہو جاتی ہے جب ہم انشائیہ کے موجد مانتین کی تحریروں کو پڑھتے ہیں۔ ان تحریروں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس کے اسٹڈی روم میں کسی آرام دہ نشست پر بیٹھ کر اس کی بے ربط مگر دل چسپ گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

انشائیہ میں کہانیوں کی طرح کوئی مرکزی خیال بھی نہیں ہوتا۔ جو اس کے منتشر خیالات کو زنجیری سالمیت عطا کرے۔ انشائیہ ذہن کی آوارہ خیالی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا سارا حسن اس کی بے ترتیبی، تنوع اور رنگارنگی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ افسانہ کا جامع اختصار انشائیہ میں بھی ہوتا ہے لیکن ایک افسانہ نگار محدود معنوں میں آزاد نہیں ہوتا۔ وہ افسانہ کے اصولوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ انشائیہ نگاری کی طرح وہ آزاد نہیں ہوتا۔ کرشن چندر کی انشائیہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈاکٹر سید محمد حسنین نے لکھا ہے کہ:۔

> ''ایک بلند پایہ انشائیہ نگار گفتار کا غازی ہوتا ہے جسے بات اٹھانے اور بات بڑھانے میں مطلق خوف وخطر نہیں۔ جس عنوان پر چاہے وہ قلم اٹھا سکتا ہے۔ عرش تا فرش اور خلوت تا جلوت ہر جگہ وہ آزادانہ اور فاتحانہ گھومتا ہے۔ اسے کوئی روک ٹوک نہیں۔ بات معمولی ہو یا غیر معمولی، یہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، انشائیہ نگار کا طائر خیال چشم زدن میں اسے اسیر پنجہ کر لیتا ہے۔'' (کرشن چندر نمبر، ماہنامہ شاعر بمبئی)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انشائیہ کا افسانہ سے کوئی رشتہ نہیں۔ اگر چہ افسانہ کی طرح انشائیہ میں اجزائے ثلاثہ یعنی پلاٹ، کردار، اتحاد زمان ومکان کی پابندی نہیں ہوتی پھر بھی بعض انشائیوں میں افسانوی رنگ ملتا ہے۔ مثلاً عظیم بیگ چغتائی کے ''میں نے پڑھا ہے'' مولانا خلیقی کے ''میرا سفر'' نظیر صدیقی کے ''آزادی اور شرافت'' اور کنہالال کپور کے ''وزیر کیس'' جیسے افسانہ نما انشائیوں کو انشائیہ ہی کہتے ہیں۔ گر چہ ان سب میں افسانہ کے

پلاٹ کی دروبست اور تاثراتی اکائی موجود ہے اور ذہن کی آزاد ترنگ پلاٹ کی تفصیلات میں گھل مل گئی ہے اور آزاد ترنگ کا اظہار براہ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان سب میں انشائیہ کی فضاء جذباتی وحدت، استعجاب، شگفتہ بیانی، تیکھاپن اور ترنگ کے عناصر موجود ہیں اور افسانہ کے اجزائے ثلاثہ میں سے کردار نگاری کا فقدان ہے۔ افسانہ نما انشائیوں کے بڑے دل کش نمونے اے۔ جی گارنر کے یہاں بھی ملتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ روبرٹ لنڈ کے کہنے کے مطابق انشائیہ کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک شکل وہ بھی ہے جو مذکورہ انشائیوں میں نظر آتی ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر اختر اورینوی کے اس بیان کو دہرا دینا نامناسب نہ ہوگا کہ

> ''انشائیوں میں واقعات تو ہو سکتے ہیں، مگر ان کا استعمال اور برتاؤ انشائیہ کے خاص رنگ میں ہونا چاہئے۔ اگر انشائیوں میں مختصر افسانوں کی تکنک برت دی جائے تو پھر یہ انشائیہ نہیں رہے گا۔ بعض ادباء انشائیہ لکھنے بیٹھتے ہیں مگر اس میں ماجرا اتنا بالیدہ ہو جاتا ہے اور مختصر افسانہ کی تکنک اتنی چھا جاتی ہے کہ نتیجہ میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ کم از کم انشائیہ نہیں ہوتی۔'' (مقدمہ 'ترنگ'، مصنف علی اکبر قاصد)

انشائیہ نگار واقعات سے زیادہ محاضرات (Anecdotes) سے کام لیتا ہے جو انشائیہ کے لئے حیاتین کا کام کرتے ہیں اور ان کے مناسب استعمال سے انشائیہ کی رنگا رنگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

مزاح نگاری اور انشائیہ

مزاح نگاری اور انشائیہ کا باہمی رشتہ بتانے سے قبل ضروری ہے کہ مزاح، ظرافت اور طنز کا فرق واضح کر دیا جائے ورنہ دوسروں کی طرح ہم بھی اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے مزاح کو ظرافت اور طنز کو مزاح یا ظرافت کو مزاح اور طنز کہہ کہہ کر اپنا سر بھی پھوڑیں گے اور دوسروں کا بھی۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ہجو نگار، رومان نگاری اور المیہ نگاری کی طرح، مزاح نگاری، ظرافت نگاری اور طنز نگاری کی نوعیت ادبی دنیا میں صنفی نہیں، بلکہ

توصیفی ہے۔ طنز نگاری میں ایک مقصد پوشیدہ ہوتا ہے اور وہ مقصد ہے کمزوریوں اور برائیوں کو بے نقاب کرنا اور کمزوریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا۔ لیکن طنز نگار کے برخلاف ایک مزاح نگار ان کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نہ صرف برداشت کرتا ہے بلکہ ان میں دل چسپی لیتا ہے اور ان سے لطف اٹھاتا ہے۔ کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باب میں مزاح نگار کی حیثیت ایک تماشائی یا زیادہ سے زیادہ Council for the Defence کی ہوتی ہے اور طنز نگار ایک سرکاری وکیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آسکر وائلڈ لکھتا ہے کہ

"اگر کسی سے سچی بات کہلوانی ہو تو اسے ایک نقاب دے دو۔"

ظرافت ایسے ہی ایک نقاب ہے۔ فرائڈ نے ظرافت کی تعریف کرتے ہوئے اسے Sense in nonsense قرار دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ طنز وہ اسلوب اظہار ہے، جس میں ہنستے ہنستے سماج یا افراد کی برائیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ اس روشنی میں ایک طنز نگار کی حیثیت ایک ایسے طبیب حاذق کی ہو جاتی ہے جو اپنے مریض کو تلخ گولیاں تو کھلاتا ہے مگر شہد میں ڈبو کر۔ غرض طنز ایک تیر ہے جو اتنا لطیف وار کرتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اس کی چبھن خود بخود محسوس ہونے لگتی ہے۔ طنز کے وار کی شدت میں کمی کرنے کے لئے ظرافت کا سہارا لینا پڑتا ہے، جس میں خوش طبعی ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس طرح طنز میں جو باتیں پیش کی جاتی ہیں، وہ ذہن و دل میں خلش پیدا کرتی ہیں۔ جبکہ ظرافت نگار اس خلش کو اپنے قہقہوں میں گم کر دینا چاہتا ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مزاح نگاری یا ظرافت نگاری اور طنز نگاری کو انشائیہ کا دوسرا نام دینا کسی طور بھی درست نہیں۔ کیونکہ مزاح نگاری، ظرافت نگاری اور طنز نگاری ادب کی کوئی مخصوص صنف نہیں بلکہ ان کی نوعیت توصیفی ہے۔ جبکہ انشائیہ ادب کی ایک خاص صنف اور تحریر کی ایک مخصوص صورت ہے۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ انشائیہ کی وحشت میں غمناکی کی بجائے طربناکی ہوتی ہے اور مزاح انشائیہ نگار کی سیرت کا خمیر۔ انشائیہ کی شگفتہ بیانی طنز و ظرافت کی سرحدوں پر بھی لے جاتی ہے لیکن طنز و ظرافت کی کثرت کے باوجود انشائیہ میں ذہن کی آزاد ترنگ کا وصف باقی رہتا ہے جو اس کو خالص

مزاحیہ یا ظریفانہ یا طنزیہ تحریر نہیں بننے دیتا۔ ایک انشائیہ نگار، مزاح نگار، طنز نگار اور ظرافت نگار ہو سکتا ہے لیکن ہر مزاح نگار یا طنز نگار یا ظرافت نگار، انشائیہ نگار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مزاح، طنز اور ظرافت کی نوعیت توصیفی ہے، صنفی نہیں۔ اس بنا، پر عین ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے ادب کی نمایاں صفت کے اعتبار سے مزاح نگار یا ظرافت نگار یا طنز نگار ہو، لیکن اپنے ادب کی صنف کے لحاظ سے انشائیہ نگار یا ناول نگار یا ڈرامہ نگار ہو۔ مثال کے طور پر ہم رشید احمد صدیقی اور کنہیا لال کپور کا نام پیش کر سکتے ہیں جو خالص مزاح نگار بھی ہیں اور بہترین انشائیہ نگار بھی۔

□□□

محرکِ بحث: سلیم آغا قزلباش

شرکائے بحث: غلام الثقلین نقوی، جمیل آذر، اقبال آفاقی، مرزا حامد بیگ

انشائیہ (مباحثہ)

سلیم آغا قزلباش:

یوں تو انشائیہ نویسی کے فن پر بہت سے اعتراضات کئے گئے ہیں مثلاً اسے کسی جامع تعریف سے محروم صنف نثر کہا گیا ہے مگر حال ہی میں چند نو وارد گرہ کشایانِ سلسلہ ادب، نے انشائیہ پر چند نئے اعتراضات عائد کردئے ہیں۔ اس ضمن میں ایک الزام یہ ہے کہ انشائیہ خوشحال اور متمول افراد اور اقوام کی ''ذہنی عیاشی'' کے سوا اور کچھ نہیں۔ اپنے اس الزام کو تقویت پہنچانے کے لئے یہ دلیل دی گئی ہے کہ انشائیہ کا بانی مونتین ایک متمول گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ شعروشاعری سے رغبت تھی مگر وہ بحیثیت شاعر ناکام رہا چنانچہ وہ اپنے گھر بیٹھ رہا اور پھر وقت کاٹنے کے لئے ایک ایسی تحریر لکھنی شروع کی جو بعدازاں اینسے کے نام سے مشہور ہوئی۔ بس ثابت ہوا کہ انشائیہ ایک معاشی اعتبار سے خوشحال فرد اور اسی اعتبار سے ایک خوشحال اور متمول معاشرے کی پیداوار ہے۔ ان معاشروں سے اسے کوئی علاقہ نہیں جو طبقاتی جنگ میں مبتلا ہیں یا غربت جن کا نوشتہ تقدیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس زاویہ نگاہ کی صحت کی خرابی کے ضمن میں کسی بھی ہوشمند قاری کو شبہ نہیں ہوسکتا۔ وجہ یہ کہ مونتین تو خیر ایک انتہائی امیر آدمی ہوا مگر انشائیہ کے فروغ کے سلسلے میں جو متعدد نام ابھرتے ہیں مثلاً ایڈیسن، سٹیل، گولڈ سمتھ، ولیم ہیزلٹ، چارلس لیمب، ایچ بیلاک، رابرٹ لنڈ، ور جینا وولف، چسٹرٹن، لی ہنٹ وغیرہ، کیا یہ سب لوگ اپنے معاصر ادباء کی بہ نسبت زیادہ خوش حال تھے کہ انشائیہ کی طرف راغب ہوئے؟ پھر آپ ان ادباء کے بارے میں کیا کہیں گے جو بیک وقت شاعر، نقاد، افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی تھے۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ جب ان میں کسی ادیب کی جیب میں زیادہ سکے کھنکتے تھے تو وہ انشائیہ لکھتا تھا۔ جب معاشی حالات ذرا دگرگوں ہوتے تو افسانہ تحریر کرتے، جب رات کا کھانا نصیب نہ ہوتا تو شاعری کرتا اور جب

دونوں وقت کے کھانے سے محروم ہوتا تو نثری نظم تحریر کرتا؟ میرے نزدیک یہ اعتراض ہی سرے سے بے معنی ہے۔ انشائیہ خودرَو ہے اور جب وجود میں آنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو پھر سورج کی طرح یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی روشنی غریب کے جھونپڑے تک پہنچ رہی ہے یا امیر کے ایوان تک۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی دیکھئے کی غربت یا امارت براہ راست کسی صنفِ ادب کے انحطاط یا فروغ کا باعث نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انشائیہ ایک ایسے ماحول کی پیدوار ہے جو پُرسکون ہو یعنی معاشی، معاشرتی یا نفسیاتی مسائل سے دوچار نہ ہو۔ مگر انشائیے کے سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اسے زیادہ فروغ یورپ میں ملا ہے اور اس زمانہ میں ملا ہے جب یورپ مختلف قسم کے معاشی، سیاسی، نفسیاتی اور معاشرتی مسائل سے دوچار تھا اور متعدد جنگوں نے اس کی بنیادیں تک ہلا دی تھیں۔ یہ وہی یورپ ہے جس میں موجودیت ایسے فلسفے کو پنپنے کا موقع ملا جو معاشرے میں بے معنویت، بیزاری اور متلی کی کیفیت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ تمام چیزیں اس بات کی طرف ہی تو اشارہ ہیں کہ یورپ کا فرد ذہنی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشی سطح پر ایک عجیب سی بے اطمینانی کا شکار ہے۔ گویا یورپ میں سکون اور اطمینان کی کیفیت ناپید ہے مگر اس سب کے باوجود وہاں انشائیہ ذوق وشوق سے لکھا جا رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انشائیہ کی تخلیق کسی مخصوص معاشرتی صورت حال کے تابع نہیں بلکہ فرد کی ذات کی ایک خاص کیفیت یا مزاج سے جنم لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب کوئی فرد متلاطم سمندر میں ایک پُرسکون جزیرے کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور سمندری طوفان کر فاصلے پر سے دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہے تو اس کے ہاں انشائیہ کی روش وجود میں آتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی مثال مہاتما بدھ کی ہے جو امارت اور دولت کے ماحول کو چھوڑ کر جب برگد کے درخت کے نیچے آ بیٹھا اور یوں دنیا کے بحرِ بیکنار میں ایک جزیرے کو اپنا مسکن بنالیا تو اس کے ہاں زندگی کو فاصلے سے دیکھنے کا جوہر پیدا ہوا۔ یہی آگہی کا وہ لمحہ تھا جو انشائیہ کا اصل مزاج ہے کیونکہ انشائیہ نگار بھی اشیاء، کیفیتوں اور مسائل کے جھرمٹ میں آئے ہوئے فرد کو ان سے علیحدہ کر کے ان کے مخفی مطالب کو گرفت میں لینے کی سعی کرتا ہے۔ دوسری اصناف ادب میں مکمل شرکت Involvement ملتی ہے مثلاً شاعری یا افسانہ نگاری میں شاعر، یا افسانہ نگار، اپنی تخلیق کے ماحول میں پوری طرح کھو جاتا

ہے۔ دوسری جانب فلسفے یا علوم کے میدان میں وہ اس ماحول سے بالکل الگ ہو کر ایک ناظر بن جاتا ہے۔ مگر انشائیہ میں شرکت کے باوجود اسے ایک ناظر کا منصب حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایک بالکل مختصر سا لمحہ ہے جس میں انشائیہ نگار مکمل طور پر سکون اور اطمینان حاصل کر کے پوری کائنات کو عارف ایسی عمیق نظر سے جانچتا ہے اور اشیاء پر سے دھول اور دھبے اتار کر ان کی اصل صورت آپ پر واضح کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس میں قطعاً شک و شبہ نہیں کہ جب تک فرد اس دنیا کے انتشار میں رہتے ہوئے ایک لمحہ عافیت نہ تلاش کرے، وہ انشائیہ نگار کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا محض فارغ البالی اور خوشحالی انشائیہ کی محترک ہے ایک ایسی بات ہے جس میں صداقت کا شائبہ تک موجود نہیں۔

انشائیہ نگاری پر ایک اور الزام یہ عائد ہوا ہے کہ یہ فرد کی شخصی زندگی سے متعلق ہے اور اس لئے اجتماعیت سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ میرے نزدیک یہ اعتراض بھی وزنی نہیں ہے۔ اول تو فرد کی شخصی زندگی اور اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اجتماعی زندگی میں حد فاصل قائم کی ہی نہیں جا سکتی۔ کیا کوئی ایسا فرد بھی ہے جو باہر کی اجتماعی زندگی سے منقطع ہو کر زندہ رہ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے حواسِ خمسہ وہ ڈوریاں ہیں جن سے فرد اپنے ماحول سے پوری طرح بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنے حواس خمسہ سے محروم ہو جائے اور اپنے ماحول سے کوئی رشتہ ہی باقی نہ رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اجتماعیت کو محض باہر کی دنیا میں فرض کرنا اور انفرادیت کو فقط انسان کے اندر کی پوری دنیا تصور کرنا بھی تو ایک واہمہ ہے۔ فرد کے آئینہ جاں میں تو باہر کی پوری دنیا منعکس ہو رہی ہے۔ ہر فرد اپنی جگہ ایک انجمن ہے اور اس کی ذات میں زمانہ حال ہی نہیں زمانہ ماضی کی ساری خلقت بھی ہر وقت موجود رہتی ہے۔ نفسیات والوں نے اس معاملہ کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ انشائیہ نگار صرف اپنے شخصی معاملات پر لکھتا ہے، ایک غلط بات ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی ذات کے جام جہاں نما میں سارے عالم کا نظارہ کرتا ہے تو پھر یہ درست بات ہے لہٰذا انشائیہ نگار کو اجتماعیت سے کٹا ہوا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ویسے میرا خیال یہ ہے کہ وہ لوگ جو اجتماعیت کی بات کرتے ہیں دراصل ادب کی مقصدیت کی بات چھیڑتے ہیں۔ کہنا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ادب کو عوام الناس کے مسائل کو موضوع بنانا چاہئے اور چونکہ انشائیہ

عوام الناس کے مسائل مثلاً طبقاتی کشمکش وغیرہ کو موضوع نہیں بناتا، لہٰذا یہ ایک ایسی بے مقصد صنف ادب ہے جس کا اجتماعیت سے کوئی ناطہ نہیں۔ دراصل یہ بحث انشائیہ کے علاوہ دوسری اصناف ادب کے بارے میں بھی چھیڑی جا سکتی ہے بلکہ چھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ جدید نظم اور ترقی پسند نظم، جدید افسانہ اور ترقی پسند افسانہ وغیرہ کے مباحث میں صاف پتہ چلتا ہے کہ ایک طبقہ عوامی ادب کا طلب گار ہے اور دوسرا انسانی ادب کا۔ انشائیہ حقیقتاً انسانی ادب کی ایک صورت ہے۔ انشائیہ نگار انسان کو اس کے کائناتی تناظر میں رکھ کر سوچتا ہے۔ اسے محض طبقات میں منقسم کر کے اس پر غور و خوض نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے آپ بے شک کہہ لیں کہ یہ اس قسم کی مقصدیت اور افادیت کا علمبردار نہیں مگر آپ اس طور اگر سوچیں کہ انسان کی اندھا دھند جذباتی اور طوفانی دوڑ میں انشائیہ ایک ایسی بریک ہے جو گاڑی کی رفتار کو کم کر کے انسان کو حادثے سے بچانے کی سعی کرتی ہے تو پھر اس کی افادیت کا ایک انوکھا زاویہ ضرور سامنے آئے گا۔ انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک جذباتی دوڑ میں غرق ہے۔ انشائیہ عافیت کا وہ لمحہ ہے جس میں وہ دوڑتے دوڑتے یک لخت رک کر اپنی دوڑ کی مضحکہ خیزی اور بے معنویت کے احساس سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اگر یہ احساس بجائے خود افادیت کے احساس کا روپ نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

ان گزارشات کے بعد انشائیہ کے سلسلے جو سوال میرے ذہن میں ابھرے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کیا انشائیہ محض خوشحال اور متمول افراد اور قوموں کا ایک مشغلہ ہے یا ہم اسے آگہی کا وہ لمحہ کہہ سکتے ہیں جو کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت حاصل ہو سکتا ہے؟

۲۔ کیا انشائیہ محض شخصی زندگی کی کہانی ہے اور اجتماعیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں؟

۳۔ کیا انشائیہ ایک غیر افادی اور بے مقصد صنف نثر ہے۔ کیا افادیت اور مقصدیت کی توضیع کئے بغیر ہم انشائیہ پر اس قسم کا الزام لگانے میں حق بجانب ہیں؟

مرزا حامد بیگ

یہ جو کہا گیا ہے کہ فارغ البالی اور خوشحالی انشائیہ کی محرک ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کی بنیاد یہ مشہور انگریزی مقولہ ہے کہ: ”جو لوگ عزت دار ہوں گے ان کے انشائیے بھی

عزت دار ٹھہریں گے"۔
لیکن صاحب یہ سوچ کا انداز یورپ میں بھی غلط ثابت ہو چکا ہے۔ انشائیہ کے ضمن میں دیگر متمول افراد کی خامہ فرسائی کے ساتھ بہت سے دیگر نیک نام بھی، انشائیہ لکھتے ہیں ناکام رہے ہیں۔ مثلاً ایلیٹ، آڈن اور سپنڈر نے بھی انشائیے لکھے ہیں لیکن کامیاب بطور نقاد اور شاعر ہوئے۔ جان ڈین اور ای ایم فوسٹر کو بطور انشائیہ نگار چنداں شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح ہیمنگوئے، بکسلے، وڈہاؤس، اینگس ولسن اور جارج آرویل کی شہرت آج محض ناول نگار ہونے کی حیثیت سے ہے۔

پاکستان میں درآمدہ نفسیات کی تازہ ترین کتاب 'سائکالوجی' از B-von gimer تک تو میں نے ابھی تک کہیں نہیں پڑھا یا سنا کہ تخلیقی فکر پر کہیں غربت یا امارت کو اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھا یا محسوس کیا گیا ہو۔ تخلیقی صلاحیت تو انسانی زندگی کی ابتدائی حالتوں میں ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیتی ہے جب کہ نہیں پتہ ہوتا کہ مستقبل میں انسانی مقدر میں امیری ہے یا مفلسی۔ تخلیقی ادراک کی بھی یہی کیفیت ہے کہ اتھارٹی اس کے نزدیک قطعی شے نہیں ہے۔ یہ پرکھ کی آزادی کیٹس سے کہلواتی ہے کہ:

"Beauty is truth.,truth is beauty"

کیٹس جو انتہائی مفلسی میں رومانی ہے اور جس کا مقدر چھبیس سال کی عمر میں ٹی بی سے مرجانا ہے۔ انشائیہ کے فروغ کے سلسلے میں جو بڑے نام آتے ہیں ان میں سے خوشحال فرد، ایک بیکن ہی ہے جو کہ "لارڈ" تھا۔ سو یہ اعتراض تو بے معنی محض ہے کہ انشائیہ متمول اور خوشحال افراد یا اقوام کا مشغلہ ہے۔ البتہ انشائیہ مخصوص تہذیبی مزاج، بردباری، ٹھہراؤ اور متوازن شخصیت کا ہمیشہ طلب گار رہا ہے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ آدمی کے اندرونی تاریک براعظم اور اردگرد کی سماجی حقیقت میں کوئی علاقہ ہے یا نہیں؟ ہمیں ماننا پڑے گا کہ داخلی تجربات پر سوچ بچار کئے بغیر سماجی حقیقت اور خارجی اعمال پر اس کے اثر کا شعور حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اپنی ذات سے آگہی کائنات میں ہماری حیثیت کا تعین کرتی ہے۔ یہ خود آگہی اجتماعیت

کی سطح پر گھناؤنے حقائق سے پردہ اٹھانے کا دوسرا نام ہے۔ وہ لوگ جو اپنے تاریک براعظم کے مسافر بنتے ہیں ترقی پسند انجمن امداد باہمی طرز کی تحریکوں کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ اس لئے کہ فرد کی ذات کا سناٹا دوسری ذاتوں میں بولنے لگتا ہے اور تمام انسانی ذاتوں کے باطن تک پھیل جاتا ہے۔ یہ اپنی ہستی کے محدود دائرے سے نکل کر پوری انسانی تاریخ کے تجربے میں شرکت ہے۔ داخل بینی کی ایک کوشش نظریاتی حوالے سے بھی کی گئی ہے اور بیشتر ترقی پسند ادب پر یہ افتاد پڑی کہ فن کار کا اظہار ذات منفی فسفو اور عقلیت پسندی کی نذر ہو گیا۔

در حصل ادبی مسائل کی اہمیت اور نوعیت فلسفیانہ، اخلاقی، مذہبی، نفسیاتی یا فلاح و بہبود کے مسائل سے مختلف ہوتی ہے۔ اس بات کو سمجھنے میں اجتماعیت کی بات کرنے والے اکثر ادیبوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ وہ اپنی مسائلی تحریروں میں سماجی مسائل کو ادبی مسائل سمجھ کر رکھتے ہیں اور برتتے رہے۔ ادیب کا منصب مسائل کا حل پیش کرنا نہیں ہے وہ تو خود اپنے اور اجتماعی فکری دھارے کا رخ مسائل کی جانب موڑتا ہے اور بس۔

رہا یہ سوال کہ انشائیہ کس حد تک افادی پہلو لئے ہوئے ہے؟ اور اس کی مقصدیت کے بارے میں ترقی پسندوں کی پوچھ گچھ تو یو جین آئنسکو نے ایسے سوالات اٹھانے والوں سے جواب دینے کے لئے بیس سال کی مہلت طلب کی تھی اور کہا تھا کہ "یہ ضروری نہیں کہ میں بیس سال بعد بھی اس کا جواب دے پاؤں"۔

ادب کی افادیت اور مقصدیت کے ضمن میں جو تصورات ملتے ہیں ان میں ادب کا مسرت بخش ہونا درس و ترغیب اور Spell Bound کر دینے کی صلاحیت بنیادی نکات رہے ہیں اور ان پر کافی بحث مباحثہ ہو چکا ہے۔ جب کہ اعلیٰ فن پارے کا تخلیقی اظہار ہمیشہ زندگی کے مماثل بلکہ اسی مترادف رہا ہے۔ اس طرح بقول سجاد باقر رضوی اگر زندگی کا مقصد فرد کا تخلیقی اظہار ہے تو کسی بھی فن پارے کا مقصد آدمی کے تخلیقی رویوں کا اظہار ہی ہے۔ تخلیقی فن پارے میں مقصد کی بنیادیں وسیع تر انسانی زندگی کے تخلیقی رویے بنتے ہیں جن کا جنم مقصد اور ذریعہ کی اکائی سے ہے۔ اسی طرح رویے کا تعلق عمیق سوچ سے ہے اور اس کا نتیجہ واضح اور ٹھوس نکتہ نظر تک رسائی ہے۔

انشائیہ اپنی تدبیر کاری میں خاص طرح کی Meditation کے ذریعے زندگی کے

حقائق اور تخلیقی رویوں کی تلاش کرتا ہے۔ یہ فرد کی حالت اور حیثیت کو نئے رخ سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ میں اس بات سے متفق نہیں کہ انشائیہ انسانی زندگی میں محض فرد کی مضحکہ خیزی اور زندگی کی بے معنویت کی تلاش کرتا ہے۔

سوشل کمنٹری اور Human Element انشائیہ کے لئے ضروری ہیں ۔ یہ محض Isolation کے شکار فرد کی تحریر ہرگز نہیں البتہ جس سطحی Human Element کی انشائیہ سے Demand کی جارہی ہے اس کا یہ متحمل نہیں ہوسکتا۔ بیسویں صدی میں انشائیہ نگار سوشل کمنٹری کی خوبصورت مثالیں سامنے لائے ہیں۔ ادب کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ بعض انشائیوں میں اٹھائے جانے والے سوالات کے ذریعے حکومتی سطح پر بھی سوچ کو ایسی مہمیز لگی کہ بعض سماجی اور سیاسی مسائل کے الجھاوے رفع ہو گئے۔

اُردو انشائیہ نے شاید اب تک کوئی معاشرتی خدمت تو انجام نہ دی ہو البتہ اپنی Existence کا اظہار یقیناً بہت ٹھوس بنیادوں پر کر چکا ہے۔ مثال کے طور پر اردو نثر اور اُردو مضمون نگاری نے اب تک محض کسی شے کی جزوی تفصیلات کی فہرست سازی سیکھی تھی۔ اسے منتخب مواد کو مکمل وحدت کی شکل دینا ابھی تک نہیں آیا اور بیشتر تحریریں بغیر کسی Meditation کے ظہور پذیر ہوئی اور بیشتر مضمون نگار شے کے تاثراتی اظہار پر قدرت نہیں رکھتے۔ اُردو انشائیہ نے اپنے مخصوص بردبارانہ اظہار کے طفیل ہمیں پہلی بار اشیا کو دھیرج کے ساتھ دیکھنا سکھایا ہے اسی طرح یہ اُردو انشائیہ کی دین ہے کہ اُردو نثر کو مربوط فکر کا تسلسل نصیب ہوا اور یہ اس لئے ہوا کہ انشائیہ جذبہ و فکر کے ساتھ یک رنگ ہو کر سامنے آتا ہے اور محسوسات، نیز سوچ کے وسیع تر امکانات سامنے لاتا ہے۔ یہ اتنا بڑا تخلیقی کارنامہ ہے جس کے لئے عام طور پر کسی بڑی فکری تحریک کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جب کہ ہمارے ہاں لے دے کے کٹر مذہبی، سیاسی اور انجمن امداد باہمی کی تحریکیں سامنے آتی رہتی ہیں۔

اقبال آفاقی

یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ ان دنوں ہمارا ادب مغالطوں کے عرصۂ ہوس میں ہے کہ درحقیقت ہم نے مغالطوں کو محاکموں کے روپ میں پیش کرنے کو ہی تنقید سمجھ لیا ہے۔ فکری

شفاف دھارا ہمارے اندر بہتی رہتی ہے لیکن ہم اس کی آواز پر کان دھرنے کی بجائے تعصبات کی سوفسطائی لہروں کو ناپتے رہتے ہیں۔ اقدار کا تقدس بحران کے دنوں میں ہے شخصی ''میں'' (واحد متکلم) ہر چیز کا معیار ہے۔ ہر شخص اپنی خودی کو بلند کر رہا ہے۔ اپنی رضا کی بلند مینار پر ایستادہ ہے۔ علم اور معروضی صداقت اس کے لئے نسبتاً کم تر حقائق ہیں واحد حاضر اس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ قرار پا چکا ہے اور وہ غیر خود کے ہر نشان کو تہ و بالا کر دینے کے درپے ہے۔ اس لئے ہمارا ادیب اور نقاد بھڑکیلے نعروں اور اخباری بیانات پر ایمان لے آیا ہے۔ اخبار میں اپنی تصویر اور حوالے کو دیکھ کر اسے ترفع ملتا ہے۔ اس کی ایذا پسندی اور مسوکسٹ رویہ تسکین پاتا ہے۔ جیسے بہت سے سیاست دانوں اور مہم پسندوں کو اخبارات نے بے بصارت کیا ہے بعینہٖ ہمارے ہاں بہت سے ادیب، شاعر اور نقاد ستی شہرت کی Summer Madness کا شکار ہو کر موہومات اور مغالطوں کی ہوائی چکیوں سے نبرد آزما ہیں اور بزعم خود قلعوں پر قلعے فتح کرتے جا رہے ہیں۔ سوڈو مارکسی بھڑکیلے نعروں سے لے کر متشدد نیم مذہبی الزامات کے علم ان کے ہاتھ میں ہیں۔ شکست خوردہ ذہنیت کا یہ ایک اور المیہ ایک اور دکھ ہے کہ ہم کسی صنف ادب یا فن پارے کی بذاتہ قدر و قیمت کا تعین کرنے کی بجائے ذاتی طعن و تشنیع اور محاذ آرائی پر اتر آتے ہیں۔ فی الاصل کوئی بھی فن، ادب اور صنفِ ادب معاشرے کو طبقات میں تقسیم نہیں کرتا اور نہ ہی اسے طبقاتی تقسیم کی تھیوری کے حوالے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے مسترد ہونے کی وجہ بھی یہی فارمولا سوچ تھی۔ پھر نوبل پرائز یافتہ 'اور ڈان بہتا رہا' اور ڈاکٹر ژواگو، اس معیار، اس پرکھ اور اس فارمولے کی بالصراحت تردید کرتے ہیں۔ یوں میرے نزدیک مونٹین کے انتہائی امیر ہونے کو معذرتی انداز میں نہیں لیا جا سکتا، اس کے انتہائی امیر ہونے سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ ایسے صرف متمول اقوام اور افراد کے لئے مخصوص اور مقسوم ہے اور اگر اس استدلال کو براہ راست عارضی طور پر بھی قبول کر لیا جائے تو اس کے قیاس پر بہت سی بے ہنگم اور Crude مثالیں پیش رفت کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مارکس یہودی تھا اس لئے مارکسی نظام بھی یہودیت کا ایک روپ ہے، یہاتما بدھ راجکمار تھا اس لئے اس کی تعلیمات راجکماروں کی جاگیر ہیں، یا یہ کہ حضرت عیسیٰ بیت اللحم کے رہنے والے تھے اس لئے ان کا مذہب صرف

بیت الحم والوں کے لئے مخصوص تھا۔ مثالوں کو فہرست بہت طویل ہے۔

پھر ادب میں ذہنی عیاشی کا تصور بھی آخری نتیجے میں ایک متنازعہ فیہ مسئلہ رہا ہے۔ مذہبی سیاق وسباق اور متن میں شاعری ذہنی عیاشی کے سلبی درجہ قدر پر فائز ہے جب کہ مارکسی دائرہ کار میں خالص ادب ایک رجعت پسند اور رومانٹک ایکٹویٹی ہے جسے وہ فرادیت پسندی اور ذہنی بیماری قرار دیتے ہیں۔ آپ اسے ذہنی عیاشی کا نام بھی دے سکتے ہیں کہ ہم آپ نیم پخت سرمایہ دارانہ سماج میں زندگی کے سانس گن رہے ہیں اور الزامات کے Tranquilisers کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ تو جناب انشائیہ کو الزامات دینے سے شخصی آشوب سے چھٹکارا نہیں ہوگا۔ اصل مسئلہ تو Bad Faith سے نجات ہے۔

دوسرا پرت یہ کہ ادب میں اجتماعیت بھی منافقت میں بھیگا ہوا ایک رزق برق نعرہ ہے۔ ادب اپنے مقام اور معیار پر فی نفسہ ایک شخصی زندگی کی کہانی ہے اور اس کی ترسیل اور ابلاغ بھی ایک شخصی تجربے اور ترفع کے معنوں میں لیا جاتا رہا ہے۔ یہی سبب کہ ادب میں کبھی بھی یوٹیلیٹی سٹورز جائنٹ وینچرز اور اجتماعی سودکاری کے امکانات پیدا نہیں ہوتے۔ میرے نزدیک انسانی اور عوامی ادب کی تقسیم ادبی محاذ آرائی کا حصہ ہے، ناقابل فراق کا فراق ہے، روح اور جسم کی دراڑ کے مساوی ہے۔ ظاہر ہے ادب اپنے تمام رنگوں اور لینڈ اسکیپ کے ساتھ انسیت اور انسانیت سے مربوط حقیقت ہے۔ انسیت اور انسانیت میں عوامی شناخت بالواسطہ پر مضمر ہوتی ہے، تاہم صراحتاً بات پروپیگنڈہ بن جاتی ہے۔ ادب ہمیشہ (میں) کے راستے سے تو کی طرف منتقل ہوا ہے کہ دراصل موضوعی شخصی تجربہ ہی ایک کلی صداقت وشراکت کی صورت میں عوام کے دلوں پر سنہری دھوپ کی طرح اُترتا ہے۔ اسی حوالے سے ہر اعلیٰ صنفِ ادب کی طرح انشائیہ بھی داخلی حسی شراکت پر کاربند ہو کر لوگوں کے دلوں پر سنہری دھوپ کی طرح اترتا ہے یہی اس کے وجود کی مثبت دلیل ہے۔

تیسرے سوال میں افادہ اور مقصد اپنے سابقوں کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ اگر ان سابقوں کو الگ کر کے ایک تجزیاتی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان الفاظ کے درمیان اصطلاحی طور پر ستون اور معانی کا بعد قطبین ہے۔ مقصد اور مقصدیت اخلاقی مذہبی اور ماضی قریب میں ہمارے ہاں ترقی پسند نظریہ ادب کے معنی میں مستعمل رہے ہیں۔ اس کے

برعکس لفظ افادہ رواں حال میں سرمایہ دارانہ معاشیات کے مرکزی خیال کے طور پر ابھرا ہے۔ یوں ایک سانس میں متخالف اصطلاحوں کا ہم معنی استعمال ایک لسانی اور منطقی مغالطہ ہے کہ ایک کا دوسرے سے استخراج یا ایک کو دوسرے کے عین قرار دینا صریحاً غیر ذمہ داری کے مساوی ہے۔ اب مقصدیت کے مذہبی، اخلاق یا مارکسی تناظر کی بات۔ یہ تو بالکل واضح ہے کہ ادب کا کام گروہی یا طبقاتی مفادات کا تحفظ نہیں، اس سے تبلیغ، ہدایت اور نظریاتی قلعہ بندی کے لئے کام نہیں لیا جا سکتا اور نہ ہی یہ کل سے جز کی طرف سفر کرتا ہے تو یہ تو خوشبو کی لکیر اور رنگ کی لہر ہے جو میں سے تو کی طرف مہکتی چلی جاتی ہے۔ یہی بات انشائیہ کی پہچان کا ایک خوبصورت حوالہ بنتی ہے، پھر انشائیہ وال سٹریٹ کے بازار حصص کا مسئلہ نہیں جب کہ افادہ تو طلب ورسد کی منڈی، نا مختتم مساوی ہوس، جسی خواہشات وآسائشات اور Consumer's Economy کا بلیک ہول ہے، کوئی بھی صنف ادب اس بلیک ہول کے حبس اور تعفن کی متحمل نہیں ہو سکتی، انشائیہ تو ویسے بھی سبز گھاس کی پتیوں کی مانند نرم و نازک اور فاختہ کی طرح امن پسند صنف ادب ہے۔ جس کے لئے کھلا نیلا آسمان اور اخلاقی ہوئی خنک ہوا بنیادی ضرورت ہیں۔

یوں انشائیہ کی بڑی صفت یہی ہے کہ یہ کسی ترغیب، تحریص، تحریک یا پروپیگنڈہ کے لے بطور حربہ قطعاً استعمال نہیں ہو سکتا اور نہ ہی سود و زیاں اور افادہ مقصد کی منڈی میں یہ کرنسی کا کام دے سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو الزام لگانے والے یقیناً حق بجانب ہیں۔

جمیل آذر:

انشائیہ کے بارے میں سلیم آغا قزلباش نے بڑے اہم اور مناسب سوالات کئے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے خود ہی سوالات اور اعتراضات کے، جوابات حقائق اور شواہد کی روشنی میں فراہم کر دیئے ہیں تاہم ان پر مزید روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک ریڈیائی بحث میں ایک فاضل نقاد نے نہایت تعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا تھا کہ انشائیہ لکھنا خوش حال لوگوں کا مشغلہ ہے۔ کیونکہ بقول اُن کے اس صنف اظہار کا بانی مونٹین ایک متمول خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ میرے خیال میں ادب کی کسی صنف سخن کے بارے میں ایسی مضحکہ خیز بات غالباً آج تک کسی سلیم العقل نقاد نے نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ

یہ نقاد اپنے مخصوص تعصبات کی وجہ سے ترقی پسند نظریات سے وابستہ ہے اور ادب کی
ہر صنف اظہار کو اسی رنگدار عینک سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا یہ تو رہی اُس کی بات یا وابستگی مگر سوال
یہاں نظریاتی وابستگی یا ذاتی پسند یا جانبداری کا نہیں ہے بلکہ آفاقی اصول یا قدر کا ہے۔ تخلیق
ادب یا تنقید ادب کسی امیر یا غریب کی میراث نہیں۔ یہ تو عطیہ خداوندی ہے اور جہد مسلسل
ہے۔ کسی کے بھی حصہ میں آسکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اپنا وقت تخلیق ادب میں صرف کرتا ہے تو
یہ اس کے نیک اعمال میں شمار ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی غریب آدمی اپنے محدود وسائل کے
باوجود اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو علم و ادب کے لئے استعمال کرتا ہے تو یہ اس کی عظمت و بلندی
کی دلیل ہے۔ وہ اپنا قیمتی وقت تخلیق ادب و فن کی بجائے روپیہ کمانے میں بھی تو صرف کر
سکتا ہے کیوں کہ تخلیق، اس غریب فن کار کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی! تخلیق نہ تو امیر آدمی کی امارت
میں اضافہ کرسکتی ہے اور نہ غریب کی مفلسی کو دور کرنے میں معاون ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا
تو غالب تخلیقِ شعر سے متمول بن جاتا اور بہادر شاہ ظفر اپنے تخت و تاج کو بچالیتا۔ ادب کا
تعلق روح اور جذبات لطیف سے ہے نہ کہ کاروباری مادیت سے۔ ادب کا نور جب امیر
کے دل و دماغ میں ضیاپاشی کرتا ہے تو اس کے اندر لطافت، ترفع، انسانیت اور ہمدردی جیسے
جوہر پیدا ہوتے ہیں اور جب ادب کی شمع غریب کے ہاں روشن ہوتی ہے تو وہ ان تمام
مشکلات پر قابو پالیتا ہے جو اس کے راستے کا پتھر ہوتے ہیں۔ وہ ''بہ زمانہ ستیز'' بن کر ابھرتا
ہے اور زمانہ کے اسپ تازی پر سواری کرتا ہے اور آئندہ نسل کے لئے ایک مثالی ہستی بن
جاتا ہے۔ دراصل تخلیق ادب سے فن کار مادی کثافت سے رستخیزی حاصل کر کے سبک اور
لطیف ہوتا ہے اسے ہم تطہیر جذبات بھی کہہ سکتے ہیں۔

اب رہا سوال ادب کی ایک لطیف صنف اظہار انشائیہ کا تو مونٹین کی خوش حال زندگی
سے یہ کیسے نتیجہ اخذ کرلیا کہ یہ صنفِ سخن بس متمول لوگوں سے ہی وابستہ ہے۔ انشائیہ کے
معترض نقاد کو علم ہونا چاہئے کہ انشائیہ میں تو پھر کہیں کہیں غم اور دردمندی کی پرچھائیاں
آجاتی ہیں جب کہ طنز و مزاح سے مملو فن پاروں میں غم ناک واقعات کی کوئی گنجائش تک نہیں
ہوتی۔ اس اصول کی روشنی میں تو پھر طنز و مزاح صرف امراء و روسا کو ہی اختیار کرنا چاہئے۔
حالانکہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ بیشتر طنز و مزاح نگار نے بڑے نا مساعد

حالات میں زندگی بسر کی ہے۔ اُردو مشہور مزاح نگاروں میں کتنے لوگ ہیں جو متمول اور خوش
حال رہے اور راجہ مہدی علی خان، کنہیالال کپور اور شوکت تھانوی وغیرہ متوسط گھرانے کے
لوگ تھے۔ یہی حال انشائیہ نگاروں کا ہے۔ سلیم آغا قزلباش نے بالکل درست کہا ہے کہ
چارلس لیمب، ولیم ہیزلٹ، رابرٹ لنڈ، ورجینا وولف وغیرہ بھی متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے
تھے۔ خود مونٹین نے اپنی مالی خوش حالی کے باوصف بڑے نامساعد حالات اور کٹھن زندگی
کا سامنا کیا تھا۔ دراصل کسی صنف سخن کو امیر اور غریب کے ساتھ وابستہ کرنے کا رجحان ہی
غیر معقول اور مضحکہ خیز ہے۔ شاید مارکسی نقطۂ نظر کے نقاد ہی اس قسم کی طبقاتی تقسیم کا تصور
کرسکتے ہیں۔ ادب نہ بورژوائی ہوتا ہے اور نہ پرولتاری۔ ادب کی نورانی شعاعیں امیر اور
غریب کی تمیز کئے بغیر سب پر یکساں پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میتھیو آرنلڈ نے ادب کے
اس مخصوص مزاج کو دیکھتے ہوئے کہا تھا کہ مستقبل میں شاید مذہب کی جگہ ادب لے لے۔ وہ
ادب کو مذہب انسان کا مقام بخشتا ہے۔ مونٹین نے انشائیے اس لئے نہیں لکھے کہ وہ امیر
آدمی تھا بلکہ اس نے انشائیے اس لئے تخلیق کئے کہ وہ زندگی کا بڑا گہرا اور وسیع تجربہ رکھتا
تھا۔ اسے علوم متداولہ پر پورا عبور حاصل تھا۔ اس کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ سیاسی و
سماجی زندگی میں بھرپور حصہ لیتا تھا۔ اس نے مختلف سرکاری عہدوں اور پارلیمنٹ کی رکنیت
کے تجربات حاصل کئے تھے۔ وہ اپنی ذہنی تصویر (Mental Portait) کو اپنے دوستوں اور
عزیزوں کے لئے چھوڑنا چاہتا تھا جس میں اس کی تمام خامیاں تک عریاں نظر آئیں اور یہ
کام شہرت اور جلب منفعت سے بے نیاز ہو کر کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس کے انشائیے
انکشاف ذات کے عمل سے مملو ہیں مگر یاد رہے کہ اب انشائیہ صدیوں کی منزلیں طے کرنے
کے بعد بوقلموں خصوصیات کا حامل ہے۔ ہر انشائیہ، انشائیہ نگار کی ذہنی پختگی، تجربہ اور مشاہدہ
کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

انشائیہ لکھنے کے لیے خاص ماحول والی بات بھی اتنی ہی غیر معقول اور مضحکہ خیز ہے جتنی
امیر اور غریب والی بات ہے۔ معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کا ادیب یا شاعر پر اثر ضرور
ہوتا ہے لیکن ہر فنکار اپنی افتادِ طبع کے مطابق خارجی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ خارجی
حالات کی بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ بعض فن کار محض سیاسی حالات سے متاثر ہوتے

ہیں۔ بعض سماجی اور نفسیاتی صورت حالات کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور بعض مابعد الطبیعات اور فلسفیانہ افکار میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ غرضیکہ ہر فن کار اپنی افتادِ طبع کے مطابق موضوعات کو منتخب کرتا ہے۔ جس زمانے میں غالب معنی آفرینی کر رہے تھے، نظیر اکبر آبادی سماجی برائیوں کی نشان دہی کر چکے تھے۔ یہ فرق دونوں کے مزاج اور افتادِ طبع کا ہے۔ یہ بات کہ انشائیہ پر سکون ماحول کی پیداوار ہے، غلط ہے مجھے سلیم آغا قزلباش کی رائے سے اتفاق ہے کہ یورپ اپنی تیز رفتاری اور ہنگامہ خیزی کے باوصف انشائیہ کا مسکن ہے۔

انشائیہ نگار تو اس تیز رفتار زندگی اور افراتفری کے عالم میں ایک لمحہ مسرت تلاش کرتا ہے۔ وہ زندگی کو نئے زوایے سے دیکھتا ہے اور خارجی تناظر میں ایک نیا اور انوکھا پہلو تلاش کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنے انوکھے تجربہ میں شریک کرتا ہے۔ اسے آپ آگہی کا وہ لمحہ بھی کہہ سکتے ہیں جب فرد یافتِ نو سے ہمکنار ہوتا ہے۔

یہ اعتراض کہ انشائیہ محض فرد کی شخصی زندگی سے متعلق ہوتا ہے اور اس کا اجتماعیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، حقیقت سے بعید ہے۔ یوں تو ہر فنکار حساس ہوتا ہے لیکن بقول ورجینا وولف انشائیہ نگار حساس ترین فرد ہوتا ہے جونہی اس کے احساسات لطیف خارجی ماحول سے متصادم ہوتے ہیں تو اس کی روح کے تمام تار مرتعش ہو جاتے ہیں۔ اور یوں اس ردِ عمل کے نتیجہ میں انشائیہ ذات کے حوالہ سے تخلیق کی منزل طے کرتا ہے۔ میری دانست میں تو انشائیہ وجود میں ہی اس وقت آتا ہے جب انشائیہ نگار اجتماعی ماحول سے ٹکراتا ہے اور زندگی میں نئے معانی کا حسین و منفرد ادراک کرتا ہے اور انہیں غور و فکر کی بھٹی سے گزار کر اس دلکش اسلوب سے پیش کرتا ہے کہ اس کی اپنی شخصیت اور ذات کے گوشے آشکارا ہو جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے انشائیہ نگار انبوہ کثیر میں اپنی، انفرادیت کی ننھی سی قندیل اس طرح روشن کرتا ہے کہ اس کی روشنی سے دوسرے لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں یعنی انشائیہ نگار کے تجربہ میں پوری ہم آہنگی کے ساتھ شرکت کر سکتے ہیں۔ اس طرح انشائیہ نگار کا کام اپنے اور دوسرے کے لئے ترفع، مسرت اور سکون کا لمحہ، جانفزا عطا کرنا ہے۔ اس افراتفری اور صنعتی ہیجانی دور میں جب انسان اعصابی کھچاؤ اور نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہے، انشائیہ لمحہ سکون اور عرفان مہیا کرتا ہے اور اعصابی تناؤ کو دور کرتا ہے۔ یہ سوال کہ کیا انشائیہ غیر افادی اور بے مقصد

صنف نثر ہے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ مصوری اور موسیقی تک بے مقصد نہیں تو پھر انشائیہ بے مقصد کیوں ہوا۔ افادیت اور مقصدیت کی توضیح مختلف لوگوں کے پاس مختلف ہوتی ہے۔ تعصبات کا حامل نقاد شاید مقصدیت کو صرف ترقی پسندی کے آئینہ میں تلاش کرے لیکن انشائیہ یا کسی صنف اظہار کی افادیت یا مقصدیت کو تعصبات کی عینک سے نہیں بلکہ عرفان و آگہی کے نور سے دیکھنا چاہیئے۔ انشائیہ نہ صرف ہمارے اعصابی کھچاؤ اور ذہنی خلفشار کو دور کر کے ارفع سوچ، مسرت اور سکون عطا کرتا ہے بلکہ قاری کی تہذیب ذہنی بھی کرتا ہے۔ انشائیہ نگار جمالیاتی تربیت سے زندگی کو از سر نو ترتیب دیتا ہے اور یوں زندگی کو فن کارانہ طور پر گزارنے کا انوکھا زوایہ عطا کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی صنف سخن کی افادیت اور مقصدیت کیا ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ جو ادب کو محض معاشیات سے وابستہ کرتے ہیں ادب کے دامن کو تنگ کرتے ہیں۔ ادب زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کو جزوی طور پر نہیں بلکہ کلی طور پر اپنی گرفت میں لیتا ہے لہٰذا انشائیہ بھی زندگی کے تمام پہلوؤں کو کلیت کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔ انشائیہ تو انفرادیت اور اجتماعیت کا حسین امتزاج پیش کرتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی

سوال نامے کے فاضل مرتب نے جو سوالات اٹھائے ہیں، ان کا نہایت مفصل اور مدلل جواب خود دے دیا ہے۔ شرکائے بحث کے لئے بہت کم گنجائش باقی رہ گئی ہے۔ بہتر ہوتا کہ سوال نامہ صرف انہیں تین سوالات پر مشتمل ہوتا جو اس میں ساسی حیثیت رکھتے ہیں ان کی تشریح و توضیح جواب لکھنے والوں پر چھوڑ دی جاتی۔ بہر حال جو کچھ بن پڑا ہے حاضر ہے۔

ا۔ انشائیہ کیا، پورا ادب خوشحالی فارغ البالی کی فضا ہی میں پروان چڑھ سکتا ہے۔ ادب صرف ایک عارضی یا ثانوی مشغلہ نہیں بلکہ ایک کل وقتی پیشہ ہے۔ بالعموم ادب لکھنے کی صلاحیت خوشحالی اور فارغ البالی سے محروم افراد ہی کو ملتی ہے اور اس پیشے میں کامیاب ہونے والے افراد کی تعداد بھی بہت کم ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ باصلاحیت اور کامیاب لوگ ساری زندگی محرومیوں اور تنگ دستیوں میں بسر کر دیں۔ کامیاب شاعروں، ناول نگاروں اور انشائیہ نگاروں کو کبھی فارغ البالی کی منزل بھی ضرور ملتی ہے اور اس منزل پر پہنچ کر

عام خیال کے برعکس ان کے فن میں کوئی زوال نہیں آتا بلکہ اعتماد اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ انشائیہ لکھنے والوں میں اگر کچھ خوشحال اور متمول لیکن باصلاحیت افراد نے کامیابی حاصل کر لی تو اس سے کسی کلیے کا وضع کر لینا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔ اردو کے انشائیہ نگاروں میں بلاشبہ بعض فارغ البال اور خوشحال ہیں مثلاً مشکور حسین یاد ایک حد تک فارغ البال ضرور ہیں لیکن مشتاق قمر، جمیل آذر اور غلام جیلانی اصغر پر تو یہ کلیہ صادق نہیں آتا۔ اگر انشائیہ آگہی کا ایک لمحہ ہے (جیسا کہ فاضل مرتب نے کہا ہے، تو آگہی کا یہ لمحہ ہزار پہلو بھی تو ہو سکتا ہے۔ شعر اور افسانہ بھی آگہی کے کسی لمحے ہی کی پیداوار ہوتا ہے، صرف طریقۂ اظہار میں فرق ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر انشائیہ نگار شجر حکمت کے گھنے اور ٹھنڈے سائے تلے ہی عرفان حاصل کر سکتا ہے، یہ لمحہ عرفان کیکر کی چھدری چھاؤں تلے چلچلاتی دھوپ میں تنہا فاختہ کے کوکو کے اداس نغمے سے قطرۂ شبنم کی طرح بھی ٹپک سکتا ہے اور اس سے کسی جلتے سلگتے آنسو کی گرمی اور اضطراب کا لاوا بھی ابل سکتا ہے بے شک انشائیے میں شگفتگی کی ایک ہری بھری فضا لازمی ہے لیکن شگفتگی کی تہہ میں سنجیدہ تفکر کی لہریں بھی تو موجزن ہوتی ہیں۔ گویا ادب کی باقی اصناف کی طرح انشائیے میں بھی نور و نار اور سکون و تڑپ کا تماشا دکھایا جا سکتا ہے اور اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔

۲۔ بظاہر انشائیے ہیں انفرادی زندگی کی جھلک زیادہ نمایاں ہوتی ہے لیکن فرد کو آپ اجتماع سے کاٹ کر علیحدہ تو نہیں کر سکتے۔ ہر صنف ادب انفرادیت اور اجتماعیت کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ انشائیہ کو اس کلیے سے مستثنیٰ کیوں قرار دیا جائے؟ انشائیہ نگار جو کچھ لکھتا ہے اپنی ذات میں ڈوب کر لکھتا ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ انشائیہ خارج کے حوالے سے انتشار ذات کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ انشائیہ طبقاتی کشمکش سے دامن کش ہو کر ہی وجود میں آ سکے۔ طبقاتی کشمکش سرمایہ دار معاشرے کا ایک لازمی عنصر ہے اور اس معاشرے کا کوئی بھی فرد اس کشمکش سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی کشمکش سے انتشارِ ذات کی حالت وجود میں آتی ہے اور یہ فرد کے خمیر میں داخل ہو چکی ہے۔ شاید شعوری طور پر تو نہیں لیکن لاشعوری طور پر اس کشمکش کی جھلکیاں انشائیے میں ضرور منعکس ہوں گی۔ آپ کوئی سا انشائیہ لے کر اس کا تجزیہ کیجئے۔ آپ اس کیفیت کو اس میں ضرور موجود پائیں گے۔

۳۔ انشائیہ ایک غیر افادی اور بے مقصد صنفِ نثر بھی نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انشائیہ براہ راست کسی افادیت کا حامل نہیں ہوتا اور کسی مقصد کی تبلیغ نہیں کرتا۔ یہ بات بھی محلِ نظر ہے کہ آیا ادب کی کوئی صنف ایسی بھی ہے جو محض کسی نظریے کی تبلیغ کے لئے وقف ہو۔ تبلیغی ادب کے اپنے اصول ہیں۔ تبلیغ میں بھی ادبی حسن پیدا ہو سکتا ہے لیکن کوئی ضروری نہیں کہ پورے ادب کو صرف افادی، مقصدی اور تبلیغی بنا دیا جائے۔ ادب حسن و صداقت کا علمبردار ہوتا ہے اور بدصورتی اور اندھیروں کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہے۔ اسے بھی آپ افادیت کا نام دے سکتے ہیں۔ عوامی ادب اور انسانی ادب کی حد بندی بھی کوئی صحیح بات نہیں۔ اچھا ادب لازمی طور پر عوامی و انسانی اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ انشائیے میں فرد کے حوالے سے جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ ایک عام آدمی ہی کی عکاسی کرتی ہیں۔

سوال نامے کا یہ فقرہ دیکھئے ”انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک جذباتی دوڑ میں غرق ہے۔ انشائیہ عافیت کا وہ لمحہ ہے جس میں وہ دوڑتے دوڑتے ایک لخت رک کر اپنی دوڑ کی مضحکہ خیزی اور بے معنویت کے احساس سے ہم کنار ہوتا ہے“، فاضل مرتب نے فرد کے اس احساس کو عافیت کا نام دیا ہے۔ مجھے اس نظریے سے اختلاف ہے۔ اول تو میں انشائیے کو عافیت کا لمحہ نہیں سمجھتا اور دوم عافیت بذاتِ خود مستحسن بھی نہیں، اس سے سکون و جمود کی بو آتی ہے۔ انشائیہ تو تحرک کا نام ہے۔ تحرک کا ایک لمحہ ہی انشائیے کا مرکز و محور ہے جس کا بلاشبہ شگفتنِ ذات سے آغاز ہوتا ہے اور انکشاف ذات پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس انکشاف پر کرب کی کیفیت اپنے عروج پر پہنچ کر ایک اطمینان کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے یعنی زندگی کی کوئی بہت بڑی حقیقت منکشف ہو کر کسی بہت بڑی صداقت کا روپ دھار لیتی ہے۔ جو انشائیہ ارتقاء کی ان منزلوں سے نہ گزر سکے اُسے انتشار خیال کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

□□□

جارج لوکاچ مترجم عبدالحی

انشائیہ[1] کی ہئیت اور ماہیت

لیو پوپ کے نام ایک مکتوب

عزیز دوست:۔

اس کتاب (روح اور ہیئت) میں شامل کرنے کے لے میں نے جن انشائیوں یا مضامین کو منتخب کیا ہے وہ میرے سامنے پڑے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا ان تخلیقات کی اشاعت کا کوئی جواز ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ مضامین ایک نئی وحدت یعنی کتاب کو جنم دے سکتے ہیں؟ اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ ان مقالوں سے "ادبی تاریخ" کے مطالعات کی حیثیت سے ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا ان تخلیقات میں کوئی چیز موجود ہے جو انہیں ایک نئی ادبی ہیئت بنا دے اور کیا یہ صفت ان تمام تخلیقات میں ایک قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہے۔ اگر ان میں کوئی وحدت موجود ہے تو وہ کیا ہے؟ میں اس وحدت کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیوں کہ زیر بحث موضوع 'میں' یا میری کتاب نہیں ہے۔ ہمارے سامنے تو اس سے کہیں زیادہ اہم اور عمومی سوال ہے؟ وہ سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی وحدت ممکن ہے؟ اس صنف سے تعلق رکھنے والی عظیم تخلیقات کو کس حد تک ادبی ہیئت دی جا سکتی ہے اور یہ ہیئت کس حد تک آزاد اور قائم بالذات ہے۔ اس قسم کی تخلیقات کا مقصود اور اس کو دی جانے والی ہیئت درمیانی حد فاصل کو بگاڑے بغیر اس کو سائنس کے دائرے سے نکال کر آرٹس کے دائرے میں داخل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ نیز اس میں کس حد تک زندگی کی تصوراتی تنظیم نو اور فلسفے کی برفانی

[1] یہاں 'انشائیہ' لفظ اور مضمون کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

اکملیت ممتاز رہنے کی مطلوبہ قوت یا شدت پیدا کر سکے ہیں۔ یہی بات اس قسم کی تخلیقات کا جواز نیز ان کی قدر و قیمت کی میزان ہے؟ آپ اس کو تنقید کہیں یا مقالہ۔ کیا یہ فنی تخلیق ہے؟ میں جانتا ہوں کہ آپ اس سوال کو مہمل سمجھتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اس سوال کی تائید اور مخالفت میں پیش کئے جانے والے تمام دلائل کبھی کے ختم ہو چکے ہیں۔ وائلڈ اور کیر نے محض ایک ایسی حقیقت کو عوام سے روشناس کرایا تھا جس کے رمز کو جرمنی کے رومانوی پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اس کے رموز سے یونانی اور رومی بھی واقف تھے۔ یعنی یہ کہ تنقید فن ہے سائنس نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے اور اسی لئے میں آپ کے روبرو ان مشاہدات کو رکھ رہا ہوں کہ ماضی میں اس موضوع پر جو بحث و مباحثہ ہو چکا ہے اس سے اصل سوال کا جواب فراہم نہیں ہوتا۔ یعنی یہ کہ انشاء فی الواقع ہے کیا؟ اس کے اظہار کا اسلوب اور وسائل کیا ہونے چاہئیں۔ جس بحث کا ابھی حوالہ دیا گیا اس میں مقالے کی صرف ایک خوبی پر ہی زور دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اس کو اچھا لکھا ہوا ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسلوب کے نقطۂ نظر سے انشائیہ کو کسی بھی تخیلی تخلیق کے دوش بدوش رکھا جا سکتا ہے اور اس سلسلے میں اقدار کے فرق کی بحث نہیں اٹھائی جا سکتی لیکن اس کا کیا مطلب ہے؟ اگر اس مفہوم میں ہم تنقید کو ایک فنی تخلیق مان بھی لیں تو اس سے اس سوال کا جواب فراہم نہیں ہوتا کہ اس کی اصل ماہیت کیا ہے؟ جس چیز کو بھی خوبی سے لکھا جائے وہ ایک فنی تخلیق ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک اچھے لکھے ہوئے اشتہار یا خبر کو فنی تخلیق کا درجہ دیا سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس قسم کی تنقید آپ کو مضطرب کر دیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ عقل کو ہیئت کا پابند کر دینے کو ایک سرکشی سمجھتے ہوں اور یہ سوچتے ہوں کہ اُسے آزادانہ پرواز کرنے سے روک دینا کسی طرح بھی ایک مستحسن عمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں جب تنقید کو فن کی ایک نوع کہتا ہوں تو اس سے میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے ایک ایسے نظم و انتظام کا پابند ہونا چاہئے کہ یہ فن کی تمام دوسری اصناف سے ممتاز اور الگ دکھائی دے۔ جب میں انشائیہ کو فن کی ایک صنف کہتا ہوں تو میرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی کوئی قطعی تعریف اور شکل متعین ہو جائے۔

اس صورتِ حال میں ہمیں تنقید اور دوسری تخلیقی اصناف کے درمیان پائی جانے والی مماثلتوں کی بحث میں نہیں پڑنا چاہئے بلکہ ان میں پائے جانے والے فرق پر زور دینا چاہئے۔ یہ مماثلتیں تو صرف ایک پس منظر ہیں جو اس فرق کو اور واضح بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی توجہ صرف حقیقی Essay پر مرکوز رکھ سکیں گے اور ان دوسری تحریروں کو اس بحث کے دائرے سے خارج کر دیں گے جو بادی النظر میں انشے دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن جن سے ہمیں کسی اطلاع یا خبر کے علاوہ اور کوئی روشنی اور آگہی حاصل نہیں ہوتی۔ ہم انشائیوں کو کیوں پڑھتے ہیں؟ بعض مضامین تو حصولِ آگہی کے لئے پڑھے جاتے ہیں لیکن زیادہ تر مضامین کے حسن یا کشش کا منبع کچھ اور ہوتا ہے اور جسے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ مثلاً کلاسیکی المیہ کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر اور ان کو پسند یا ناپسند کرنے کی ہماری وجوہات آج بالکل بدل چکی ہیں۔ لسنگ کی ''ڈرامائز جی'' یا ونکل مین کی ''گریکس'' ہماری سمجھ میں نہیں آتیں اور ہو سکتا ہے کہ جلد ہی بکارڈ کی کتاب ''نشاۃِ ثانیہ'' کے بارے میں بھی ہمارا تاثر یہی ہو جائے۔ اس کے باوجود ہم ان کتابوں کو پڑھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے برخلاف بعض تنقیدی کتابیں ایسی بھی ہیں کہ جب ان سے بہتر کتاب وجود میں آجاتی ہے تو وہ اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے لیکن لسنگ کی ڈرمیٹرجی ---- اگر کوئی اور ایسی کتاب وجود میں آبھی جائے جس میں کارنیل کو شکسپیر پر ترجیح دی گئی ہو تو بھی اس کی قدر و قیمت کم نہ ہوگی۔ اسی طرح برکارٹ، پیٹر، روڈ اور، نیتشے کی کتابوں کی اشاعت ونکل مین کی ''گریکس'' پر کوئی اثر نہ ڈال سکی۔

کیر لکھتا ہے: ''اگر تنقید سائنس ہوتی لیکن اس میں ناقابلِ فکر باتوں کی بہتات ہے اس لئے ایسا ہو نہیں سکتا چنانچہ بہترین تنقید آرٹ ہی تصور کی جائے گی۔'' سائنس ہمیں اپنے جوہر سے متاثر کرتی ہے جبکہ آرٹ کا اثر ہیئت کے ذریعے ہوتا ہے۔ سائنس ہمارے سامنے حقائق اور ان کے باہمی رشتوں کو پیش کرتی ہے لیکن آرٹ روح اور مقدرات کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو ایک دوسرے کا متبادل نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور نہ ایک کو دوسرے میں بدلا جا سکتا ہے۔

تہذیب کے ابتدائی ادوار میں سائنس اور آرٹ (اور مذہب اور اخلاقیات اور سیاست) باہم مربوط اور منسلک ہوتے ہیں اور باہم مل کر ایک وحدت کو ترکیب دیتے ہیں لیکن جیسے ہی سائنس ایک الگ وحدت بن جاتی ہے تو وہ تمام عناصر جو اس کے قائم بالذات ہونے میں کارفرما تھے اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں لیکن جو عناصر اپنے جوہر کو کھو کر ہیئتوں کے قالب میں ڈھل کر آرٹ بن جاتے ہیں وہ کبھی بے کار نہیں ہوتے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آرٹس کی بھی ایک سائنس ہوتی ہے لیکن انسانی مزاج اپنے اظہار کے لئے عام طور پر جو ہیئت منتخب کرتا ہے وہ آرٹس کے بارے میں لکھی گئی تخلیقات کہی جا سکتی ہے۔ میں نے عام طور کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ بہت سی تحریریں ایسی بھی ہیں جن میں زندگی کے وہی مسائل زیرِ بحث آتے ہیں جو تنقید یا ادب میں، لیکن ان کو تنقید یا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ ان میں جو سوالات اٹھائے جاتے ہیں وہ ادب یا تنقید کے وسیلے سے نہیں بلکہ براہِ راست زندگی سے جڑے ہوتے ہیں .... اس طرح گویا روح کی حقیقت کی دو انواع ہیں ایک ''زندگی'' اور دوسری ''جینا'' دونوں ایک ہی سی شدت اور قوت رکھتی ہیں لیکن بیک وقت ایک ہی درجے میں اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ ہر شخص کے زندگی کے تجربات میں ان دونوں کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ کبھی ایک کے اثرات زیادہ شدید ہوتے ہیں اور کبھی دوسرے کے۔ اسی طرح حافظے میں دونوں ہی عناصر کی یادیں محفوظ رہتی ہیں اور کبھی ایک عنصر اور کبھی دوسرا حافظے میں اُبھرتا رہتا ہے لیکن دونوں عناصر کی یادیں ذہن و شعور میں بیک وقت کبھی نہیں اُبھرتیں۔ جب سے زندگی کا وجود ہوا ہے اور انسان نے زندگی کو سمجھنے اور اسے ایک نظام دینے کی کوشش شروع کی ہے اس کے زندہ تجربے میں یہ ثنویت موجود ہے لیکن دونوں عناصر کی ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی جنگ فلسفے کے محاذ پر لڑی گئی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں دونوں عناصر کی فوقیت کا سوال زیادہ شد و مد اور وضاحت سے اٹھایا گیا تھا۔ اس وقت مفکرین دو گروہوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو عالمگیر نظریات یا دوسرے لفظوں میں افلاطون کے خیالات کو حقیقت اصلی مانتے تھے، دوسرے وہ لوگ تھے جو ان نظریات کو محض الفاظ جانتے تھے ایسے الفاظ جو

خود حقیقت نہیں تھے بلکہ حقیقتوں کی صفات کا ذریعۂ اظہار تھے۔

یہی ثنویت ذرائع اظہار میں بھی موجود ہے۔ یہاں اختلاف پیکر اور حقیقت کے درمیان ہے۔ یہاں ایک طرف تمثال گری یا پیکر گری ہے تو دوسری طرف اظہار حقیقت۔ ایک کے نزدیک صرف اشیاء کا وجود ہے اور دوسرا ان کے باہمی رشتوں کو وجود حقیقی مانتا ہے۔ شاعری صرف حقائق کو موجود مانتی ہے۔ شاعری ہر چیز کو سنجیدہ، منفرد اور بے نظیر تصور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری سوالات سے سروکار نہیں رکھتی۔ آپ کبھی حقائق کے بارے میں سوالات نہیں اُٹھاتے صرف ان کے باہمی رشتوں کے بارے میں سوالات اُٹھاتے ہیں۔ دوسری طرف سنجیدہ تنقید میں اشیاء کی حیات کا سراغ نہیں ہوتا اور نہ یہاں پیکر ہوتے ہیں، یہاں تو بس ایک شفاف کیفیت ہوتی ہے اور کچھ نہیں۔ ایک ایسی شفاف کیفیت جسے کوئی پیکر یا تمثال پوری طرح ظاہر نہیں کر سکتی۔ صوفیوں کا مقولہ ہے ''تمام پیکروں کی بے پیکری'' خود سقراط نے ان شاعروں کے فیڈرس کا مذاق اڑایا ہے جو روح کی زندگی کی کیفیات کو بیان کرنے میں عاجز رہے۔ کیونکہ وہ عظیم زندگی جو روح کے غیر فانی جوہر نے بتائی ہے بے رنگ، بے ہیئت اور غیر محسوس ہے اور صرف روح کا رہنما۔ یعنی دماغ اسے دیکھ سکتا ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرا شاعر ایک کھوکھلی تجرید ہے اور میرا تنقید نگار بھی ــــ آپ کا خیال صحیح ہے۔ دونوں تجریدی ضرور ہیں لیکن بالکلیہ بے جوہر نہیں ہیں۔ وہ اس لئے تجریدی نہیں ہیں کہ سقراط کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لئے تمثالوں اور پیکروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اور خود جرمن صوفیوں کی ''بے پیکری'' بھی ایک استعارہ ہی ہے۔ پھر یہ کہ چیزوں کو ایک نظام میں منسلک کیے بغیر شاعری وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ اسی لئے میتھیو آرنلڈ نے شاعری کو زندگی کی تنقید کہا ہے۔ شاعری انسان، اس کے مقدر اور دنیا کے باہمی رشتے سے بحث کرتی ہے۔ اور یہ ان گہرائیوں تک اتر جاتی ہے جس کی بعض اوقات خود شاعر تک کو خبر نہیں ہوتی۔ شاعری سوال نہیں اٹھاتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ سوالات اس کے بطن میں موجود نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شعوری طور پر سوالات اُٹھانے سے

گریز کیا جا رہا ہے بلکہ میں نے اس سے ایک قدم اور آگے جا کر یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ ''پیکر'' اور ''حقیقت یا جوہر'' کی علیحدگی بھی ایک تجرید ہے کیونکہ حقیقت ہمیشہ ''پیکر'' کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ہر پیکر کا تعلق ہماری دنیا سے ہوتا ہے اور اس دنیا میں ہونے کی خوشی کی روشنی سے پیکر کا چہرہ منور ہوتا ہے لیکن یہ ہمیں اس چیز کی یاد بھی دلاتا ہے جو کبھی موجود تھی۔ گویا انسان کے احساسات کی یہ دونوں انتہائیں محض تجرید ہیں اس لئے ان کے اظہار کی دونوں انتہاؤں کو بھی تجرید کے ذریعے ہی واضح کیا جا سکتا ہے اور وہ تحریریں جو پیکر کو نامنظور کر دیتی ہیں اور تمام تر شدت سے اس حقیقت کی کھوج کرتی ہیں جو پیکر کے پیچھے جلوہ گر ہے ناقدوں، افلاطونیوں اور صوفیوں کی تحریریں کہی جا سکتی ہیں۔

اور اسی لئے ان تحریروں کے لئے ایک خاص ہیئت اور اسلوب کی ضرورت ہے کیونکہ یہ اگر کسی دوسری صنف کی تحریروں کے قالب میں نظر آتی ہیں۔ مثلاً شاعری میں تو وہ ذہن کو منتشر اور منغض کر دیتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ یہ مانگ آپ نے ہی اُٹھائی تھی کہ ہر وہ چیز جس کی ایک ہیئت متعین کر دی گئی ہے اس کو اپنی ہیئت کا تابع ہونا چاہئے۔ اسی طرح کسی صنف میں انفرادیت اور یکسانیت کی دونوں صفات جمع ہو سکتی ہیں اور اسے انتشار اور نراج سے بچایا جا سکتا ہے۔ اور ایک ہی سے مواد میں ثروت اور رنگا رنگی پیدا کی جا سکتی ہے اور اظہار کی گونا گونی، رنگا رنگی اور ثروت سے آراستہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایک شے جو کسی ایک صنف میں ظاہر و آشکار ہوتی ہے دوسری صنف میں مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے۔ اس سے اصناف کے داخلی فرق و امتیاز کا ثبوت بھی فراہم ہوتا ہے۔ میری مراد گہرائی اور گیرائی سے نہیں۔ یہ تو ایسی صفات ہیں جو ہر صنف اور ہر ہیئت میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں میرا موضوع بحث وہ بنیادی اصول ہیں جو ہر صنف اور ہر ہیئت میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں میرا موضوع بحث وہ بنیادی اصول ہیں جو ایک صنف اور کو دوسری سے الگ کرتے ہیں۔ وہ مواد جس سے وہ صنف تشکیل پائی ہے اور وہ موقف یا نظریہ عالم جو تخلیق میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم مختلف اصناف کا کسی محدب شیشے سے منعکس ہوئی سورج کی دھنک رنگ شعاعوں سے مقابلہ کریں تو مضمون نگاروں کی تحریریں فوق بنفشی رنگ کی نظر آئیں گی۔

بعض تجربات ایسے ہیں جو کسی بھی رمز و کنایہ کے ذریعے ظاہر نہیں کیے جاسکتے لیکن پھر بھی وہ اظہار کے لئے بے چین رہتا ہیں۔ آپ غالباً سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کس قسم کے تجربات سے ہے۔ میری مراد ان عقلی، تصوراتی اور محسوس تجربات سے ہے جنہیں قریب ترین حقیقت، زندگی کا خود آفریدہ اصول، یا غیر ملبوس نظریہ عالم کہہ سکتے ہیں اور جو ایک روحانی وقوعہ اور زندگی کو حرکت دینے والی طاقت ہے چنانچہ یہ سوال ذہن میں فوری طور پر ابھرنے لگتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ تقدیر کیا ہے؟ لیکن یہ سوال سوال ہی رہ جاتے ہیں اور ہمیں ان کا جواب اس طرح نہیں ملتا جیسا کہ سائنس یا فلسفۂ اعلیٰ فراہم کرتا ہے۔ اگر ان سوالوں کا کوئی جواب ہمیں ملتا بھی ہے تو بھی وہ ناکافی ہوتا ہے جیسا کہ شاعری میں — کہ اس کی شکل یا تو کسی علامت کی ہوتی ہے یا تقدیر اور المیہ کی۔ جب کوئی انسان اس قسم کے تجربات کو محسوس کرتا ہے تو اس کی وہ تمام صفات جو ظاہر و ہویدا ہیں منجمد ہو کر غیر مرئی طاقتوں کے درمیان ہونے والے اس تصادم کے انجام کی منتظر رہتی ہیں جو اس کے حواس کی رسائی سے باہر ہے۔ اگر یہ شخص اپنے اس تجربے کو کسی کنایہ کے ذریعے بیان بھی کرے تو یہ بیان صحیح نہیں ہوگا۔ اس قسم کے تجربات سے دوچار ہونے والے شخص کو کسی معلمِ ہفت خواں سے متصف نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کسی ادبی تخلیق میں اسے کوئی ہیئت یا شکل دینا بھی ممکن نہیں ہوسکتا۔ تمام تحریریں دنیا کو تقدیری رشتے کی علامتوں کے انداز میں پیش کرتی ہیں اور تقدیر کا یہی مسئلہ مختلف اصناف کی ہیئت یا شکل دینا بھی ممکن نہیں ہوسکتا۔ تمام تحریریں دنیا کو تقدیری رشتے کی علامتوں کے انداز میں پیش کرتی ہیں اور تقدیر کا یہی مسئلہ مختلف اصناف کی ہیئت اور اسلوب کو متعین کرتا ہے۔ شاعری کے خدوخال اور ہیئت تقدیر سے متشکل ہوتی ہے کیونکہ شاعری میں ہیئت ہمیشہ تقدیر یا انجام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن مضمون نگاروں کی تخلیقات میں ہیئت خود تقدیر کا قالب اختیار کر لیتی ہے دوسرے لفظوں میں تقدیر آفریں قوت بن جاتی ہے۔ اس فرق کو ذرا وضاحت سے دیکھیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تقدیر اشیاء کو عالم اشیاء سے اُٹھا کر باہر نکال لیتی ہے اور ان میں سے ضروری کو باقی رکھ کر غیر ضروری کو خارج کر دیتی ہے۔ ہیئت ان محفوظ اشیاء کو قالب میں محدود

محصور کر کے ان کی بقا کی ضمانت دیتی ہے۔ کیونکہ اگر ہیئت موجود نہ ہو تو ان اشیاء کا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ تقدیر بھی وہیں سے آتی ہے جہاں سے اور اشیاء ظہور پذیر ہوتی ہیں یعنی یہ بھی اشیاء میں سے ایک ہے اور ہیئت غیر مادی اشیاء کی تحدید کر کے ان کو باقی رکھنے کی موجب ہوتی ہے۔ تقدیر مضمون نگاروں کی تخلیقات میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ ایک بار اپنی اتفاقیت اور انفرادیت سے محروم ہونے کے بعد یہ بھی غیر مادی اشیاء میں بدل جاتی ہے۔

ناقد مقدرات کو ہیئتوں کی شکل میں دیکھتا ہے۔ ہیئت اس کا سب سے عمیق تجربہ ہے اور ہیئت — بدیہی حقیقت — اس کی تحریروں کا پیکری عنصر اور واحد جاندار جوہر ہے۔ ہیئت جو زندگی کی علامتوں کے علامتی تصور سے پیدا ہوتی ہے، اس تجربے کی شدت اور قوت سے خود زندہ ہو جاتی ہے۔ یہ زندگی کے تئیں جس سے یہ شکل پذیر ہوتی ہے۔ ایک رویہ بن جاتی ہے اور زندگی کی باز آفرینی کے امکان کو جنم دیتی ہے۔ ناقد کا لمحۂ اعظم وہ وقت ہوتا ہے جب ہر شے اس کے لئے ہیئت بن جاتی ہے اور تمام احساسات اور تجربات اس لمحے کی ضرورت سے پگھل کر محض ایک ہیئت کا قالب اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ داخلی اور خارجی اور روح اور ہیئت کے اتصال کا لمحہ ہوتا ہے۔ یہ کچھ ایسا ہی لمحہ ہوتا ہے جیسا کہ المیہ کے ہیرو کا اپنی تقدیر کو پا لینے کا لمحہ یا افسانے میں حادثے اور تقدیر کے اتصال کا لمحہ یا شاعری میں روح اور کائنات کے اتصال سے ایک نئی وحدت کے جنم لینے کا لمحہ — ناقدین کی تحریروں میں ہیئت ایک حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔ یہ وہ آواز بن جاتی ہے جس میں ناقد زندگی سے مخاطب ہو کر اس سے سوالات کرتا ہے۔ ادب اور آرٹ کا تنقید کا موضوع بننے کا یہی سب سے بڑا سبب ہے۔ کیونکہ یہاں شاعری کا نقطۂ انتہا نقطۂ ابتدا میں بدل سکتا ہے۔ یہاں ہیئت تجریدی تصوریت میں ظاہر ہوتی ہے اور ایک بدیہی اور ٹھوس حقیقت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی انشائیہ یا مضمون کا منفرد موضوع ہے۔ مضمون نگار کے لئے وہی ہیئت قابلِ قبول ہے جو جیتی جاگتی ہو کیونکہ وہ اس کے روحانی جوہر کا متلاشی ہوتا ہے۔ چنانچہ ہیئت کا تصور صرف اس کی تجرید کے ذریعے ہی ممکن ہے جیسا کہ شعر میں ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ بحث بے سود ہے کہ شاعری اپنا موضوع زندگی سے حاصل کرتی ہے یا کہیں اور سے۔ کیونکہ ہر صورت

میں شاعری کی ہیئت آفریں قوت اس موضوع کو توڑ پھوڑ کر اسے ایک نئی ہیئت عطا کرتی ہے۔

جیسا کہ ہر ناگزیر تعلق واتصال میں ہوتا ہے یہاں قدرتی اسباب اور فوری افادیت دونوں بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ جس تجربے کو مضمون نگاروں کی تخلیقات بیان یا ظاہر کرتی ہیں وہ اکثر لوگوں کے ذہن میں اس وقت شعوری کیفیت اختیار کرتا ہے جب وہ ان تحریروں میں زیر بحث لائی گئی تصویر یا نظم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی لئے اکثر لوگ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ مضمون نگاروں کی تخلیقات تصاویر یا کتابوں کی تشریح کر کے انہیں قابل جنم بنانے کے لئے وجود میں لائی جاتی ہیں اور بیک وقت حادث اور لازمی ہونے کی یہی حالت ان تخلیقات میں لطیف طنز کا عنصر پیدا کر دیتی ہے جو اس صنف کی تمام اعلیٰ درجے کی تخلیقات کا طرۂ امتیاز اور حسن ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ تصاویر، کتابیں اور نظریات عام طور پر تنقید یا مضمون کا موضوع گفتگو ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس موضوع کے سلسلے میں ان کا رویہ کیسا ہوتا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ تنقید نگار کو ہمیشہ حق بات کہنی چاہئے۔ جبکہ شاعر پر اپنے موضوع کی بابت ایسا کرنے کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ یہ فرق کیوں ہے؟ فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھے بغیر مختصر طور پر اس کی وجہ بیان کی جاسکتی ہے کہ شاعری کا محرک زندگی یا فن ہوتا ہے جبکہ مضمون نگار کے پیش نظر زندگی اور فن کے ''نمونے'' ہوتے ہیں۔ مضمون اسی تضاد کا شکار رہتا ہے جو تصاویر میں موجود ہوتا ہے۔ کسی منظر کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ دریا یا چشمہ اصل میں بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ یہاں موجود ہیں لیکن انسانی تصویر کے سلسلے میں مماثلت کا سوال ہمارے ذہن میں آئے بغیر نہیں رہتا۔ آپ ولاکوے کی تصویر کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو آپ کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل جاتے ہیں ''کیا ہو بہو تصویر ہے'' جب کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ اگر تصویر کے ذریعے ہم اس شخص کے ظاہری شمائل کا اندازہ کر بھی لیں تب بھی اس کی داخلی زندگی کے بارے میں کوئی قیاس آرائی نہیں کر سکتے۔ مضمون کا کمال یہ ہے اور یہی صداقت کی تلاش اور پیش کش بھی ہے کہ مضمون یہ بتانے کی کوشش کر کے کہ تصویر کے ذریعے جس شخص کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے کیا وہ تصویر ایسا کرنے میں کامیاب رہی ہے یا نہیں۔

اب ہم شاعری اور مضمون کے فرق کی طرف پھر رجوع کرتے ہیں۔ شاعری اپنے ممدوح کی زندگی کی صرف ایک جھلک پیش کرتی ہے۔ ہمارے سامنے وہ شخص گوشت پوست میں موجود نہیں ہوتا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ مذکورہ نظم اس مقصد میں کہاں تک کامیاب ہے۔ اس کے برخلاف ایتنے کا ممدوح کبھی زندہ تھا۔ اس لئے اس کی زندگی کو کوئی شکل یا ہیئت دینا لازمی ہے لیکن یہ زندگی بھی تخلیق کے اندرون میں اسی طرح جاگزیں ہے جیسے کہ شاعری۔ اس لئے مضمون نگار کو اپنی بصیرت کی صداقت کے ثبوت کے لئے ایک داخلی ہیئت کی تخلیق کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ایک ہی موضوع پر لکھے ہوئے مضامین ایک دوسرے کی تنسیخ نہیں کرتے بلکہ ایک نئے دائرے اور نئے زاویے سے اسی موضوع پر روشنی ڈالنے کا موجب ہوتے ہیں۔ بات صحیح نہیں ہے کہ زندگی اور حقیقت کو ناپنے کا کوئی بیرونی معروضی معیار موجود ہے نیز یہ کہ گوئٹے کی زندگی کے بارے میں ڈل تھے، گریم اور شلیگل کے مضامین کی صداقت کو گوئٹے کی اصلی زندگی کی میزان پر جانچا جا سکتا ہے۔

شاعری اب سچ کے شائبہ مطمح نظر کو ترک کر چکی ہے لیکن ایسا کرنے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا ہے۔ کیا کسی شخص کو صداقت محض کی تلاش کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور کیا اس کو اس صداقت تک پہنچنے کے لئے سیدھا سادہ راستہ اختیار کرنے کا حق ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ ذرا قرون وسطی کے رزمیوں اور یونانی المیوں پر نگاہ ڈالیے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں فطری صداقت موجود نہیں ہے کیونکہ یہ صداقت روزمرہ کی زندگی کی معمولی پن سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ بلکہ یہ اس اسطور کی صداقت ہے جس کی طاقت کے بل بوتے پر پرانی داستانیں اور نظمیں ہزاروں سال سے زندہ ہیں۔ اساطیر کے خالق شاعر صرف اپنے موضوعات کی صداقت کی تلاش اور پیش کش کرتے تھے۔ وہ ان اساطیر کو مقدس الواح پر لکھی ہوئی پراسرار مخفی تحریریں جانتے اور ان کو پڑھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ دونوں دنیاؤں کی اپنی اپنی ضمنیات ہوتی ہیں۔ کیا آپ کو فریڈاک شلیگل کا وہ قول یاد نہیں جس میں اس نے کہا تھا کہ جرمن لوگوں کے معبود ہرمن اور ووتن نہیں بلکہ سائنس اور آرٹ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقولہ تمام جرمن لوگوں پر صادق نہیں آتا لیکن اس سے

یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ہر ملک میں ہر دور کے نظریات اور اقدار اپنے ماقبل کے دور کی اقدار و نظریات سے الگ ہوتی ہیں۔

شاعروں اور ناقدوں سے ہمارا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں زندگی کی علامات تک زندہ اساطیر کو ہیئت بخشیں۔ جب ہم کسی ایسے ناقد کی تحریر پڑھتے ہیں جس نے فلورنسی تصاویر یا یونانیوں کے بنائے مجسموں جیسی چیزوں کے ساحرانہ حُسن کو اس طرح بیان کیا ہو کہ ہمیں یہ خواہش ہونے لگے کہ کاش ہمارے دور میں بھی ایسی چیزیں وجود میں آتیں تو کیا ہم اپنے آپ سے یہ سوال نہیں کرتے کہ ایسے مضامین سے جو روشنی ہمیں ملتی ہے اس کو کہیں اور تلاش کرنا عبث ہے۔ یہی ناقد سائنسی تحقیق کی تازہ ترین فتوحات پر اور تحقیق کے لئے طریقوں اور نئے حقائق دریافتَ ن بات بھی کرتا ہے۔ اور ہمیں اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ہر دور اپنے یونان اپنے قرون وسطی اور اپنی نشاۃ ثانیہ کی احتیاج ہے۔ ہر دور اس عہد کو خود پیدا کرتا ہے جس کی اسے تلاش ہوتی ہے اور ہر آنے والی نسل یہ سمجھتی ہے کہ اس کے آباواجداد کے خواب محض فریب تھے اور نو دریافت شدہ صداقتوں کے ذریعے ان کی تکذیب کی جانی چاہئے۔ شاعری کے اثرات کی تاریخ بھی کچھ اسی نہج پر آگے بڑھتی رہی ہے۔ اور تنقید میں بھی اَب وجد کے خوابوں کا ایسا سلسلہ ملتا ہے جو نئی نسل کے خوابوں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ نشاۃ ثانیہ کے متضاد تصورات ایک دوسرے کے ساتھ امن وسکون کے ساتھ باقی رہ سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ایک نیا شاعر ایک نیا فیدر، سیگ فرائڈ، یا ٹرسٹن اپنے پرکھوں کے فیدر، سیگ فرائڈ اور ٹرسٹن کو نقصان نہیں پہنچاتے۔

تمام آرٹس کی ایک سائنس ہوتی ہے۔ ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔ عظیم مضمون نگار وہی ہیں جو اس سے سروکار رکھتے ہوئے بھی اچھے مضامین تخلیق کر سکتے ہیں۔ وہ جو کچھ تخلیق کرتے ہیں اسے سائنسی ہونا چاہئے خواہ ان کی نظریں سائنس کے دائرے سے کتنی بھی دور اور بلند کیوں نہ ہوں۔ مضمون کی صنف ابھی پوری طرح خود مختاری کا راستہ طے نہیں کر سکی ہے۔ جبکہ شاعری، سائنس، اخلاقیات اور آرٹ کے بندھنوں کو توڑ کر خود مختاری کی منزل پر پہنچ چکی ہے لیکن بہرحال مضمون بھی خود مختاری کے راستے پر گامزن ہو چکا ہے لیکن رفتار کافی

ست ہے۔ افلاطون جو میرے خیال میں سب سے بڑا مضمون نگار تھا۔ اپنا مواد راست زندگی سے حاصل کرتا تھا اور اس نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کا تعلق براہ راست جی گئی زندگی سے ہے۔ اس صنف کا یہ عظیم ترین ماہر بہترین خالق بھی تھا۔ افلاطون کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اسے سقراط کا ساتھ مل گیا اور اس نے سقراط کے ارسطو کو ایک ہیئت میں ڈھال دیا۔ غالباً سقراط کی زندگی اسی طرح مضمون کی صنف کے لئے بہترین موضوع کا درجہ رکھتی ہے جس طرح اڈیپس کی زندگی المیہ ڈرامے کے لئے تھی۔

یونانی اپنی تمام ہیئتوں کو حقیقی اور زندہ اشیاء سمجھتے تھے۔ وہ انہیں مجرو تصور نہیں کرتے تھے۔ یونانی فلسفی اُکسی بائڈیس نے اس حقیقت کو جسے نیتشے نے ہزاروں سال بعد بیان کیا اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ سقراط ایک ایسا آدم نو تھا جو ماقبل یونانیوں سے یکسر مختلف تھا۔ سقراط نے خود ایک مکالمے میں اپنے آدرش انسان کی جھلک پیش کی ہے۔ ایسا آدرش انسان جسے نہ تو وہ لوگ سمجھ سکتے ہیں جو جبلّتِ انسانی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور نہ وہ جو دل کی گہرائیوں سے شاعر ہیں۔ سقراط نے یہ بھی کہا تھا کہ المیہ اور طربیہ ایک ہی شخص کو تخلیق کرنا چاہئے کیونکہ المیہ اور طربیہ زندگی کے تئیں محض ایک نظریہ اور رویہ ہے۔ اس مکالمے میں سقراط نے ناقد کو ایک ایسا شخص قرار دیا ہے جو زندگی کے شعور سے مالا مال ہوتا ہے۔ اس طرح سقراط نے یونانیوں کے فلسفے سے متضاد و مختلف فلسفے کی بنیاد رکھی۔

افلاطون بھی دراصل ایک نقاد ہی تھا۔ اگرچہ وہ تنقید کو اظہار کا ایک ذریعہ اور بہانہ سمجھتا تھا۔ بعد کے دور میں تنقید خود اپنا موضوع گفتگو بن گئی۔ وہ کتابوں اور تصاویر کے گرد گردش کرنے لگی۔ کاش اسے کوئی سقراط مل گیا ہوتا کیونکہ ایسے ناقدین کو سب سے پہلے سقراط نے ہی ہدف ملامت بنایا تھا۔ ایک مکالمے میں بروطاغورس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔ ”کسی نظم کو موضوع گفتگو بنانا ایسا ہی ہے جیسے کسی عامی کی دی ہوئی دعوت میں شریک ہونے والوں کی گفتگو کو دُہرانا۔“

خوش قسمتی کی بات ہے کہ جدید مضمون کتابوں اور تصاویر کے دائرے سے نکل چکا ہے لیکن اس آزادی نے اسے اور بہت سے مسائل سے دوچار کر رہا ہے۔ اس صورت حال کی

وجہ سے یہ تاثر پیدا ہو گیا ہے کہ شاید انشائیہ زندگی سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ اس صورت حال کا تدارک اس طرح ممکن ہے کہ مضمون نگار خود اپنا شعور حاصل کرے، اپنے کو دریافت کرے اور اپنے اندرون سے کچھ تخلیق کرے۔ بعض مضمون نگار کتابوں یا تصویروں کے بارے میں گفتگو شروع کرتے ہیں لیکن اسے درمیان میں ادھورا چھوڑ کر دوسری باتوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں ان کا یہ عمل اس بات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ کتاب یا تصویر ان کے دماغ پر چھا جاتی ہے اور وہ اس کے اتفاقی یا حادثاتی عناصر کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ کتاب کی بات ایک ایسا تختہ بن جاتا ہے جس پر سے وہ کسی اور جانب جست لگا دیتے ہیں۔ شاعری زیادہ عظیم اور قدیم ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ادب پر بحث کرتے وقت یہ بات مضمون نگاروں کے ذہن میں رہتی ہے لیکن ہمارے زمانے میں یہ محض ایک شعوری رویہ بن گیا ہے۔ ناقد کو دنیا میں اس لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز کی علت پر غور کرے اور جو میزان قدر شناسی اسے چیزوں کی شناخت نے عطا کی ہے، اس پر تمام عوامل کو پرکھے اور ان کی قدر و قیمت کے بارے میں فتویٰ دے۔ انشائیہ دراصل ایک فیصلہ ہی ہے لیکن فیصلہ صادر کرنے کے اس عمل میں فیصلہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ فیصلے تک پہنچنے کا عمل۔

یہاں اس مکتوب کے ابتدائی جملوں کا اعادہ بے محل نہ ہوگا یعنی یہ کہ انشائیہ یا ایسے آرٹ کی ایک صنف یا ہیئت ہے اور حیات کو ہیئت عطا کرتا ہے۔

آپ کو شاید یاد ہوگا کہ شلیگل نے ہیسٹر ہوی کے مضامین کو 'دانش ورنظموں' سے بغیر کیا تھا اور میرے خیال میں انشائیہ کی یہ تعریف صداقت سے عاری نہیں ہے۔

□□□

مصنف کی دیگر کتابیں:

☆

ارمغانِ ادب

☆

رشید احمد صدیقی کے فکری مناسبات

☆

محمد بدیع الزماں اقبالیات کے آئینہ میں

☆

ادبی محاکے

☆

رشید احمد صدیقی: بحیثیت خاکہ نگار

☆

ڈاکٹر احمد امتیاز نئی نسل کے ایک سنجیدہ نقاد ہیں۔ تنقید اور شاعری ان کا خصوصی مشغلہ ہے۔ ادب کے منظرنامے پر انہوں نے دونوں میدان میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ زیر نظر کتاب 'انشائیہ کے فنی سروکار' انشائیہ کے فن پر لکھے گئے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اردو میں اس صنف نثر پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں جو مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں۔ ڈاکٹر احمد امتیاز نے بڑی محنت سے یہ مضامین جمع کیے ہیں۔ اردو میں اس نوعیت کی کوئی دوسری کتاب موجود نہیں تھی اس اعتبار سے یہ انتخاب حوالہ جاتی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ انشائیہ اسکول سے لیکر یونیورسٹی تک کے نصابات میں شامل ہے مگر اس صنف پر کتاب کی عدم موجودگی کے سبب اکثر طلبا اور اساتذہ پریشانی اٹھاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر احمد امتیاز کی مرتب کردہ اس کتاب سے ان کی پریشانیوں کا بہت حد تک ازالہ ہو جائے گا۔

ڈاکٹر احمد امتیاز ۱۹۷۱ء میں مدھوبنی، بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد محترم پروفیسر اظہار احمد کی نگرانی میں حاصل کی۔ پھر ۱۹۸۵ء میں واٹسن ہائی اسکول، مدھوبنی سے میٹرک، ۱۹۸۷ء میں آر۔ کے۔ کالج، مدھوبنی سے سائنس میں انٹر، ۱۹۹۰ء میں سی۔ ایم۔ کالج متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ سے بی۔ اے آنرز کیا۔ ۱۹۹۳ء میں شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے، ۱۹۹۶ء میں ایم۔ فل اور ۲۰۰۳ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بی۔ اے میں بہار کا خصوصی ریاستی وظیفہ ملا۔ ایم۔ اے میں یونیورسٹی ٹاپر ہونے کے سبب خواجہ احمد فاروقی گولڈ میڈل، مرزا غالب انعام اور دہلی اردو اکادمی کا اول انعام ملا۔ علمی و ادبی سفر کا آغاز ۱۹۸۹ء میں کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل و جرائد میں چالیس سے زائد تنقیدی و تحقیقی مضامین و مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر احمد امتیاز کی چھ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ گزشتہ بارہ برس سے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔

(ادارہ)

M. R. Publications
Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com